قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2017 قیمت 15₹

ماھنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب و غریب خبریں

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

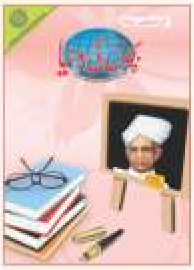

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

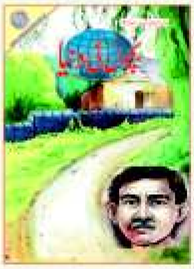

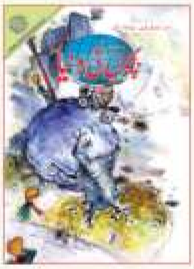

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:12، دسمبر 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
ف س اعجاز سے ایک خصوصی انٹرویو شکیل افروز 8

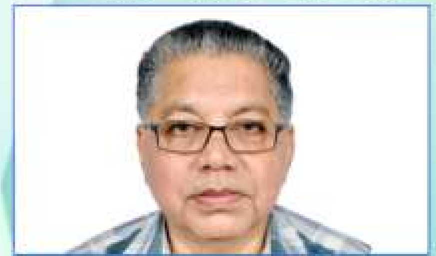

زبان و تعلیم
کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم کلثوم فاطمہ نصیر 13

گوشہ غالب
غالب کی ہشت پہلو شخصیت لطیف احمد 15
غالب سے منسوب یادگاریں سہیل انجم 18
دیوان غالب نسخۂ عرشی عبدالرازق 22

دسمبر کے درخشاں ستارے
خود کفیل شاعر: حمید الماس آفاق عالم صدیقی 25
اوپندر ناتھ اشک کا تخلیقی سفر شریف الدین 28

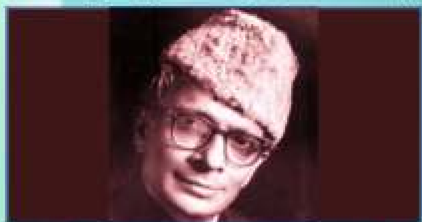

نذیر احمد کے ناول
'مراۃ العروس' میں عورت کا تصور محمد امجد 30
مخمور سعیدی کے شعری افکار محمد یوسف رضا 34

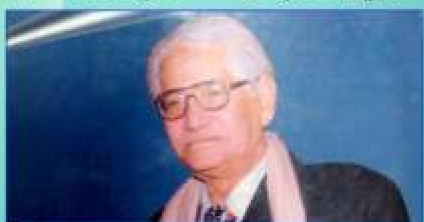

خراج عقیدت
خلیل الرحمٰن راز عطاء الرحمٰن قاسمی 37

چراغ دل
تصوف: بنیادی اہمیت عصری معنویت مظفر حسین سید 39
بھگوت گیتا کا ترجمہ 'دل کی گیتا' محمد عتیق الرحمٰن 42

نیا آسماں نئے ستارے
شوق نیموی کی غزل گوئی ثاقب فریدی 45
اردو کا چینی نژاد شاعر: شیدا چینی محمد عمران 50

سلسلۂ صحافت
ناندیڑ میں اردو صحافت ضیاء الحسن 52

اردو اور ٹیکنالوجی
تکنیکی سطح پر اردو زبان کو چیلنجز ریحان انصاری 55

فلم
رامانند ساگر انیس امروہوی 58

فلمی نغمہ نگاری سینما کی تاریخ کا روشن باب نشاط حسن 60

کمپیوٹر
ونڈوز کیا ہے؟ 65

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 69

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ ادارہ 80

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 82

ہماری بات

سائنسی ترقیات اور صارفی معاشرت کی وجہ سے حیات وکائنات کے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں انسانی زندگی بھی بہت سے نئے مسئلوں سے دوچار ہے اور کائنات میں بھی نئے نئے موضوعات شامل ہوتے جارہے ہیں۔ ادب بھی حیات وکائنات کا ایک آئینہ ہوتا ہے اس لیے حیات وکائنات کے مسائل اور موضوعات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ادب کا طرز بھی بدلتا ہے۔ ہمارے آج کے عہد کے مسائل وموضوعات پچھلے عہد سے ذرا مختلف ہیں۔ کیونکہ آج گلوبلائزیشن، کنزیومر کلچر نے بہت سے نئے مسئلے جنم دیے ہیں۔ ان مسائل پر غور وفکر ہمارے ادیبوں اور تخلیق کاروں کا بنیادی فرض بنتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ دنیا جس طرح پھیلتی جارہی ہے، ہمارے ادبی موضوعات سمٹتے اور سکڑتے جارہے ہیں۔ اردو ادب کے عمومی موضوعات پر غور کیا جائے تو ہمارے ادب کا ارتکاز چند اشخاص اور افکار پر ہی ہے۔ صرف وہی شخصیتیں اور افکار ہماری تحقیق اور تنقید کا محور ومرکز بنتی ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی تاریخ کے اوراق میں جو گم شدہ شخصیتیں یا افکار ہیں ان پر ہماری نظر کم جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے تذکروں میں بہت سے ایسے فنکار موجود ہیں جن میں بے پناہ تخلیقی قوت ہے، تخیل کی رعنائی ہے، فکر کی صلابت ہے۔ مگر وہ فنکار تذکروں سے نہ تو کبھی باہر آپاتے ہیں اور نہ ہی ان پر کوئی تنقیدی یا تحقیقی مکالمہ قائم کیا جاتا ہے۔ جبکہ ان شخصیات کو متعارف کرانے سے نہ صرف زبان وادب کے تنوع کا احساس ہوگا بلکہ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اردو زبان وادب کا سرمایہ کتنا وقیع ہے اور اس کی ثروت میں کیسی کیسی شخصیتوں نے اضافہ کیا ہے۔

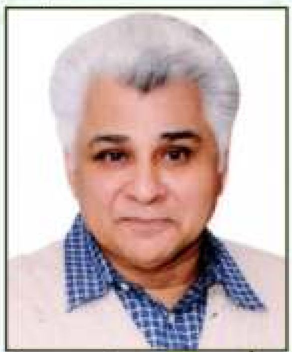

اردو ادب میں موضوعات کی یہ محدودیت اس کی وسعت کے لیے اچھا اشارہ نہیں ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا زرخیز اور قابل قدر سرمایہ لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آپاتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نئے عہد کی ترجیحات اور مطالبات کے مدنظر کچھ ایسے موضوعات پر کام کیا جائے جن کا انسانی اور تہذیبی ارتقا سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ جن سے ملکی اور قومی اصلاح میں بہتری ممکن ہے۔ خاص طور پر آج کے عہد نے ہمارے ادیبوں کو جو موضوعات دیے ہیں ان میں ماحولیات بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ادب کا ایک بڑا عنصر فطرت اور ماحولیات کے مطالعے پر مبنی ہے۔ مگر یہاں بھی المیہ یہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر ناقدین کم غور وفکر کرتے ہیں جبکہ کلاسیکی شاعری ہو یا جدید عہد کی شاعری یا فکشن ان میں فطرت کی جمالیات کے بہت سے اشارات موجود ہیں۔ ان نکات کی طرف فنکاروں کی توجہ مبذول ہوجائے تو ہمارے ادب کا رشتہ نئے عہد کے مسائل سے بھی جڑ جائے گا۔

موضوع کی محدودیت کے تعلق سے یہ باتیں اس لیے کی جارہی ہیں کہ کبھی کبھی ضرورت کے پیش نظر ان اشخاص اور افکار کی تلاش ہوتی ہے جن سے اردو دنیا کے قارئین کو متعارف کرایا جائے تو محرومی کا احساس ہوتا ہے کہ ایسے اشخاص پر کوئی بھی تحریر نہیں مل پاتی۔ صرف چند نام ہیں جنھیں ادب اور تنقید میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور انہی پر ساری ذہنی اور تخلیقی توانائی صرف کی جاتی ہے۔ گذشتہ دنوں اردو دنیا نومبر کے شمارے کی ترتیب کے وقت قومی اردو کونسل کے مرتب کردہ ادبی کلینڈر میں نومبر کے ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں پر مضامین کی جستجو کی گئی مگر یہاں بھی ناکامی ہی ہاتھ لگی کہ سوائے چند اشخاص کے جن پر کثرت سے تحریریں موجود ہیں دیگر شخصیات پر مضامین نہیں مل سکے۔ یہی حال دسمبر کے شمارے کی ترتیب کے وقت بھی ہوا کہ اس ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں پر مضامین کی جستجو کی گئی تو سوائے چند معروف اور ممتاز ناموں کے دیگر اور شخصیات پر تحریریں نہیں مل سکیں۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ ہمارے ادب کی سوئی صرف چند ناموں پر ہی ٹکی ہوئی ہے اور بار بار انہی ناموں کو دہرایا جاتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ شخصیتیں ہماری نظر میں نہیں آتیں جن پر بہت کم کام ہوا ہے یا بالکل ہی نہیں ہوا ہے۔ وہ شخصیتیں جو ادبی تاریخ کے صفحات میں گم ہوکر رہ گئی ہیں۔ ان کی بازیافت کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔ یہ ہمارے ادب کا بہت بڑا المیہ ہے۔ جس پر ارباب نظر کو غور کرنا چاہیے۔ ہمیں نئے عہد میں کچھ ایسے پرانے ناموں کو تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے اردو ادب اور کلچر میں گراں قدر اضافے کیے ہیں اور ان کی بیش بہا خدمات سے ہماری نئی نسل واقف نہیں ہے۔

یہ 2017 کا آخری شمارہ ہے۔ سال کے اختتام پر یقیناً بہت سے لوگ ماضی کا محاسبہ کریں گے۔ 2017 کے ادب کا جائزہ بھی لیا جائے گا اور مختلف اصناف میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے بھی گفتگو ہوگی اور یہ احساس دلایا جائے گا کہ 2017 کا ادبی افق بھی تابناک اور زریں رہا۔ یہ سب باتیں صحیح مگر یہ سوال پھر بھی قائم رہے گا کہ ہم نے اردو زبان کو کتنا فروغ دیا؟ ہم سب کو مل کر اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

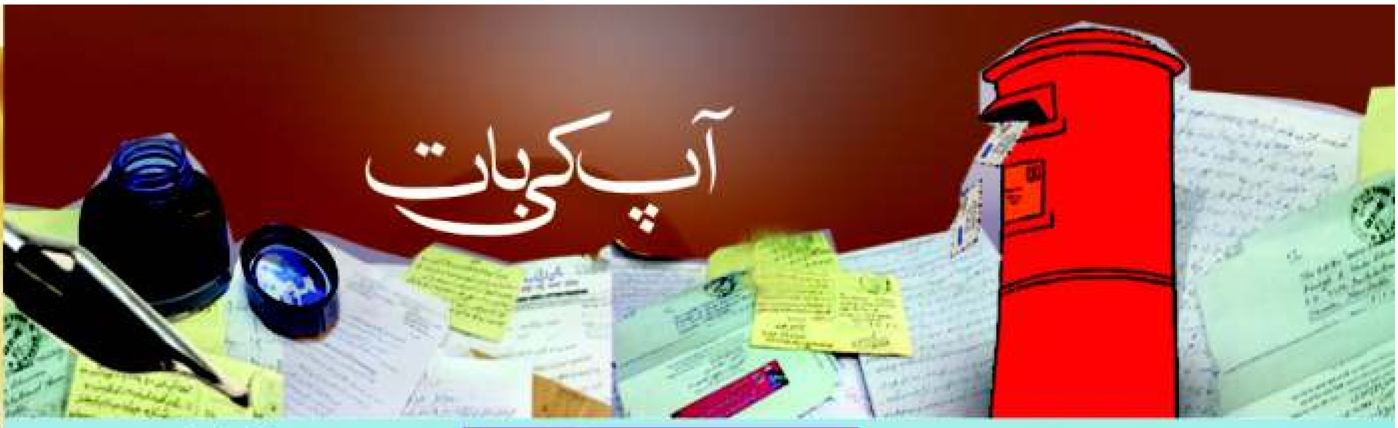

آپ کی بات

'اردو دنیا' نومبر 2017 کا شمارہ موصول ہوا۔ اداریہ 'ہماری بات' میں آپ نے 2017 سے سالانہ ایوارڈ اسکیم کے آغاز کی معلومات دی، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ قیوم اثر (جلگاؤں) نے اپنے مراسلے میں 'ادبی تراجم کی روایت' مضمون کے متعلق جس بات کی طرف توجہ مبذول کروائی ناچیز اس بات سے صدفی صد متفق ہے۔ دلچسپ معلوماتی اور جاذب نظر رسالہ محض 15 روپے میں ملنا ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے، جس کے لیے ہم آپ کے اور این سی پی یو ایل کے شکرگزار ہیں۔ مبصر وسیم مینائی صاحب نے (اردو دنیا نومبر 2017 کے شمارہ میں) کتاب 'کامیابی کا راز' کے تبصرے میں بڑے اچھے انداز میں اور حقیقت بیانی سے کام لے کر اس کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ دیگر تمام مشمولات بھی معیاری ہیں۔

اعجاز پروانہ ناندوروی: ناندورہ، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر

اداریہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ قلم کاروں کی ناقدری اور مشرق و مغرب کے تقابل کے ذریعے کریم صاحب نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ذریعے قلم کاروں کی عزت افزائی کے لیے ایوارڈ دینے کا فیصلہ بہت بہتر ہے۔ بندہ خود اس سلسلے میں کئی سال سے یہ رائے ذہن میں رکھتا تھا کہ اس اردو کے بڑے ادارہ کی طرف سے قلم کاروں کی تشجیع کے لیے ایوارڈ تفویض کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔

اب جب کہ اردو کونسل نے پیش قدمی کی ہے تو یہ اردو قلم کاروں کے لیے نہایت مستحسن قدم ثابت ہوگا۔ البتہ میری ایک رائے ہے کہ ادب اطفال کا ایک ایوارڈ اس میں ضرور شامل ہو تو بہتر ہے۔

حقانی القاسمی نے منی پور اردو پروگرام کے سلسلے میں بہت اچھا لکھا ہے۔ انیس الحسن صاحب نے امریکہ میں سورج گرہن کے بارے میں چشم دید منظر پیش کرنے کے ساتھ معلوماتی مضمون قلم بند کیا ہے

سارے ہی مقالات عمدہ ہیں لیکن کمپوزنگ اور رسالے کی ڈیزائننگ کرنے والے نے بہت اچھی حاشیائی ترقیم وتزئین سے رسالے کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

انصار احمد معروفی: مدرسہ چشمہ فیض، مئو

ماہنامہ 'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ قابل صد ستائش ہے۔ اس بار اداریے 'اپنی بات' کے تحت مدیر صاحب نے معاشرے میں ادبا سے بے رُخی کو بخوبی نشان زد کیا ہے۔ سنسکرت کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار بھو بھوتی کو بھی ہم عصر ادبا کی جانب سے چشم پوشی اور بے التفاتی کے سبب یہ اعلان کرنا پڑا کہ 'مستقبل میں کبھی کوئی میرا ہم پایہ پیدا ہوگا (کیونکہ) وقت بے معیاد ہے اور یہ زمین بڑی وسیع ہے!' نئی زمانہ شاعر عرفان صدیقی کا یہ شعر ملحوظ خاطر ہے۔ ''کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا، کبھی تو کام یہ شوق فضول بھی دے گا''

محترمہ عرشیہ سرفراز نے بھی اکبر الہ آبادی کے کلام میں ذو معنویت کی جاندار تشریح کی ہے۔ اکبر نے طنزیہ و مزاحیہ کے ساتھ سنجیدہ شاعری بھی کی۔ ایک جج کے عہدے پر فائز ہونے اور اپنے مختلف الصفات ہونے کا مستند ثبوت بھی دیا۔ ان کے دولت خانے کا نام 'عشرت منزل' تھا جو پنڈت جواہر لال نہرو کی رہائش گاہ کا نام 'آنند بھون' رکھنے کا بھی محرک تھا۔ علی سردار جعفری نے ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنی نظم 'نئی دنیا کو سلام' سنا کر انھیں بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یونس غازی صاحب کا جعفری کی شاعری پر مضمون ان کے عمیق و دقیق مطالعے کا غماز ہے۔

محترمہ نیہا اقبال نے بھی جناب اختر الایمان کے کلام میں ماضی کے رنگ کی عکاسی کی ہے۔ جون ایلیا کی شاعری پر مستجاب احمد صدیقی کا مضمون بھی نہایت احسن ہے۔

کرشن بھلوک: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

اردو دنیا اکتوبر کے شمارے کے اداریے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صاحب نے مضمون کی صورت مع بسیط معلومات کی ایک بیش بہا دنیا ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدیر محترم کا مطالعہ بہت وسیع اور جامع ہے۔ بقول موصوف کہ آج کی نسلیں اُن اشاعتی اداروں سے لاعلم ہیں جن کی زریں خدمات کتابوں، رسالوں، اخباروں، نوادرات و مخطوطات کی صورت میں محفوظ تو ہیں مگر طلبا اور قارئین کی دسترس سے بہت دور ہیں۔ بقول مدیر محترم اساتذہ بھی ایسی کتابوں کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔ اس کا عین سبب یہ ہے کہ دہرائے گئے مقالوں اور مضامین ہی کی جگالیاں کی جارہی ہیں اور اس کے چربے اور سرقے ہی سامنے آرہے ہیں اور وہ اس لیے کہ وہ معیاری مضامین لکھنے سے بھی قاصر اور معذور ہیں۔ کیوں نہ ہوں تجسس اور تحقیق کی کمی انھیں معیاری اور کلاسیکی ادب سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ کلاسیکی ادب کے علاوہ مدیر محترم کی رائے کے مطابق تاریخ، جغرافیہ، حیات، علم زراعت، ریاضیات اور دیگر سائنسی علوم کی کتابیں اور رسائل و جرائد جو نظر اندازی کی دھول اور لاعلمی کی گرد سے اَٹے ہوئے ہیں۔ انھیں جھاڑ پونچھ کر منظر عام پر لایا جائے اور ان کی دوبارہ اشاعت و ترویج سے ایک معتبر اور معقول نئی تاریخ مرتب کی جائے تاکہ اس علمی، ثقافتی، تاریخی اور ادبی سرمائے سے آج کی نسلیں اور طلبا مستفیض ہوسکیں۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے یہ صحیح کہا ہے کہ آج ادب پڑھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے اور موصوف نے یہ بھی سچ کہا ہے کہ ان کی پہلی محبوبہ شاعری تھی اور بعد میں تنقید کی وسیع اور کشادہ بانہوں میں پناہ لی۔ ہماری ادبی دنیا گواہی دیتی ہے کہ ہمارے سامنے جو نقاد حضرات منصہ شہود پر آئے ہیں ان میں مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، گیان چند جین، نورالحسن ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی کی پہلی عشقیہ ملاقاتیں شاعری ہی سے

ہوئی تھیں۔ مضمون کیرلہ میں اردو لغت نویسی یقیناً معلوماتی ہے۔ قمر رئیس مرحوم سے متعلق سید یحییٰ نشیط کا حوالہ جاتی مضمون بھی خوب ہے۔ صنف انشائیہ کی شناخت اور پہچان کی منزل تک ہماری رسائی اسد اللہ نے کرائی ہے اور انھوں نے اس سلسلے کو روشن کرنے میں بڑے معقول حوالے بھی دیے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو افسانے کی منور قدروں کو رفیعہ سلیم نے نمایاں کیا ہے۔ دور جدید کے افسانہ نگاروں میں مظہرالزماں خاں اور بیگ احساس کے نام امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی یاد میں یقیناً نور علی نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ الہ آباد اردو کی ادبی اور تہذیبی روایات کا سنگم رہا ہے۔ شبنم حمید نے اس کا بہترین جائزہ لیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اکتوبر کا شمارہ بڑی افادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔

❖ **علیم صبانویدی:** رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

ماہنامہ اردو دنیا، اکتوبر 2017 میں 'ہماری بات' میں مدیر اعلیٰ کی گفتگو دل کو چھوگئی کہ ہمیں نسل نو کی تربیت کے لیے پرانی تخلیقات کی بازیافت کرنی چاہیے اور ایسی کتابوں کی اشاعت کی ضرورت ہے جو زبان وبیان سے متعلق ہوں۔

فاروق اعظم قاسمی نے پروفیسر علیم اللہ حالی کی شخصیت وفن کا احاطہ کیا ہے انٹرویو پڑھ کر مسرت ہوئی۔ کسی قدر تشنگی کا احساس ہوا کاش مزید ادبی پہلو اس گفتگو میں زیر بحث آتے۔ 'روشن خیالی کی تفہیم وتعبیر اور قمر رئیس' سید یحییٰ نشیط کا یہ مضمون دو حصوں میں منقسم ہے۔ روشن خیالی کے معنی ومفہوم کو مختلف حوالہ جات سے سمجھایا گیا ہے۔ پھر دوسرے حصے میں ترقی پسند تحریک کے سربرآوردہ ادیب وشاعر قمر رئیس کے شہ پاروں میں ان کے نظریات پیش کیے گئے ہیں اور بین السطور میں انگریزی لفظ Enlightenment جو روشن خیالی سے بھی مستعمل ہے کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

محمد اسد اللہ کے مضمون 'انشائیہ شناخت اور حدود' میں، صنف انشائیہ سے متعلق کئی پہلو زیر بحث آئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مضمون انشائیہ کو سمجھنے میں مفید وکارآمد ثابت ہوگا۔ نہ صرف انشائیہ سے متعلق غلط فہمیوں کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ مصنف نے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ برصغیر میں انشائیہ نگاری کی تحریک کے تحت ابھرنے والے انشائیہ نگاروں کے نام اور ان کے انشائی مجموعوں کی فہرست شاید پہلی مرتبہ اس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ اس عرق ریزی سے مضمون تحریر کرنے کے لیے مصنف قابل مبارک باد ہے۔ 'حیدرآباد میں اردو افسانہ' رفیعہ سلیم کا مضمون معلومات سے پُر ہے۔ اس میں انھوں نے اس شہر میں افسانے کی روایت ماضی تا حال کا جائزہ لیا ہے اور ان افسانہ نگاروں کے فن پاروں پر اپنی آرا بڑے واضح انداز میں تحریر کی ہیں۔ 'برہان پور میں اردو کا تابناک ماضی' وسیم افتخار کی محققانہ بصیرت ظاہر کرتا ہے اس دور میں یہاں مختلف حکمرانوں نے حکومتیں کیں۔ ساتھ ہی زبان کی پرداخت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا۔ مضمون میں موصوف نے اہالیان برہان پور اور ان متقدمین کی اردو ادب کے تئیں گراں قدر خدمات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

ہندوستانی تہذیب وتمدن کو کسی غیر ملکی مصنف کی تحریروں میں پڑھنا حیرت سے خالی نہیں کہ کس طرح ہمارا ملک مختلف النوع رسم ورواج، مذاہب اور زبانوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ زر نگار صاحبہ نے ڈاکٹر نوال (جو ہندوستان کے سفر پر تھیں) کے تجربات ومشاہدات کو بہترین انداز میں قلم بند کیا ہے۔

❖ **اظہر ابرار:** ایس کے پوروال کالج، کامٹی، مہاراشٹر

ماہ اکتوبر 2017 کا شمارہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ مدیر محترم ڈاکٹر ارتضیٰ کریم صاحب نے اداریہ میں اشاعتی اداروں کی تاریخ مرتب کرنے کی بات کہی جو آج کے ادب کا اہم تقاضا ہے۔ اس سے ہمیں ان اداروں کی اشاعتی فہرست کا علم ہوگا جس سے مستقبل میں ضرورت پڑنے پر ہم استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''نئے دور میں ہمیں پرانی کتابوں کی شدید ضرورت ہے کیونکہ ان کتابوں میں ہمارا قیمتی سرمایا محفوظ ہے اور ان کتابوں کی روشنی میں ہم مستقبل کا سفر طے کر سکتے ہیں'' جو کہ مبنی بر حقیقت ہے۔

خطوط کے کالم میں عالی جناب ڈاکٹر کرشن بھاوک کے ہر ماہ شائع ہونے والے خطوط خصوصی طور پر مطالعہ کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر صاحب بہت ہی باریک بینی سے ہر شمارے کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتے ہیں۔

علیم اللہ حالی سے لیا گیا فاروق اعظم قاسمی کا انٹرویو بھی بڑے اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے مگر انٹرویو کے شروع میں موصوف کا تعارفی خاکہ بھی دیا جانا چاہیے تھا جس سے ان کی شخصیت سمجھنے میں قاری کو آسانی ہوتی۔ ابراہیم افسر کا مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں سرسید اور علی گڑھ کی معنویت' اور گلشن عبداللہ کا مضمون 'تعلیم نسواں میں سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک' محمد اکمل خان کا مضمون 'کلام غالب میں سائنسی اشارات' بے حد پسند آئے۔

صفحہ 48 پر ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کا مضمون 'برہان پور میں اردو کا تابناک ماضی' دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا بے حد خوشی محسوس ہوئی کیونکہ میرا مولد ومسکن بھی شہر برہان پور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تمہیدی گفتگو میں جو نماز کا تذکرہ کیا وہ مضمون کے عنوان کے اعتبار سے کچھ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ساتھ ہی صحیح معنوں میں برہان پور کی ادبی تاریخ کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہے۔ مضمون کا تفصیلی مطالعہ کرنے پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف ''برہان پور میں اردو کا تابناک ماضی'' نہیں بلکہ برہان پور کی تاریخی حیثیت اجاگر کرنا چاہ رہے تھے۔ برہان پور میں اردو شعروادب کی تاریخ واقعی بہت پرانی ہے لیکن باقاعدہ نثر نگاری کا آغاز مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اپنی کتاب 'برہان پور میں اردو نثر نگاری ماضی اور حال کے آئینے میں' میں رقم طراز ہیں 'مولوی خلیل الرحمٰن برہان پوری نے فتح المجتہدین، رسالہ صفات متشابہات، علامات القیامہ، صفات الاولیا، مقامات الاولیا، احادیث قدسیہ مع اردو ترجمہ، در مکنون، رسالہ افضل الشرف اور تاریخ برہان پور کتابیں تحریر کیں۔ ان کی بھی کتابیں مذہب اسلام سے منسلک ہیں۔ آخری کتاب 'تاریخ برہان پور' میں برہان پور کی سیاسی سماجی علمی وادبی تاریخ ملتی ہے۔ (اس کا سنہ اشاعت 1317ھ ہے) یہ برہان پور کے سب سے پہلے باقاعدہ نثر نگار ہیں۔ (بحوالہ برہان پور میں اردو نثر نگاری ماضی اور حال کے آئینے میں صفحہ نمبر 36) مولوی خلیل الرحمٰن صاحب برہان پور میں باقاعدہ اردو کے پہلے نثر نگار ہیں لیکن مضمون نگار نے کہیں بھی ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی ان کی کتابوں کا تذکرہ۔ مضمون کے عنوان کے اعتبار سے جس پر گفتگو ضروری تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک پہلو ہیں جنھیں مضمون میں شامل ہونا ضروری تھا۔

صفحہ 51 پر ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری کا ظفر گورکھپوری پر تعزیتی نوٹ ظفر صاحب کی شخصیت وشاعری کے تعلق سے ہے جو ظفر صاحب کی اردو زبان وادب اور شعر وسخن میں ان کی خدمات کا اعتراف وخراج پیش کرتا ہے

❖ **محمد تنویر رضا برکاتی:** سکریٹری دارالسرور ایجوکیشن سوسائٹی، برہان پور، مدھیہ پردیش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا اکتوبر 2017 کا شمارہ ہمیشہ کی طرح دیدہ زیب ہے۔ سرورق پر سرسید احمد خاں مرحوم کی تصویر بے حد جاذب نظر اور پروقار ہے۔ اداریہ بھی خوب اور سبق آموز ہے۔ اداریہ (ہماری بات) میں جن امور کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے، صد فیصد درست اور مبنی بر حقیقت ہیں۔ یقیناً یہ رسالہ آپ کی ادارت اور کاوشوں کے باعث اردو حلقے میں ایک خاص مقام اور انفرادیت حاصل کرچکا ہے۔

یوں تو اس کے تمام مشمولات اچھے ہیں، مگر پروفیسر شبنم حمید کا مضمون 'اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت اور الہ آباد' کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ خاص طور پر ہم الہ آباد والوں کے لیے یہ مضمون نہایت کارآمد ہے۔ انھوں نے جس ہنرمندی کے ساتھ اردو ادب کی تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اور سماجی روایات پر خامہ فرسائی کی ہے، وہ قابل صد تحسین ہے۔

❖ **طالب اکرام**: 1238، دائرہ شاہ رفیع الزماں، الہ آباد، یوپی

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر 2017 کا شمارہ موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح تمام مضامین معلومات سے بھرپور اور دستاویزی حیثیت کے حامل تھے۔ ہماری بات (اداریہ) میں آپ کا یہ قول ''انٹرنیٹ کی وجہ سے مواد تک پہنچنے میں آسانی تو ہوگئی ہے مگر اس مواد کا استعمال کس طرح کیا جائے اس سے ہمارے طلبہ ناواقف ہیں۔'' اس بات کی عکاسی ہے کہ آپ نے دور حاضر کے طلبہ کی صحیح نبض کو پکڑا ہے اور ایک اہم بنیادی خامی کی نشاندہی کی ہے۔

اس کے علاوہ (کیرلہ میں اردو لغت نویسی) بقلم ریاض احمد، تاریخی وعلمی معلومات سے بھرپور تھا۔ بقیہ تمام مضامین اپنی حیثیت آپ لیے ہوئے تھے اور آپ کی قومی اردو کونسل کی سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں اس بات کا اعلان ''کونسل سوشل سائنس کی کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دے گی'' کافی خوش آئند ہے۔

❖ **محمد عمر ندوی**: منتظم کتب صفہ دینیات، کشمی گاردن، غازی آباد

✍ ماہنامہ اکتوبر کا رسالہ نظرنواز ہوا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تمام مضامین بہت عمدہ اور معیاری تھے جو کہ مستقبل کے قلمکاروں کے لیے مشعل راہ ہوں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ آپ لوگ اردو ادب کی جدید تاریخ مرتب کر رہے ہیں اور ماضی کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے نئے مورخین، ادبا شعرا کی فوج تیار کر رہے ہیں۔ اکتوبر کے رسالے میں ہمارے شہر کے مشہور ومعروف ادیب جناب اسرار انصاری برہان پوری کا مضمون دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ موصوف ادب کے لحاظ سے کافی حساس ہیں۔ کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

❖ **م.م. انصاری**: غازی سالار میندان، برہان پور، مدھیہ پردیش

✍ ہماری بات کے تحت آپ نے لکھا:

''کسی بھی ملک کی تعمیر اور ترقی میں زبان وادب کا کردار بہت اہم رہا۔ ادب ہی کے ذریعہ سماج کو ایک صحیح سمت ملی اور ادب ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ سماج کو وحشی بننے سے روکا جاسکتا ہے۔ یقیناً ادب ہی سے انسان انسان ہے۔ آج ہماری ادب سے دوری ہمیں ترقی سے روک رہی ہے۔ مادری زبان میں ہم جس آسانی سے اکتساب علم کرسکتے ہیں دوسری زبان سے نہیں۔ سب سے پہلے مادری زبان سے دوری نے ہم کو ادب اخلاق، طور طریقے، رہن سہن بلکہ مذہب سے بھی دور کردیا۔ انسان کو وحشی بننے سے ادب ہی روک سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یا دو رائے نہیں ہوسکتی کہ ماہنامہ اردو دنیا ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھتا ہے۔

زیر نظر شمارہ ستمبر 2017 اس بات کا غماز ہے، اداریہ، خطوط، یعنی ہماری بات آپ کی بات، انٹرویو، زبان وتعلیم، یاد رفتگاں، نقد ونگاہ، لسانی رشتے، ہم نے جنھیں بھلا دیا۔ یادیں باتیں، نیا آسماں، نئے ستارے، دوسری زبانوں سے، صحت، سمت نما، کمپیوٹر اور کتابوں کی دنیا خبرنامے کے ذریعے آپ نے اس طرح پیشکش کی ہے کہ ہر قاری کو اپنی پسند کا مواد اس میں مل جاتا ہے، اصطلاحات فہمی پر عابد معز کا مضمون پر مغز اور معلوماتی ہے۔ گوکہ وہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور ان کی میڈیکل میں بے شمار کتابیں آئی ہیں لیکن وہ ایک اچھے ادیب اور مزاح نگار بھی ہیں۔ متین اچل پوری کا مضمون اردو شاعری میں سائنس کی جلوہ نمایاں پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اشعار کا انتخاب بھی خوب ہے۔

❖ **ڈاکٹر م.ق. سلیم**، (صدر شعبۂ اردو شاداں کالج)، 19-2-469 بیرون فتح دروازہ حیدرآباد 53 5000 (تلنگانہ)

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا شمارہ ملا۔ یہ جہاں اپنی خوبصورتی، خوش رنگ طباعت اور اچھے کاغذ سے دیدہ زیب ہے، وہیں دل چسپ اور مفید عنوانات کے لیے گراں قدر علمی، تحقیقی و ادبی نوعیت کے جواہر پارے، مختلف النوع ادبی وعلمی ذوق، اور طبیعت رکھنے والے قارئین کی پسند اور چاہت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یاد سرسید کا موسم ہے، جس میں اس عظیم مصلح کی یادوں کے کنول دلچسپ مضامین سے تازہ ہیں، اردو زبان کی جاذبیت پر مضامین حیدرآباد میں اردو افسانے، اردو تہذیبی روایات الہ آباد، برہانپور میں اردو وغیرہ خوب ہیں۔ 'شہاب نامہ میں ہندوستانی عناصر' بھی بہت خوب ہے اور نئی مطبوعات پر بھی تبصرے دلچسپ ہیں۔ 'ہماری بات' میں عہد حاضر میں نئے نئے موضوعات لیے اردو زبان وادب کے مسائل پر آپ کی فکر جائز ہے۔ اردو زبان کا صدیوں کا بٹورا گرانمایہ سرمایہ ادب اب ایک ایسے دوراہے پر ہے جب نوجوان طبقہ اس ناسازگار ماحول میں ادبی، تحقیقی، اور لسانی رہنمائی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے، اور اس شب سیاہ میں جب اردو پیران ادب بھی نہیں رہے روشنی درکار ہے۔

آج ملک میں گزرے وقتوں کی عظیم لائبریریاں محتاج توجہ ہیں، ان کی بدحالی کا کیا ذکر کیا جائے۔ کچھ اطمینان ہے تو یہ کہ اردو کونسل کی توجہ سے قدیم ونایاب نسخے ضائع ہونے سے بچے ہیں، اور ان کی طباعت نو سے اردو والوں کو ان خزینوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔

❖ **ڈاکٹر ضمیر الدین احمد**: وکاس کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا رسالہ پوری آب وتاب کے ساتھ ہاتھوں میں آیا۔ ہر ماہ کی طرح دیدہ زیب سرورق نے دل موہ لیا۔ اردو محبت واخوت کی زبان ہے جو اکثر تنگ نظری کا شکار ہوئی اور ہو رہی ہے مگر اس زبان نے کبھی اپنا دامن نہیں سمیٹا۔ ہر قوم اور ہر طبقے کو اس زبان نے مساوی نظروں سے دیکھا اور اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ کونسل کے ڈائرکٹر کی توجہ اور محنت ہی کا ثمرہ ہے جو قومی کونسل اس قدر تیز رفتاری سے فروغ اردو زبان میں سرگرم ہے اور اسی کی ہلکی سی جھلک ہمارے ہاتھوں میں ماہنامہ 'اردو دنیا' کی صورت میں موجود ہے۔

❖ **نوید اختر پروانہ**: برہانپور، ایم پی

✍ 'اردو دنیا' برابر ملتا رہتا ہے۔ رسالے میں ہر موضوع پر جو مضامین ہوتے ہیں وہ بہت معیاری ہوتے ہیں۔ مشہور شخصیتوں کے بارے میں معلوماتی مضامین ہوتے ہیں۔ فکشن، لسانیات، کہانی، انٹرنیٹ، کمپیوٹر وغیرہ کی معلومات بڑوں بچوں اور طلبہ کے لیے بہت کارگر ہوتی ہیں۔

❖ **حنیف ساحل**: ایشین پارک، محمود آباد، کھیرا، گجرات

✍ جناب من ایک طویل عرصے کے بعد ایک اردو ماہنامہ ملا۔ اردو دنیا کے بارے میں مجھے جانکاری نہیں تھی۔ میں اردو دنیا کا نیا قاری ہوں۔ آپ کا اداریہ فکر انگیز ہے اور مضامین لائق صد ستائش ہیں۔

❖ **عبدالقادر الویمبوری**: معدن موڈل اکادمی، ملاپرم، کیرلہ

شکیل افروز

ف۔س۔اعجاز سے ایک خصوصی انٹرویو

ف س اعجاز
اردو کے معروف ادیب، شاعراور صحافی ہیں۔
ماہنامہ 'انشا' ان کی ادارت میں برسوں سے شائع ہورہا ہے اور اس رسالے نے ادبی صحافت میں اپنی ایک مستحکم شناخت حاصل کی ہے اور بہت سے اہم موضوعات اور شخصیات پر اس رسالے کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطرخواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے معاصر ادبی مسائل، موضوعات اور صحافت میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کیا ہے اور اردو زبان کے موجودہ منظرنامے کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ ف س اعجاز کا صحافتی تجربہ بہت طویل ہے اس لیے انھوں نے ادبی صحافت کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر غور کیا جانا چاہیے۔ شاعری سے بھی ان کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اس ضمن میں بھی ان کے کارنامے قابلِ ذکر ہیں۔ وہ متحرک اور فعال ہیں اور صرف ادب کے قومی نہیں بلکہ عالمی منظرنامے پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے۔ عالمی ادبیات سے آگہی نے ان کے ذہنی کینوس کو وسعت عطا کی ہے۔ وہ عالمی ادبی رجحانات و رویے کے حوالے سے بھی اپنے رسالے 'انشا' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

شکیل افروز: صحافت میں آپ کیسے آئے اور آپ کو انشا نکالنے کا خیال کیوں کر آیا؟

ف س اعجاز: 1965 میں جب میں کلکتہ کے سینٹ زیویرس کالج میں پری یونیورسٹی کے امتحان سے فارغ ہوا تو انگریزی کے 'ریڈرس ڈائجسٹ' کے طرز پر اپنے بڑے بھائی عطاء الرحمٰن صاحب کے ساتھ ایک رسالہ 'فانوس ڈائجسٹ' نکالا۔ وہ بنگال کا پہلا فوٹو آفسیٹ اردو رسالہ تھا جس میں افسانے، شاعری، جاسوسی اور مہماتی ادب کو جگہ دی جاتی تھی۔ معلوماتی فیچرز اور مہماتی ادب پر خاص نگاہ رہتی تھی جس کے لیے انگریزی سے ترجمے بھی کروائے جاتے تھے۔ ترجمے کا شغل میں نے تبھی سے اپنایا۔ نامور مترجم مظہر الحق علوی کا قلمی تعاون بھی ہمیں ملا۔ ڈائجسٹ میں کبھی کبھی میں فرضی نام سے لکھا کرتا تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے کبھی ٹیوشن بھی پڑھائی۔ اُس زمانے میں 'شاہکار' نامی ایک ڈائجسٹ الہ آباد سے محمود احمد ہنر کی ادارت میں نکلتا تھا۔ لیکن وہ ان معنوں میں ڈائجسٹ تھا کہ شائع شدہ اردو افسانوں اور شاعری کا ایک بہتر انتخاب اس میں چھپتا تھا۔ ہمارے ڈائجسٹ کا خاکہ اس سے الگ تھا۔ ہمارے بعد کلکتہ سے نظام الحسینی نے 'روحِ ادب' ڈائجسٹ نکالا۔ پھر دہلی سے ہما، ہدیٰ نکلنے لگے۔ آگے چل کر محراب اور شبستاں نامی ڈائجسٹوں کا اضافہ ہوا۔ فانوس ڈائجسٹ جس نے اپنی ابتدا فوٹو آفسیٹ طباعت سے شروع کی جلد ہی مالی مشکلات کے باعث لیتھو اور پھر جزوی طور پر بلاک اور لیتھو سے چھپنے لگا۔ تیرہ شماروں کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ کلکتہ کی سنگلاخ زمین پر یہ ہونا ہی تھا!۔ اور اس کے کئی اسباب تھے۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس کام کا تصور ہمارے ذہن میں تھا نہ تو اس کے مطابق کلکتہ میں سیٹ اپ تیار ہوا اور نہ وسائل مل سکے۔ لگائی گئی رقم کی واپسی بھی ممکن نہ ہوسکی۔ میں دنیائے ادب میں بہت کم عمر میں آیا۔ تب سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔ رسالہ بند ہونے کے بعد ایک لمبا عرصہ توقف میں گزرا۔ شادی ہوئی۔ اپنا کاروبار جمالیا۔ اس بیچ میں دہلی آتے جاتے بعض صحافیوں سے مثلاً خوشتر گرامی، عبدالوحید صدیقی صاحبان، محمد عثمان فارقلیط (الجمعیۃ)، رحمٰن نیر، سلامت علی مہدی، مخمور سعیدی، گوپال متل، فاروق ارگلی، الیاس دہلوی، طارق صدیقی، خالد صدیقی وغیرہ سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ 1982 سے میں نے اپنی کتابیں شائع کرنا شروع کردیں۔ 1986 میں رسالے کا پرانا شوق عود کر آیا۔ خیال آیا اب ایک معیاری رسالہ نکالا جائے۔ تو میں نے انشا نکالا۔ اپنی بیٹی انشا کے نام پر۔

ش ا: کچھ بڑے قلمکاروں کے نام بتائیے جنھوں نے آپ کو قلمی تعاون دیا۔

ف س اعجاز: 'انشا' اور 'فانوس' دونوں میں شائع ہوئے قلمکاروں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ بہت کم ناشروں کو اس تعداد میں اپنے عہد کے نامور ادیبوں کو شائع کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہوگی۔ ترتیب کے بغیر جو نام یاد آرہے ہیں ان میں کرشن چندر، رام لعل، خواجہ احمد عباس، راجہ مہدی علی خان، فراق گورکھپوری، پنڈت آنند نرائن ملا، جوگندر پال، قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، ظ۔ انصاری، قتیل شفائی، سردار جعفری، مظہر الحق علوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مجروح سلطانپوری، تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر محمد حسن، عنوان چشتی، گلزار، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، عطاء الحق قاسمی، مظفر حنفی، مخمور سعیدی، سید عاشور کاظمی، دلیپ سنگھ، ندا فاضلی، اقبال متین، ہرچرن چاولہ، نعیمہ ضیاء الدین، رفیعہ منظور الامین، شمشیر سنگھ شیر، لدمیلا وسیلیوا، قیصر تمکین علوی، منیر ڈی احمد، مسعود منور، جمشید مسرور، خالد سہیل، سائیں سُچا، نصر ملک، سعید انجم، ش مظفر پوری، کملیشور، رتن سنگھ، سید مصطفیٰ کریم، مرزا حامد بیگ، نورالحسنین، یوسف سرمست، رشید امجد، صفیہ صدیقی، طاہر نقوی، عذرا اصغر، فردوس حیدر، زیتون بانو، آغا

سہیل، ذکیہ مشہدی، انور شیخ، مقصود الٰہی شیخ، تنویر احمد علوی، ظہیر احمد صدیقی، بلراج ورما، جسٹس محمد ہدایت اللہ، پروفیسر ایش کمار، اندر کمار گجرال، اندر جیت لال، م م راجندر، ستیش بترا، جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، جی ڈی، چندن۔ انتظار حسین، رضا نقوی واہی، نثار احمد فاروقی، شکیل الرحمٰن، راج نرائن راز، سید یحییٰ نشیط، مبارک شاہجہاں پوری، نسیم شاہجہاں پوری، رضوان احمد، لطف الرحمٰن، عبد الصمد، ملک زادہ منظور احمد۔ بنگال سے احمد سعید ملیح آبادی، سالک لکھنوی، رئیس الدین فریدی، ہیرالال چوپڑا، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، مبین رشید، علقمہ شبلی، جاوید نہال، انیس رفیع، فیروز عابد، منور رانا، شہود عالم آفاقی، جسٹس خواجہ محمد یوسف، صدیق عالم، ظہیر انور، شہیرہ مسرور، مقصود دانش، جاوید دانش، انجم عظیم آبادی، معصوم شرقی، ناظم سلطانپوری، کمال احمد۔ کتنے نام گنواؤں۔ نئے ناموں میں اپنا نام بھی جوڑ لیجیے۔ انشا کا خاص شمارہ 'ایک شمارۂ مکتوبات' آپ ضرور دیکھیں۔ اس سے آپ جان پائیں گے کہ کیسے کیسے باکمال ادیب، شاعر اور شخصیتیں انشا میں عملی دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ ہاں کچھ نام اور یاد آگئے جو میرے لیے بہت اہم ہیں۔ مانک ٹالہ، ہمت رائے شرما اور ان کے بڑے بھائی فلمساز و ہدایت کار کیدار شرما، آغا جانی کشمیری، عزیز قیسی، جیتندر بلّو، بخش لائل پوری، مامون ایمن، صفوت علی صفوت، رفعت سروش، ابوالفیض سحر، علی احمد فاطمی، مناظر عاشق ہرگانوی، سرور تونسوی، ہیرانند سوز، خلیل طوق آر، ستیہ پال آنند، سید تقی عابدی، عبدالقوی ضیاء علیگ، وفا راشدی، خالد یوسف، معراج جامی، طاہر نقوی، عطیہ خان، شام بارکپوری، کرشن ادیب، کیول دھیر، سری نواس لاہوتی، حکیم محمد سعید، بلبل کشمیری، آمنہ ابوالحسن، نارنگ ساقی، چندر بھان خیال، نجیب رامش۔ معاف کیجیے گا اتنے سارے نام میں نے گنوائے لیکن انشا میں ان کی شرکت کا حوالہ ضروری ہے۔

ش ا: انشا پر الزام لگتا رہا ہے کہ اُس نے بیرونی ممالک کے ادیبوں اور شاعروں کو زیادہ موقع دیا؟

ف س اعجاز: یقیناً مہاجر ادیبوں کا قلمی تعاون انشا کو ملتا رہا۔ اور اس کے لیے میں اُن ادیبوں کا شکر گزار ہوں۔ انشا نے اُن کی متوازن نمائندگی کی۔ ہجری ادب کی شمولیت اُس دور میں بہت ضروری تھی۔ برصغیر سے جو لوگ کئی سمندر پار جا بسے اُس وقت ان کے تخلیقی محسوسات، ان کے مسائل، مشاہدات اور تجربات سے واقفیت کے لیے انشا کے ذریعے ان سے قربت رکھنا ضروری تھا۔ اُس کے بغیر ادب کی آدھی تصویر ہی دکھائی جاسکتی تھی، پوری نہیں۔ وہ ادیب دو تہذیبوں کے موڑ پر کھڑے تھے۔ اور باہمی تخلیقی تفہیم کا کیا راستہ ہوسکتا تھا سوائے اس کے کہ انشا کو قارئین اور اندرونی و بیرونی قلمکاروں کے درمیان ایک پُل کی حیثیت دی جاتی؟۔ برسوں بعد جب یہ بات ملک کے لوگوں کو سمجھ میں آئی تو ان کا ذہن صاف ہوگیا۔ اور یہی نہیں میں نے بعض بیرونی ادبا کی کتابیں بھی شائع کیں۔ اور اُن کی وہاں کی چھپی ہوئی کتابوں کو انشا کے ذریعے نمایاں بھی کیا۔ بعض ممالک کا دورہ بھی کیا۔ 'یوروپ کا سفرنامہ' لکھا۔ پھر 625 صفحات کا خاص شمارہ 'اسکنڈے نیویائی ادب نمبر' بھی نکالا۔ وہ پورے براعظم اسکنڈے نیویا جو 6 ملکوں پر مشتمل ہے، میں بسے ایشیائی مہاجرین کے اصل اردو ادب نیز مقامی ادب کے اردو تراجم پر مشتمل تھا اور اس میں ادب کے علاوہ مصوری، فلم اور دیگر فنون کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے نمائندہ ترقی پسند شاعر بخش لائل پوری پر ایک خاص شمارہ نکالا۔ اسی طرح کارڈف انگلینڈ کے ایک ادیب، شاعر و نقاد پر ایک خصوصی شمارہ 'انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار نمبر' شائع

کوائف ف۔س۔اعجاز

اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق پیدائش 2 مئی 1948 کو دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم فتح پوری مسلم ہائی اسکول دہلی میں ہوئی۔ میٹریکلیشن پریسیڈنسی مسلم ہائی اسکول، کلکتہ سے 1964 میں کی۔ پری یونیورسٹی 1966 اور بی اے 1969 میں سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے کیا۔ وکالت (LLB) کا کورس کلکتہ یونیورسٹی سے 1972ء میں آخری سال میں چھوڑ دیا۔

کتابیں: (1) تنہائیاں (غزلیں، نظمیں) 1982 (2) مالک یوم الدین (نظمیں) 1986 (3) اسلامی تصوف اور صوفی (تصوف پر ایک مضمون اور مولانا جلال الدین رومی کی حکایات کا انتخاب) 1986 (4) موسم بدل رہا ہے (غزلیں) 1988 (5) لاشریک (نظمیں) 1989 (6) یوروپ کا سفرنامہ (ماسکو، ناروے، ڈنمارک، لندن، پیرس کا سفرنامہ) 1991 (7) خوابوں کے اسرار (خواب اور نیند سے متعلق ایک امریکی کتاب کا ترجمہ مع طبعزاد مقالہ 'ادب میں خواب کے اجزا'۔ 1997 (8) نیتاجی سبھاش چندر بوس (مجاہد آزادی نیتاجی کی سوانح حیات، اُن کے بھتیجے سسر کمار بوس کی، انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ (9) موسم بدل رہا ہے (غزلیں، ہندی میں 1999 (10) صاحب فن (نظمیں) 2001 (11) ازدواجی سکھ (شادی شدہ زندگی سے متعلق اقوال نظم و نثر 2001 (12) مَوقف (مضامین) 2002 (13) اونچے مکانوں کے قریب (غزلیں) 2005 (14) منتخب ذلت کہانیاں (ہندی سے ترجمہ) 2006 (15) سیریا میں دس روز (سفرنامۂ شام) 2006 - (16) منعکس (انگریزی سے ترجمہ نظمیں)۔ (17) ف۔س۔اعجاز کی اردو نظموں کا انگریزی میں ترجمہ از سمیر منگر جی: (A Fairy In The Goblet)۔ (18) نیاز فتح پوری (مونوگراف) 2011۔ (19) پلوٹو کی موت (افسانوں کا مجموعہ) 2012 - (20) چاند پر دیا (مجموعہ غزلیات) 2014۔ (21) ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ 2014 - (21) ارتکاز (مضامین کا مجموعہ) 2016 - (22) تھوڑا سا ٹیگور (رابندر ناتھ ٹیگور پر اردو میں ایک اصل کتاب 2016 - (23) چین یاترا (سفرنامہ چین) 2017 - (24) جھیل کے بستر پر (گیت' ہندی ایڈیشن) 2017۔

صحافتی کار گزاری: ہندوستان کا اوّلین اردو ڈائجسٹ ('فانوس ڈائجسٹ') کلکتہ سے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ 1965 میں نکالا۔ اس کے تیرہ شمارے شائع ہوئے۔ 1986 میں 'ماہنامہ انشاء' کلکتہ سے جاری کیا۔ اس نے 2008 تک مندرجہ ذیل 21 خاص نمبر شائع کیے جو مشہور عالم ہیں:

(1) احمد سعید ملیح آبادی نمبر (2) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نمبر (3) ادیبوں کی حیات معاشقہ (4) قمر رئیس نمبر (5) انشاء عالمی اردو افسانے (6) بابری مسجد نمبر (7) اسکنڈے نیویائی ادب نمبر (8) صدی شمارہ [انشاء کا سوواں شمارہ] (9) نیاز فتح پوری نمبر (10) دلیپ سنگھ نمبر (11) بخش لائلپوری نمبر (12) انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار (13) کلکتے کا عصری ادب نمبر (14) نثار احمد فاروقی نمبر (15) 15واں خاص نمبر (کلکتہ کے 9 ہمعصر افسانہ نگار) (16) گوپی چند نارنگ نمبر (17) گلزار نمبر (18) رومی نمبر۔ (18) گفتنی نمبر (انشاء کے 23 سال کے منتخب 164 اداریے)۔ (20) شکیل الرحمٰن نمبر (21) سلور جبلی۔ ٹیگور نمبر۔ (22) ایک شمارۂ مکتوبات۔ (23) مختصر تخلیقات نمبر (24) سلطان احمد نمبر

انعامات: ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ برائے ترجمہ 2011۔ کئی کتابوں پر مغربی بنگال، یوپی اور بہار کی اردو اکادمیوں سے ایوارڈ حاصل ہوئے۔ آل انڈیا میر اکاڈمی، لکھنؤ کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ انتر راشٹریہ میتھلی سمیلن، دہلی 2007 برائے اردو زبان۔ لوک سکھا لیکھک سمانا ایوارڈ 2009۔ اخبارِ مشرق کا ایوارڈ برائے شاعری (2010) اور برائے اشاعت (2012)۔ جام جہاں نما ایوارڈ (2012)۔

کیا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اُس وقت معاشی عالمگیریت کے ساتھ اردو ادب بھی گلوبلائزیشن کے اثر میں آچکا تھا۔ ایک عرصے تک اُس مہجری ادب نے اپنی بے پناہی کو محسوس کرایا۔ اب مہجری ادب میں وہ کشش نہیں رہی جو مہاجروں کی ابتدائی یا دوسری نسل کی بود و باش تک رہی۔ ان میں سے بیشتر ادیب دنیا میں نہیں رہے۔ کچھ ہیں بھی تو وہ ضعیف ہوکر بے عمل ہوگئے ہیں۔ ان کی جگہ نئی نسل کے افراد نے لے لی ہے جو وہاں کے سماج و ثقافت میں ضم ہو چکے یا ہوتے جارہے ہیں۔ اردو اب وہاں صرف گھروں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ وہ بھی شاید بچوں کے والدین کے مابین استعمال کی جاتی ہے۔ ورنہ اس زبان کا سروکار ادیبوں سے محض ذاتی نوعیت کا رہ گیا ہے۔

ش ا: **انشا** میں شائع شدہ سفرناموں کی خوب شہرت ہے۔ اس کی وجہ؟

ف س اعجاز: وجہ تو سفرناموں کی اپنی باطنی خوبیاں ہوں گی۔ سفرنامے زندہ ادب کا حصہ ہیں۔ جن سفرناموں میں علم کا سمندر موجزن ہوتا ہے، جن سے ایک مہم کا احساس پیدا ہوتا ہے، انھیں پڑھتے ہوئے قاری مصنف کا ہم سفر ہوجاتا ہے۔ ہمارے پرچے میں قمر رئیس، لالی چودھری، ہرچرن چاولہ، سلیم اختر، رام لعل، گوپی چند نارنگ، عطاءالحق قاسمی، شیخ سلیم احمد، امیر النسا، پروین شیر، خالد سہیل، افضل اقبال وغیرہ کے سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ میرے اپنے سفرنامے اور رپورتاژ بھی انشا میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں شام، موریشس اور چین کے سفرنامے نہ صرف ثقافتی بلکہ سفارتی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ لیکن کم اردو سفرنامے سارے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہی حال سوانح عمریوں کا ہے۔ میں نے بعض زندہ ادیبوں سے سوانح عمریاں لکھوا کر قسط وار چھاپی ہیں۔

ش ا: **انشا** سے آپ کو فائدہ ہوا یا نقصان؟

ف س اعجاز: نقصان بھی اور فائدہ بھی!۔ نقصان اور فائدے کی صورتیں الگ ہیں۔ البتہ تجربہ منفرد اور ونڈرفُل رہا۔ جو کام میں کرتا ہوں اس کے لیے ایک پوری ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تکنیکی اور مالی وسائل کی کمی کے سبب میں یہ سارے کام تنہا کرتا رہا ہوں۔ اس وجہ سے کئی سماجی، ادبی یا فیملی تقریبات میں شرکت نہیں کر پاتا۔ کاروباری امور کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ ہر ذمے داری توجہ اور وقت چاہتی ہے۔ وقت محدود ہے۔ کام کے لیے وقت میں وسعت خود پیدا کرنی پڑتی ہے۔ ادبی یا فنی کام ذاتی انہماک چاہتا ہے۔ تمام نگارشات کے لیے انتخاب و ادارت بڑی ذمے داری کا کام ہے۔ ضرورت پر مسوّدات میں کچھ رد و بدل بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے اکثر راتوں میں دیر تک جاگنا پڑتا ہے۔ جبکہ یہ کام سراسر غیر منافع بخش ہے۔ اگر میں یہ وقت اپنے پیشے اور روزگار میں صرف کرتا تو معاشی اعتبار سے بہت فائدہ پہنچتا۔ دوسری طرف ادارت کی مصروفیت میرا وہ وقت کھالیتی ہے جو مجھے اپنی تخلیقی محویت کے لیے درکار ہوتا ہے۔ اتنا وقت نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اپنی لکھی ہوئی چیزیں دیگر رسالوں میں بھیج سکوں۔ اس طرح ادب پر صحافت کے حاوی ہو جانے سے ادیب کا تخلیقی نقصان ہوتا ہے۔ میرے اس کرب کو ظ انصاری صاحب نے خوب سمجھا تھا۔ انھوں نے بعض خطوں میں مجھے مشورہ دیا تھا کہ اگر رسالہ بھی چلانا ہے اور ادب بھی لکھنا ہے تو کل وقتی یا جز وقتی مدیر رکھ لو ورنہ بحیثیت فنکار کے خسارے میں رہو گے۔ میری کم نصیبی کہ میرے لیے یہ کبھی ممکن نہ ہوسکا کیونکہ اگر یہ ممکن ہوتا تو انشا سے پہلے اور انشا کے بعد بھی کوئی مستحکم اور انمٹ نقوش چھوڑنے والا ادبی جریدہ یہاں سے ضرور نکلا ہوتا۔ مجھے یاد ہے ظ صاحب نے انشا کا نام اسپوتنک (Sputnik) اور میرا نام 'ابوالانشا' رکھ دیا تھا۔ فائدہ ایک یہ ہوا کہ انشا رسالے اور انشا پبلی کیشنز کے ذریعے پہلی بار کلکتہ ادبی اشاعت کے عالمی مراکز میں شامل ہوگیا۔ باہر کی بہت ساری ادبی دنیا انشا کے حوالے سے کلکتہ کو پہچانتی ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ اور یہ فائدہ جتنا میرا کہا جاسکتا ہے اُس سے بڑھ کر کلکتہ کا ہے۔ اب یہ جب تک ممکن ہو.........اور کیا کہا سکتا ہوں؟۔

ش ا: ادب پنپنے کے وسائل کلکتہ میں کیسے ہیں؟

ف س اعجاز: بات کڑوی ہے لیکن ہے سچ۔ یہاں صحیح چارہ ساز نہیں ملتے۔ ادب اور صحافت میں اٹکھیلیاں اور دل لگی زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے کوئی وسائل اکیڈمی یا حکومت کی طرف سے میسر نہیں ہوئے۔ اِدھر اُدھر دروازوں پر دستک دینا میرا شیوہ نہیں مجھے اپنی غیرت اور خودداری پیاری ہے۔ میں بائیس کتابوں کا مصنف ہوں۔ 30 سال میں انشا کے 23 خاص شمارے الگ دیے۔ یہ سب آسانی سے تو نہیں ہوگیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے لے کر آج تک اردو کی اتنی خدمت کسی شخص نے تو کیا کسی ادارے نے بھی یہاں نہیں کی ہے۔ حتیٰ کہ مشرقی ہند میں اردو صحافت کو کمپیوٹرائز کرنے والا پہلا ادارہ انشا ہے۔ اس کے بعد 'اخبار مشرق' اور پٹنہ کے 'قومی تنظیم' کا نمبر آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ کلکتہ میں کام کم ہوتا ہے ڈھنڈورا زیادہ پیٹا جاتا ہے۔ رسالہ یا اخبار نکالنے کے بعد اسے برقرار رکھنا آسان نہیں ہوتا اور کام کس نہج پر ہوتا ہے یہاں کے لوگ سمجھنا نہیں چاہتے۔ اردو کو مغربی بنگال کے بعض اضلاع میں دوسری زبان بنانے کے بعد بھی کیا اس زبان کے درجات بلند ہوگئے ہیں؟۔ بالکل نہیں لیکن اس کے لیے یہاں کے اردو والے ہی قصوروار ہیں۔ کلکتہ کے ادیب بالعموم علاقائیت کے شکار پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ اپنے ذہنی دریچے پورے نہیں کھولنا چاہتے۔ ادب متمول نہیں ہوگا تو بھلا وسائل بھی کس کام کے لیے درکار ہوں گے؟۔ ممتا بنرجی نے تو سرکاری طور پر بہت کچھ کر دکھایا لیکن باقی تو اردو والوں کو ہی کرنا ہے۔

ش ا: کوئی واضح اشارہ؟۔

ف س اعجاز: زیادہ وضاحت کسی الجھن میں ڈال سکتی ہے۔ کلکتہ میں 'بستی' تہذیب اور زبان زیادہ سرچڑھائی جانے لگی ہے۔ پرانے روزنامہ آبشار کے ایڈیٹر ابراہیم ہوش نے کالا چان (چاند) ڈوما نامی ایک کردار اپنے ایک کالم کے لیے گڑھا تھا جو اس زبان میں— زبان میں نے غلط کہا، بولی کہنا چاہیے تھا، بولی میں بات کرتا تھا۔ اسے شائستہ کلام تو نہیں کہیں گے یا کہیں گے؟۔ مسخ زبان ہمیشہ مسخ تہذیب کا جلوہ دکھاتی ہے۔ موجودہ کلکتہ میں اردو تہذیب اور زبان میں نہ صرف یہ کہ یکسوئی کم ہے بلکہ دونوں کے بیچ کا فاصلہ ایک طرح سے بحرانی بھی زیادہ ہے۔ کلکتے کا عصری ادب نمبر کے اداریہ میں یہ باتیں میں بہت پہلے لکھ چکا ہوں۔ عصر جدید، امروز جیسے اخباروں میں یہ فاصلہ کم دکھائی دیتا تھا۔ ورنہ صرف احمد سعید ملیح آبادی صاحب کا آزاد ہند ایک ایسا اخبار تھا جو شعوری طور پر زبان کی تہذیب کو سنبھالتا اور اس کی نگہداشت کرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ دہلی برادری جو اُس عہد میں یہاں ایک قابل قدر تہذیبی اور تجارتی شناخت رکھتی تھی اور کلکتہ میں مقیم لکھنؤ اور اس کے اطراف کے اہل اردو آزاد ہند کے گرویدہ اور عادی تھے۔ اب وہ برادریاں اور زبان و تہذیب کا مذاق کلکتہ میں بہت کم رہ گیا ہے۔ انشا میں اس مذاق کو بحال رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی رہی ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی ساری روایت نچڑ کر اب انشا میں سما گئی ہے۔ میری نظر میں صحافت میں اردو تہذیب کے تسلسل کا نہ پایا جانا یا معدوم ہوتے چلے جانا ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

ش ا: اتنی پریشانیوں کے باوجود انشا کو جاری رکھنے کی وجہ؟

ف س اعجاز: اس سے اردو زبان و ادب کے تئیں آپ میری محبت اور خدمت کے جذبے کا اندازہ لگا سکتے

ہیں۔ اور اس بات کا اعتراف کرنے والے کم نہیں ہیں۔ اُن کی خیر خواہی کی بدولت مزید کچھ نیا کرنے کی امنگ بڑھ جاتی ہے۔ دنیا بہت چھوٹی نہیں ہے۔ لیکن وہاں وقت سے پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے۔ آپ جس جگہ اس وقت بیٹھے ہیں یہاں ایک بار شمع کے مدیر یونس دہلوی صاحب تشریف فرما تھے۔ شمع کے آخری ایام میں وہ کلکتہ آتے تو کبھی یہاں آنے کی زحمت بھی گوارہ فرماتے تھے تو مجھے بہت خوشی ہوتی تھی۔ اور پھر ہم وطن بھی تھے۔ ایک بار وہ کہنے لگے آج میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ آپ خاص نمبر کس طرح نکالتے ہیں۔ بھئی ہم اپنے 'شبستاں ڈائجسٹ' کا نمبر نکالتے ہیں تو اس کے بعد کا شمارہ نہیں نکلتا۔ کیا جواب دیتا انھیں۔ وہ تو خود ایک ماہر تجربہ کار صحافی اور دہلی کے باکمالوں میں ہیں۔ میرا شیوہ ہے کہ خاص نمبر کے ساتھ اس کے بعد والا شمارہ ضرور تیار کر لیتا ہوں تاکہ وہ بروقت نکلے اور لوگ کسی طرح کی بدگمانی میں نہ پڑیں۔ اب یہ اتفاق تھا کہ اُس روز انشا کا تازہ شمارہ دفتر آیا تھا۔ ساتھ ہی اسکنڈے نیویائی ادب نمبر اعلان کے مطابق تیار ہوگیا تھا لیکن جاری ہونا باقی تھا۔ جبکہ انشا کا صدی شمارہ (سوواں شمارہ) پریس جانے کو تھا۔ اُس کے ایک صفحے کی فلم میں کوئی فاش غلطی دکھائی دی جسے میں اُس وقت ہاتھ سے درست کرنے جا رہا تھا۔ یونس صاحب یہ سب دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے آفسیٹ فلم میرے ہاتھ سے لی اور بلیڈ اور رونگ قلم سے خود اسے درست کرنے لگے۔ گویا یہ سب معمولی اور باریک کام وہ خود بھی اپنے دفتر میں بوقت ضرورت کر لیتے تھے۔ 2004 میں دہلی میں انشا کے 16 ویں خاص شمارے 'گوپی چند نارنگ نمبر' کے اجرا میں ساہتیہ اکاڈمی کے ہال میں یونس دہلوی صاحب میری دعوت پر تشریف لائے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ کئی ملکوں کے مندوبین کی موجودگی میں انھوں نے تقریر میں کہا میں نے ف۔س۔ اعجاز جیسا نمبری مدیر نہیں دیکھا۔ کہیں سے دلچسپ فقرہ اچھالا گیا ''یعنی دس نمبری؟''۔ محفل قہقہہ زار ہوگئی۔ میرے لیے یہ ایک سند تھی۔

ش ا: لیکن شمع جیسا مقتدر رسالہ کیوں بند ہوگیا جبکہ مالی اعتبار سے وہ بہت مستحکم تھا؟۔

ف س اعجاز: شمع کا بند ہونا معیاری اور تفریحی ادب کے لیے واقعی بڑا سانحہ ہے۔ دراصل شمع گھریلو تنازعے کا شکار ہوگیا۔ شمع کے پاس پوری ٹیم تھی۔ وہ ایک پورا پبلشنگ ہاؤز تھا۔ وہ بند ہوا تو ایک شمع ہی نہیں ان کے کئی رسالے بند ہوگئے۔ اردو ہندی دونوں۔ دہلوی برادران ادب وصحافت کی صحیح میزان رکھتے تھے۔ ان کا تجارتی پیمانہ ہر طرح کامیاب تھا۔ جب شمع کے اندرونی صفحۂ اشتہار کا نرخ دس ہزار روپے تھا انشا کے 'ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر' اور پھر 'عالمی اردو افسانے نمبر' کا اشتہار سات ہزار روپے کے ریٹ سے شائع ہوا شمع میں۔ شمع اور انشا کی اہمیت وانفرادیت پر انشا کے عید نمبر 2016 میں معروف افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی نے ایک اچھا اظہار خیال کیا ہے۔

ذوقی صاحب کا نظریہ مثبت ہے کہ آج اردو سماج میں شمع اور انشا جیسے رسالوں کی قلت ہے جو قارئین کی تجارتی بنیادوں کو بخوبی سمجھتے ہیں، وہ صرف ادب تک جا کر نہیں رُک جاتے۔ لیکن ملال اس کا ہے کہ اردو دنیا اتنی تنگ دل ہوگئی ہے۔ دس لاکھ اردو داں مل کر ایک اردو اخبار یا رسالے کو زندگی نہیں دے سکتے۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے؟۔ اس لیے ہمیں جذبے کو ہی سرمایہ بنا کر کام کرنا پڑتا ہے۔

ش ا: کیا شمع سے انشا متاثر ہوا؟۔

ف س اعجاز: نہیں عقلمندی اس میں تھی کہ ہم کسی کی تقلید یا پوری تقلید سے گریز کریں۔ ورنہ کسی کی انفرادیت نہ بچے گی۔ پیٹرن اپنا الگ ہونا چاہیے۔ البتہ اس کے برعکس دلچسپ بات یہ ہے کہ انشا سے کبھی کبھی شمع متاثر ہوا۔ مثلاً ایک وقت میں نے انشا میں 'دعوت اور سیرت' کے عنوان سے ایک مذہبی اور اخلاقی کالم شروع کیا تھا۔ اُس میں کبھی کبھی 'الرسالہ' کے مدیر، عالم بے بدل مولانا عبدالوحید خان صاحب کا بھی قلمی تعاون حاصل ہوا کرتا تھا۔ انشا کے اس کالم سے متاثر ہوکر شمع نے ایک نئے کالم کی شروعات کی جو مقبول ہوا۔ ان کے پاس بہتر وسائل تھے۔ اس لیے وہ بہتر طور پر کر پائے۔ شمع کے آخری شمارے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اُس فلمی وادبی رسالے میں دینی امور ومسائل پر ایک بہت اچھا اور مفید کالم نظر آئے گا۔ اُس کے برعکس انشا میں جو فلمی مضامین تب شائع ہوتے تھے وہ نوعیت میں شمع سے الگ ہوا کرتے تھے۔

ش ا: مقامی ادیبوں اور شاعروں کے لیے انشا نے کچھ خاص کیا ہو تو بتائیں اور ان کے تئیں انشا کا کیا رویہ رہا ہے؟

ف س اعجاز: مغربی بنگال کے ادبا وشعرا کی نمائندگی انشا کی ذمے داری ہے۔ انشا میں ان کی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ ہماری ترجیح ہے کہ معیار کی شرط پر کلکتہ کے قلمکاروں کو انشا میں برابر کا موقع دیا جائے۔ 2000 میں ایک خاص ضخیم شمارہ 'کلکتے کا عصری ادب نمبر' شائع کیا گیا تھا جو 72 ادیبوں، شاعروں، نقادوں کی وقیع تحریروں اور ان کے ادبی گوشوں پر مشتمل تھا۔ اُس وقت اُسے کلکتہ کے ادیبوں کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہی کہا گیا۔ وہ پیشکش بہت کامیاب رہی۔ اس سے متاثر ہوکر پٹنہ، حیدرآباد بلکہ برطانیہ اور امریکہ کے بھی ایک ایک رسالے نے اپنے اپنے شہر کے حوالے سے ہمعصر ادب نمبروں کے اعلانات کیے جو تین چار سال تک مختلف رسائل میں دیکھے جاتے رہے لیکن کسی نے ڈلیور کچھ نہ کیا۔ 'کلکتے کا عصری ادب نمبر' سے پہلے 1987 میں انشا کا اولین خصوصی شمارہ 'احمد سعید ملیح آبادی نمبر' بڑے پیانہ پر شائع ہوا تھا جو صحافی ملیح آبادی صاحب کی حیات وخدمات کا قابل رشک اعتراف تھا۔ اس کا اجرا گریٹ ایسٹرن ہوٹل کے بال روم میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجام دیا۔ ایم۔ جے اکبر بھی موجود تھے۔ اس نمبر میں میں نے ملیح آبادی صاحب کے بجائے اُن کے منتخب ومنفرد اداریوں سے انٹرویو لے کر ایک نئی قسم کی شے مرتب کی تھی۔ اس کا ترجمہ نیپالی زبان میں خوش لحن گورکھا اردو شاعر نثار نیپالی جو بنارہاٹ میں ایک انگریزی اسکول کے پرنسپل تھے، نے اپنے حلقے کے لیے کیا۔

احمد آباد سے شہود عالم آفاقی کلکتہ کے ایک چہیتے عوامی شاعر تھے۔ وہ ٹرام کنڈکٹر تھے۔ میرے اچھے دوست تھے۔ انشا کے ایک شمارہ کے ذریعے شہود کا بڑا اعتراف ہوا۔ ان کی ادبی زندگی کا ماحصل کلی روشنائی میں چھپا انشا کا وہ بھرپور گوشہ تھا جو بہت وقیع تھا۔ اُن پر میں نے

بڑے نقادوں سے لکھوایا تھا اور خود میں نے ان کی شاعری پر ایک مقالہ لکھا جو میری زندگی کی سب سے اچھی تحریروں میں سے ایک ہے۔ پھر انشا نے ایک خاص شمارہ ''کلکتہ کے 9 ہمعصر افسانہ نگار'' شائع کیا۔

ش ا: آپ نے مقامی ادیبوں پر مضامین لکھے ہیں کیا؟

ف س اعجاز: یہ جو انشا کے خاص شمارے نکالے تو ظاہر ہے میں نے لکھنے سے بڑھ کر اُن احباب کی خدمت کی اور ان کے کاموں اور ناموں کی خوشبو دور دراز تک پھیلائی۔ اور اپنا ڈھنڈورا پیٹے بغیر سب کام خلوص اور خاموشی سے کیے۔ پھر بھی آپ جاننا چاہتے ہیں تو سنیں۔ کلکتہ کے جن اہم ادبا پر میں نے مضامین لکھے ان میں احمد سعید ملیح آبادی، اعزاز افضل، رئیس الدین فریدی، سالک لکھنوی، شہود عالم آفاقی، منور رانا، قیصر شمیم، ناظم سلطانپوری، انیس رفیع، اشہر ہاشمی، صدیق عالم، ساوتری گوسوامی (اب آسٹریلیا میں ہیں)، فیروز عابد، شہیرہ مسرور، جاوید دانش، ساجدہ عندلیب رحمٰن، انیس النبی، مشتاق انجم، سعید پریمی، ایم۔علی، ظہیر انور وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے ان لوگوں پر لکھا ہی نہیں انشا کے پروگراموں میں حتی المقدور ان کی تعظیم وتکریم بھی کی۔ 'کلکتہ کے 9 ہمعصر افسانہ نگار نمبر' میں نو میں سے آٹھ افسانہ نگاروں پر مجھے خود لکھنا پڑا۔ نواں افسانہ نگار میں خود تھا۔ اب براہ کرم یہ نہ پوچھیے گا کہ ان میں سے کتنوں نے میرے بارے میں لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

ش ا: انشا کے کالم 'آپ کی ڈاک' میں آپ تنقیدی و ستائشی دونوں قسم کے مکتوبات شائع کرتے ہیں۔ اس کی وجہ؟

ف س اعجاز: پڑھنے لکھنے والے اپنی من چاہی کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ میں مکتوب نگاروں کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ان کا ردِ عمل جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بعض احباب ایسے بھی تھے جو نظم ونثر کے مقابلے میں خطوط بہت جاندار لکھ سکتے تھے۔ وہ اپنی شاعری یا مضمون بھیجتے تو مجھے اکثر مایوسی ہوتی۔ تب میری مسلسل پُر خلوص فہمائش پر انھوں نے ادب نگاری چھوڑ کر یہ جمہوری شغل اپنا لیا۔ اور اس کے بعد ان کے خطوط کئی جرائد میں نظر آنے لگے۔ لیکن حالیہ برسوں میں لوگ خط لکھنے کی عادت ترک کرتے جا رہے ہیں۔ یہ رجحان تخلیق کاروں کے لیے فکری نقصان کا باعث ہے، اسی طرح مبصر بھی اب کم تیار ہو رہے ہیں۔ کلکتہ میں تو جتنے مبصر مشہور ومعزز ہوئے سب انشا ہی سے تیار ہوئے۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج بھی میں قارئین کو شمارے کے اہم مشمولات پر رائے دینے پر راغب کرتا رہتا ہوں۔ ادب انگیزی کے لیے ان کی ذہنی شرکت کو میں بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

ش ا: نئے اور پرانے قلم کاروں کو آپ کس معیار سے دیکھتے ہیں؟

ف س اعجاز: معیار سے یا نگاہ سے؟۔ دیکھیے پرانا نئے کو راہ دیتا ہے۔ جیسے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم نے پرانوں سے کچھ سیکھا سمجھا اسی طرح نئے ہم سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔ پرانے اور باقاعدگی سے لکھنے والے ادیب نئی نسل کے لکھاریوں کے لیے مثالی ہوتے ہیں۔ نئے لوگوں کی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ بڑے بڑے ادبا نے انشا کے لیے لکھا لیکن بعض دوسرے معیاری رسائل کی طرح انشا نے بھی نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی ہے۔ اگر انھیں ہم موقع نہ دیتے تو وہ آج چاہے جہاں بھی چھپ رہے ہوں، نئے منظر نامے پر کیسے آتے؟۔ البتہ ابھی جو ادب لکھا جا رہا ہے اس کے پیچھے توانائی اور شوق کی رمق کم نظر آتی ہے۔ زبان پر عبور کم ہوتا جا رہا ہے۔ مشاہدات کے بغیر ادب سونا نہیں بنتا۔ ایک دو آنچ کی کمی سے کچھ زیادہ نہیں بگڑتا۔ موجودہ حالات میں دس میں سے چھ سات نمبر پانے کی اہلیت بھی کسی قلمکار میں نظر آتی ہے تو ہم اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ میں نئے لکھکوں پر اپنی ضرورت ظاہر کرتا ہوں۔ پھر کوئی خاص شمارہ آنے والا ہو تو اس میں لکھنے کی دعوت انھیں دی جاتی ہے۔ خاص نمبر کے لیے لکھی گئی کسی تحریر میں کسر نظر آئے تو مصنف کو دوبارہ لکھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ پرانا ہو یا نیا کسی ادیب کی انا کو ٹھیس پہنچانا مجھے پسند نہیں۔ کیونکہ ادیب نازک دل واقع ہوتے ہیں لیکن خاص نمبروں میں میں کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ اور اس کا اعلان خاص نمبر کے اشتہار میں پہلے ہی کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہماری ادارتی پالیسی ہے۔ خاص نمبر میں میری اپنی تسکین اور ادیب کی پروموشن کا پہلو پیش نظر ہوتا ہے۔

ش ا: انشا کی تحریروں میں ایک الگ تازگی، الگ مزاج پایا جاتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو پاتا ہے؟

ف س اعجاز: جو تحریریں، منثور یا منظوم ہم تک پہنچتی ہیں شائع ہو کر ان کی روپ ریکھا میں اکثر نمایاں تبدیلی آجاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ ادارت اور پیشکش کا آرٹ ہے۔ میں وقفے وقفے سے اندر اندر انشا کا مزاج بدلتا رہتا ہوں۔ کبھی یہ تبدیلی اتنی آہستگی سے اور بے خبری میں ہوتی ہے کہ جلد محسوس نہیں کی جاتی۔ بعض شماروں کا پیٹرن وہی رہتا ہے صرف تقسیم بدل جاتا ہے۔ انشا کے قارئین کو تنوع پسند بنانے میں میری برسوں کی ریاضت کا ہاتھ ہے۔ کیا کروں کچھ نیا نہ کروں تو خود بور نہ ہو جاؤں؟۔ ابھی جو 23 واں خصوصی شمارہ 'مختصر تخلیقات نمبر' شائع ہوا، بالکل نیا تجربہ ہے۔ نئے اور کئی پرانے ادیبوں کی بھی اس میں آزمائش ہوئی۔ اس تجربے نے خود میرے لکھنے کے انداز کو متاثر کیا ہے۔ اختصار کی خوبی اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہ تجربہ بہت موثر رہا۔ ہمارے دوست وجے جھن جھن والا اس خاص شمارے کو دیوناگری رسم الخط میں قابل اشاعت بنا رہے ہیں۔ شکیل افروز صاحب آپ کا بھی تو ایک افسانہ اس میں شامل ہے۔ دیکھیے میں نے کہا تھا کام کرتا ہوں۔ ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ بنگلہ میں کہتے ہیں نا چاند اٹھے گا تو دنیا دیکھے گی!۔

ش ا: انشا نے عید نمبر کی بھی روایت بنائی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ملک میں انشا ہی ایک رسالہ ہے جو عید پر ایک شمارہ پیش کرتا ہے۔

ف س اعجاز: جی ابھی 2016 میں انشا کا 31 واں عید نمبر شائع ہوا ہے۔ اب تک کے ان شماروں میں عید ورمضان سے منسلک اتنا مواد کسی کو ضرور مل جائے گا کہ 30 معیاری کہانیوں، 100-150 منظومات، 50 مضامین، دس پندرہ فیچرز پر مشتمل ایک قابل قدر کتاب تیار کی جا سکے۔ اور اسے تہذیبی ادب کا ایک بے مثال نمونہ کہا جا سکے۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنے تحقیقی مضمون ''انشا کے عید نمبر'' میں اس زاویے سے ایک مضمون ابھی قلمبند کیا ہے جو حالیہ عید کے شمارے میں شامل ہے۔

ش ا: شکریہ اعجاز صاحب! آپ نے خاصا وقت دیا اور اس انٹرویو کے ذریعہ قارئین کو اپنے تجربات اور مشاہدات میں شریک ہونے کا موقع فراہم کیا۔

■

Shakeel Afroz
12/4/H/3, Patwar Bagan Lane
Kolkata - 700009 (WB)
Mob: 9830041547
email : afroseshakil@gmail.com

کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم

کلثوم فاطمہ نصیر

ہندوستان ہمیشہ سے ایک کثیر لسانی ملک (Multilin-gual Country) رہا ہے۔ لسانی پیمانے پر ہم عموماً دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یک لسانی ملک (Monolingual)، جیسے برطانیہ، اٹلی، فرانس، جرمنی یا دیگر یوروپی ممالک، ایشیائی ممالک میں چین اور جاپان جیسے ملک بھی یک لسانی ملک کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان ممالک میں جو سرکاری زبان ہے وہی دفتری زبان بھی ہے اور زیادہ تر باشندوں کی زبان بھی وہی ہے۔ ملک بھر میں رابطے کی زبان (Lingua Franca) بھی وہی زبان ہے۔ ان ممالک میں زبان کی تعلیم اور درس و تدریس کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔

دوسرے زمرے میں ذولسانی ممالک Bilingual (Countries) آتے ہیں۔ امریکا، ملیشیا، سری لنکا اور تھائی لینڈ جیسے ممالک کو ہم اس زمرے میں رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملیشیا میں عوامی سطح پر لوگ ملائی زبان بولتے ہیں لیکن دفتری زبان انگریزی ہے۔ یہی صورت حال تھائی لینڈ کی ہے جہاں عوامی بول چال میں تھائی زبان کا استعمال ہوتا ہے لیکن دفتری اور حکومتی کاروبار کی زبان انگریزی ہے۔ امریکا میں بھی رابطے کی زبان اور حکومت اور کاروبار کی زبان انگریزی ہے لیکن مختلف علاقوں میں آباد لوگوں کی اپنی اپنی مادری زبان ہے۔

تیسرے زمرے میں وہ ممالک آتے ہیں جنھیں کثیر لسانی ملک (Multilingual) کہا جاتا ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان اس کی بہترین مثال ہے۔ عظیم ماہر لسانیات گریرسن نے ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا تھا۔ ہمارے ملک میں زبانوں کا تنوع قابل دید ہے۔ لیکن اس تنوع نے زبان کی تعلیم کو ایک پیچیدہ مسئلہ بھی بنا دیا ہے۔ ہمارے ملک میں سہ لسانی فارمولہ بہت مشہور ہے۔ زبان کی تعلیم کے حوالے سے بار بار ہم سہ لسانی فارمولے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ ہمیں ہندوستان کی صف اول کی ماہر لسانیات پروفیسر انویتا ابی کی باتوں پہ بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ جب وہ سہ لسانی کے بجائے Four Language Formula کی بات کرتی ہیں۔

ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم آج پہلے سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے۔ نئی شہری آبادی میں بچے ایک نئی فضا میں پل بڑھ رہے ہیں۔ ماہرین لسانیات بچوں کی نفسیات کو دھیان میں رکھ کر نئی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے عام طور پر بچوں کے والدین کی زبان ایک ہی ہوا کرتی تھی۔ لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے۔ ممبئی، بنگلور، دہلی، کولکاتہ، چنئی، بھوپال اور لکھنؤ جیسے شہروں میں ایک بڑی آبادی ایسے بچوں کی ہے جن کے والدین کی زبانیں ایک نہیں ہیں۔ دہلی یا بھوپال میں مقیم ایسے افراد اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بچہ بھوپال کے انگریزی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے والد کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔ ان کی مادری زبان مراٹھی ہے۔ جبکہ والدہ کا تعلق تمل ناڈو سے ہے، جن کی مادری زبان تمل ہے۔ وہ بچہ گھر میں والد سے مراٹھی میں بات کرتا ہے، والدہ سے تمل زبان میں بات کرتا ہے۔ اور اسکول میں اس کے اساتذہ انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ اور وہی بچہ جب کھیل کے میدان میں اپنے دوستوں کے ساتھ فٹ بال یا کرکٹ کھیلنے جاتا ہے تو وہ دوستوں سے ہندی میں بات کرتا ہے۔ وہ ہمہ وقت چار زبانوں کے حصار میں ہے۔ اور ستم تب ہوتا ہے جب اس کے اسکول میں انگریزی و ہندی کے ساتھ بطور تیسری زبان اسے جرمن یا فرنچ پڑھنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ اب اگر اس کے اسکول میں مراٹھی یا تمل زبان کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے تو لازمی طور پر وہ تیسری زبان کے طور پر فرنچ یا جرمن پڑھے گا۔ اس طرح وہ پانچ زبانوں کا بوجھ لے کر اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھے گا۔

ہندوستان میں سیکڑوں زندہ زبانیں چلن میں ہیں۔ ایسی زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے تو وہ زبانیں بھی ہیں جنھیں پچاس سے بھی کم لوگ بولتے ہیں۔ شمال مشرق میں جہاں آسٹرک خاندان کی زبانیں رائج ہیں، وہاں Multilingualism کا بہت پیچیدہ منظر نامہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ اسکول کے بچوں پر ہمیشہ اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ ایک ان دیکھے دباؤ میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتے ہیں۔ ناگالینڈ اور میزورم جیسی ریاستوں میں زمینی صورت حال ماہر لسانیات کو تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آج جبکہ ہندوستان میں انگریزی کی لازمیت کو مُسلط کیا جا چکا ہے۔ آج بچوں سے زیادہ والدین کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ انگریزی زبان سیکھنے سے روزگار کے مواقع ملیں گے۔ تو پھر کوئی چھوٹی، علاقائی زبان سیکھنے کے لیے کیوں اپنا وقت اور سرمایہ برباد کریں؟ لیکن جدید لسانیاتی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انگریزی کے بجائے کسی بچے کو اس کی مادری زبان میں زیادہ بہتر پرائمری تعلیم دی جا سکتی ہے۔

ماہرین لسانیات اس بات پہ متفق ہیں کہ تمام انسان ایک جبلی نظام زبان لے کر پیدا ہوتے ہیں، جس میں عمر بڑھنے کے ساتھ ترقی ہوتی ہے۔ زبان کی اس جبلی

> **مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کی ضرورت اس لیے درپیش ہے کہ ہم اپنی زبان کے دائرے کے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کر سکیں۔ تجارت، سیاحت، تہذیبی لین دین یا حکومتی و انتظامی اُمور میں بہتر کارکردگی کے لیے اپنی زبان کے دائرے سے باہر نکلنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ابتدائی تعلیم کے لیے مادری زبان کی اہمیت سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔**

ساخت کو بہتر اور مناسب تعلیم کے ذریعے معیاری سطح پہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ کوئی زبان سیکھ لینا الگ بات ہے اور فصیح و بلیغ زبان لکھنا و روانی سے بولنا الگ بات ہے۔ قدرت کی جانب سے ہر انسان میں صرف ایک ہی زبان کا بنیادی تخم ہوتا ہے۔ جسے ہم تخم مادری زبان کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیکھنے والے کے دماغ میں دوسری تمام زبانوں کے پودے باہر سے لگائے جاتے ہیں۔ اسی لیے مادری زبان کے پودے کی دیکھ بھال ٹھیک ڈھنگ سے نہ ہو تب بھی وہ زندہ رہتا ہے۔ جبکہ باہر سے لگائے ہوئے پودے مناسب دیکھ بھال کی مانگ کرتے ہیں۔

اسی لیے ہندوستان جیسے کسی کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم کو لے کر واضح پالیسی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یک لسانی سماج یا ملک میں زبان کی تعلیم کو لے کر واضح اور کارآمد پالیسی نہ ہو تب بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ لیکن کثیر لسانی سماج یا ملک میں زبان کی تعلیم کو لے کر واضح اور قابل عمل پالیسی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں زبان کی تعلیم اور اس کی اہمیت کے پیش نظر نہ صرف ایک بہت واضح، شفاف اور قابل قبول پالیسی کی ضرورت تھی بلکہ اسے عملی شکل دینا بھی نہایت ضروری تھا۔

مختلف ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی کئی کمیشن اور کمیٹیاں عمل میں آئیں، جن کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر سہ لسانی فارمولہ تیار کیا گیا۔ ہر کمیٹی اور کمیشن نے یہ مشورہ دیا کہ زبان کی معیاری تعلیم ہر بچے تک پہنچانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ سبھی ماہر تعلیم اور ماہر لسانیات اس بات پہ زور دیتے رہے ہیں کہ مادری زبان کو اوّلیت دی جانی چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے بڑے ہو کر ذہنی، جسمانی اور روحانی ہر اعتبار سے زندگی کے ہر شعبے میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں تو ہمیں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا نظام کرنا ہوگا۔ مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کی ضرورت اس لیے درپیش ہے کہ ہم اپنی زبان کے دائرے کے باہر کے لوگوں سے رابطہ قائم کر سکیں۔ تجارت، سیاحت، تہذیبی لین دین یا حکومتی و انتظامی اُمور میں بہتر کارکردگی کے لیے اپنی زبان کے دائرے سے باہر نکلنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ابتدائی تعلیم کے لیے مادری زبان کی اہمیت سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہندوستان کے صف اوّل کے ماہرین تعلیم اور ماہرین لسانیات نے ملک کو سہ لسانی فارمولہ دیا۔ جسے ہندوستان کی پارلیامنٹ نے بھی تسلیم کیا۔ قومی تعلیمی پالیسی 1986 نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اس فارمولے کو ہندوستان کے تعلیمی نظام میں نافذ کیا جا سکے۔ تمام کوششوں کے باوجود آج بھی اس فارمولے کو پوری طرح نافذ کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں۔ حالانکہ اس کے لیے 1968, 1975, 1988, 2000, and 2005 میں حکومت کی جانب سے کئی اقدامات کیے گئے۔ لیکن آج بھی اسے مکمل طور پر نافذ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اگرچہ پانچ دہائیوں میں سماجی، اقتصادی تبدیلی کے باوجود آج بھی اس سہ لسانی فارمولے کی اہمیت برقرار ہے۔ اس فارمولے کے تحت بچہ سب سے پہلے مادری زبان کی تعلیم حاصل کرے گا۔ جہاں تک دوسری زبان کا تعلق ہے وہ ہندی بولی جانے والے علاقے میں کوئی ایک جدید ہندوستانی زبان ہوگی یا پھر انگریزی۔ اور نان ہندی اسپیکنگ ریاستوں میں یہ دوسری زبان ہندی یا انگریزی ہوگی۔ جہاں تک تیسری زبان کا تعلق ہے، یہ ہندی اسپیکنگ ریاستوں میں انگریزی یا کوئی اور جدید ہندوستانی زبان ہوگی۔ لیکن یہ وہ زبان ہوگی جسے دوسری زبان کے طور پر اختیار نہ کیا گیا ہو۔ اور نان ہندی اسپیکنگ ریاستوں میں یہ تیسری زبان ہندی یا انگریزی ہوگی۔

اس سہ لسانی فارمولے کا بنیادی مقصد قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینا اور بین ریاستی ترسیل کو آسان بنانا تھا۔ اور آج بھی یہ مقصد زندہ ہے۔ انٹر اسٹیٹ اور انٹرا اسٹیٹ کمیونیکیشن کو آسان بنانے میں اس سہ لسانی فارمولے کی بڑی اہمیت ہے۔ اور جب ریاستوں کے درمیان ترسیلی رکاوٹ دور ہوگی تو قومی یکجہتی کو خود بہ خود فروغ حاصل ہوگا۔ کچھ ماہرین لسانیات اس بات کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ سہ لسانی فارمولے پہ از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر پردیپ کمار داس شمال مشرقی ریاستوں کی لسانی رنگا رنگی پہ بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی ریسرچ کے مطابق نارتھ ایسٹ کی سات ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کو پوری طرح لاگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے حکومت ایک ہائی پاور کمیٹی تشکیل دے سکتی ہے۔ جس کی رپورٹ کے مطابق موجودہ سہ لسانی فارمولے میں ترمیم و اضافہ کیا جا سکے گا۔

موجودہ دور میں کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم کو لے کر کئی طرح کے مسائل نظر آتے ہیں۔ ماہرین ان مسائل پہ غور و فکر کر رہے ہیں۔ لیکن اب صورت حال پہلے کے مقابلے پیچیدہ ہو چکی ہے۔ اس کے سیاسی، معاشی، اور سماجی پہلو بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ایک ان دیکھے خوف نے بھی سماج کو زبان کی تعلیم کے حوالے سے غلط فہمی کا شکار بنایا ہے۔ گلوبلائیزیشن کے بہت سے فائدے ہیں تو کچھ نقصانات بھی ہیں۔ زبان کی تعلیم پر بھی گلوبلائیزیشن کے اثرات نمایاں ہیں۔ اب وطن سے محبت میں زبان سیکھنے کا چلن کمزور پڑ چکا ہے۔ مالی فائدہ میں زیادہ کشش نظر آنے لگی ہے۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔ لیکن

> **زبان کی تعلیم پر بھی گلوبلائیزیشن کے اثرات نمایاں ہیں۔ اب وطن سے محبت میں زبان سیکھنے کا چلن کمزور پڑ چکا ہے۔ مالی فائدہ میں زیادہ کشش نظر آنے لگی ہے۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ زبان کا تعلق سماجی رشتوں سے بھی ہے۔ زبان صرف روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ زبان کے ذریعے روزگار کا حصول ایک پہلو ہے۔ لیکن اس کے اور بھی تمام پہلو ہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔**

دشواری یہ ہے کہ زبان کا تعلق سماجی رشتوں سے بھی ہے۔ زبان صرف روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ زبان کے ذریعے روزگار کا حصول ایک پہلو ہے۔ لیکن اس کے اور بھی تمام پہلو ہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کثیر لسانی ملک میں سہ لسانی فارمولے پہ عمل کرتے ہوئے زبان کی تعلیم کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

■

Kulsum Fatima Nasir
Department of Linguistics
Faculty of Arts Extension Building
University of Delhi
Delhi - 110007

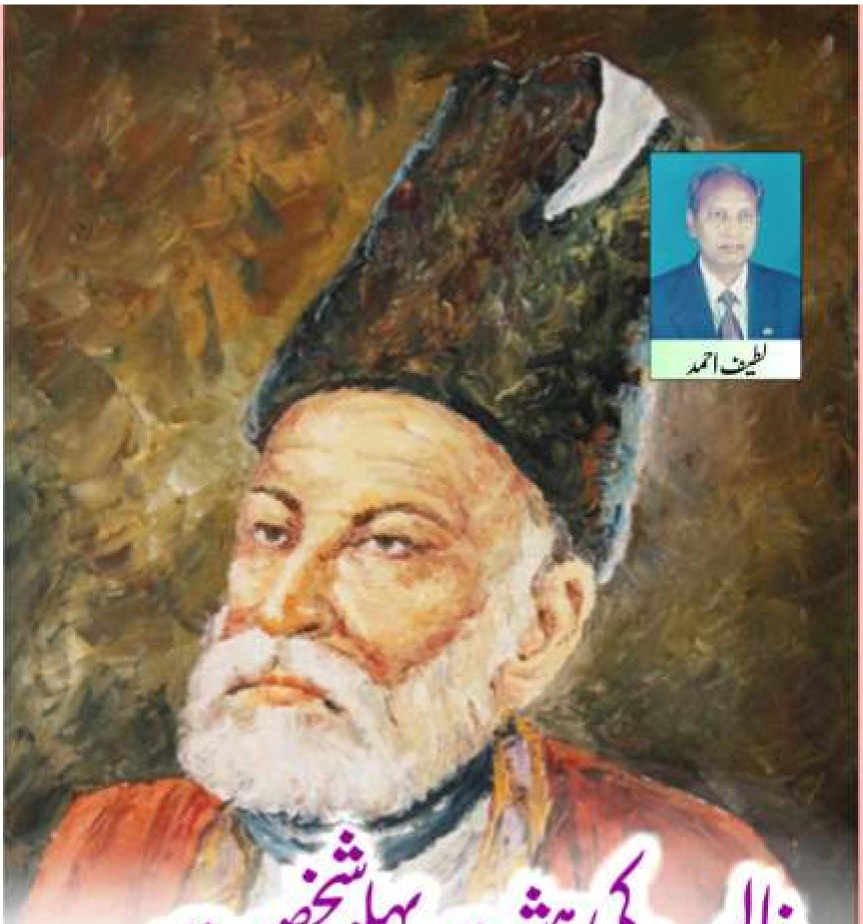

غالب کی ہشت پہلو شخصیت
باعث تماشا بھی اور تماشائی بھی

لطیف احمد

مرزا اسداللہ خان غالب اردو زبان کے عظیم بلکہ عظیم ترین شعرا میں سے ایک تھے۔ وہ جس قدر بڑے شاعر تھے اسی قدر بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی مجموعہ اعجاز و اکرام تھی۔ اردو زبان پر ان کے جو احسانات ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر اشعار ہمارے روزمرہ میں آج ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی میں جس قدر مقبول تھی آج وہ اس سے کہیں زیادہ قبول عام کا درجہ رکھتی ہے۔ ان پر جس قدر لکھا جاچکا ہے وہ ایک مثال ہے۔ اردو کا دوسرا کوئی شاعر، ناظرین و ناقدین کی اس قدر توجہ حاصل نہ کرسکا۔

ان کا اپنا دامن تو خوشیوں سے خالی تھا مگر وہ ہمیشہ دوسروں کی تفریح طبع کا سامان فراہم کرتے رہے بدقسمتی سے وہ جس دور کی پیداوار ہیں وہ افراتفری کا دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا سورج جو کبھی نصف النہار پہ چمکتا تھا اب زوال پزیر ہو چلا تھا۔ ایک تہذیب دم توڑ رہی تھی تو دوسری تہذیب کا سورج طلوع ہو رہا تھا ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان دور انحطاط سے گزر رہے تھے۔ سیاسی عدم استحکام، معاشی بدحالی اور معاشرتی مسائل کی الجھنوں سے دوچار تھے۔ اس دور آشفتہ میں غالب اکبرآباد، آج کے آگرہ میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن غالب کو یہ خوشحالی راس نہ آئی۔ انھوں نے اچھے دن کبھی بھی نہ دیکھے۔ ہمیشہ تنگ دستی اور ناداری سے سابقہ رہا۔

قدرت کی طرف سے انھیں ایک خلاق اور زرخیز ذہن ودیعت ہوا تھا۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے جو بات ایک بار سنتے ہمیشہ کے لیے ازبر ہوجاتی۔ مشہور ہے ان پر جب اشعار کا نزول ہوتا تو وہ ترتیب وار اپنے ازار بند میں گرہ لگاتے جاتے تھے بعد ازاں اسی ترتیب سے گرہ کھول کر انھیں لکھ لیا کرتے۔ مرزا در اصل دوہری شہرت کے مالک ہیں۔ بحیثیت شاعر اور نثر نگار۔ شاعری تو انھوں نے محض تیرہ سال کی عمر میں ہی شروع کردی مگر 43 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے زمانے کی بے اعتنائی اور بے حسی سے دل برداشتہ ہو کر شاعری سے اجتناب برتنے لگے اور خطوط نویسی کی جانب راغب ہونے لگے تھے۔

مرزا نے خطوط نویسی کی طرح ڈالی اور اسے اوج کمال تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اپنی خطوط نویسی سے اردو نثر کو ایک نئی راہ دکھائی جو مشعل راہ ثابت ہوئی۔ ان سے پہلے اردو میں مسجع اور مقفیٰ عبارت آرائی کا رواج تھا۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ مرزا اردو نثر کے موجد تو نہیں مگر انھوں نے سلیس اور سادہ نثر نگاری کی بنیاد ضرور رکھی۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ وہ نظم کے مقابلے نثر نگاری میں بہت جلد مقبول ہوئے اور ان کا اسلوب ہر مکتب فکر نے اپنایا۔ مشہور ہے کہ غالب نے محض تیرہ برس کی عمر ہی میں شعر و شاعری شروع کردی تھی۔ بظاہر یہ عمر شاعری جیسے مشکل فن کی متحمل تو نہیں تھی اسے شاعری کی اصطلاح میں تک بندی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد مرزا نے جب قصر شعر و شاعری میں قدم رکھا تو اس شان سے کہ سارا قصر ان کی آواز کی بازگشت سے گونج اٹھا۔ بزم اردو شاعری میں ان کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ انھوں نے باغ اردو شاعری میں جو گل بوٹے کھلائے ان کی خوشبو چہار سو بکھرنے لگی اور جہاں جہاں پہنچی ذہن و دل کو مسحور و مسرور کرگئی۔

مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ مرزا نے پینتالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے زمانے کی بے حسی اور بے اعتنائی سے بد دل ہو کر شاعری میں دلچسپی لینا کم اور نثر نگاری (خطوط نویسی) کی جانب زیادہ توجہ دینی شروع کردی تھی۔ مرزا کی محض بائیس سالہ شاعری کے مختصر سے دور کے نمونے ہمارے سامنے ہیں لیکن اس بائیس سالہ دور میں نہ جانے کتنے موڑ آئے۔ وہ مہمل گو اور مشکل پسند کہلائے۔ نازک خیالی، بلند پروازی اور معاملہ بندی میں خوب نام کمایا۔ فلسفی شاعر کے لقب سے بھی نوازے گئے۔ چاپلوسی اور خوشامدی بھی کہلائے۔ تنگ دستی اور ناداری نے انھیں کسی حد تک خوشامدی ضرور بنا دیا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اس الزام تراشی اور تہمت کے باوجود خودداری کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر کی طلبی پر غالب قلعہ معلی کے دروازے تک پہنچے تو سہی مگر اپنے خیر مقدم کے لیے کسی کو موجود نہ پا کر الٹے پیروں واپس بھی آگئے۔ بادشاہ کے عتاب و جلال اور ان کی ناراضگی کا انھیں مطلق احساس نہ رہا۔ حالانکہ بادشاہ کی اعانت کے بغیر ان کے لیے زندگی گزارنا محال تھا۔ اس سے بڑھ کر خود پسندی اور خودداری اور کیا ہوسکتی ہے۔ جب پرسش ہوئی تو گویا ہوئے کہ میں اتنا گیا گزرا نہیں کہ میں آپ کے در اقدس پہ حاضری دوں اور میرے استقبال کے لیے کوئی موجود نہ

ہو۔ میری غیرت اس تذلیل کی متحمل نہ ہوسکی اور میں واپس ہوآیا۔

غالب کو اپنے فقر اپنی تہی دامنی پر بھی ناز تھا۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے بے حال تھے۔ ان کی نظریں بچا کر گھر سے نکلنا بھی محال تھا۔ ایک وقت اگر کھانا ڈھنگ کا مل بھی جاتا تو دوسرے وقت کی فکر دامن گیر رہتی قاسم کو کلے والی کی گلی میں ساری زندگی کرایہ کے ایک مکان میں گزاری۔ وضع دار بھی تھے نوکروں کی بھی کمی نہ تھی۔ کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کے باوجود قدح آشنا بھی تھے۔ مخصوص دوستوں کی معاونت اور شاہوں کی عنایت پر گزارہ تھا۔ حالات نے بڑی حد تک انھیں مفت خورہ بھی بنا دیا تھا۔ بااین ہمہ مزاج میں خودداری، بے نیازی اور قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مٹی سے بنے ہوئے پیالہ کو شاہ ایران، جمشید کے پیالہ سے بہتر جانتے تھے جو اپنی طرفگی اور بے شمار خصوصیات کی وجہ سے بے مثال تھا۔ زعم اس بات کا بھی تھا کہ اگر ٹوٹ بھی گیا تو بازار سے دوسرا خرید لیں گے:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

غالب کو اپنے تشخص اور اپنی انا کی برتری کا ہمہ وقت احساس تھا۔ وہ قلاش سہی مگر احساس کمتری کا شکار ہرگز نہ تھے۔ ان کا دل خلوص ومحبت سے لبریز تھا۔ یہ ان کی شخصیت کا روشن پہلو ہے کہ وہ دوستوں کے بڑے قدر دان تھے وہ ہندو ہو یا مسلم اس سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کی محبت میں ان کا مذہب کبھی بھی مانع نہ ہوا۔ وہ بلا امتیاز مذہب وملت، ہر ایک کو اپنا جانتے تھے اور یکساں خلوص ومحبت سے پیش آتے تھے وہ خود تو دوسروں کی اعانت اور مہربانیوں پہ گزارا کرتے تھے مگر دوستوں کے معاملے میں بڑے سخی اور فیاض واقع ہوئے تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ایک غیر مسلم دوست تھے۔ کبھی وہ صاحب ثروت بھی تھے مگر کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر مالی پریشانیوں کی زد میں آگئے۔ سخت کوشی میں دن گزارنے پڑے۔ ایک روز وہ غالب سے ملنے آئے۔ وہ ایک فرغل جو کافی کثیف تھا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا بھی تھا جس میں سے ان کی غربت جھانک رہی تھی، پہنے ہوئے تھے۔ مرزا سے ان کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ مرزا نے پہلے تو انھیں بے تکلف ہونے اور لبھانے کے لیے ادھر ادھر کی کچھ باتیں شروع کیں۔ شکوہ بھی کیا کہ آپ ادھر سے گزریں اور میں آپ کی مزاج پرسی کے لیے حاضر بھی نہ ہو پاؤں اس سے زیادہ اور مذموم بات کیا ہوسکتی ہے۔

وہ جب ذرا بے تکلف ہوئے تو مرزا نے ان سے استفسار کیا کہ آپ جو فرغل زیب تن کیے ہوئے ہیں اسے کہاں سے سلوایا۔ اس کی وضع قطع بڑی عمدہ ہے۔ یہ آپ مجھے عنایت کر دیجیے میں اسی وضع کا فرغل سلواؤں گا۔ مرزا فرغل کی وضع قطع کے بہانے انھیں اپنا نیا فرغل پہنانے اور ان کا پرانا فرغل اتروانا چاہتے تھے مرزا کا مقصد دوست کو شرمندہ کرنا ہرگز نہ تھا۔ دوست خود بھی یہ بات سمجھتے تھے اس لیے وہ احساس احسان مندی اور تشکر کے ڈھیر ہوئے جارہے تھے غالب جب تک ان کا فرغل اتروانے میں کامیاب نہ ہوئے ان کا کوئی عذر نہ سنا۔ مرزا نے قطعی کوئی ایسا تاثر نہ دیا کہ وہ دوست پر احسان کر رہے ہوں۔ غالب ایک دردمند دل رکھنے کے ساتھ ہی بڑے زندہ دل بھی تھے ان کو معاملہ بندی اور حاضر جوابی میں بڑا ملکہ حاصل تھا ازراہ مزاح وہ باتوں میں ابہام پیدا کر دیا کرتے تھے اور بات سے بات نکالنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

واقعہ ہے کہ ایک بار بہادر شاہ ظفر نے عید کے موقع پر گپ شپ کے دوران مرزا سے ازراہ شغل دریافت فرمایا مرزا تم نے اس بار کتنے روزے رکھے مرزا نے فوراً جواب دیا حضور 'ایک نہیں رکھا' مرزا نے اپنی بات میں اس طرح ابہام پیدا کیا کہ سامع کو یہی گمان ہوا کہ مرزا سے بس ایک روزہ قضا ہوگیا ہے۔ مگر اس جملے کا یہ بھی ایک مطلب نکلتا ہے کہ ایک روزہ بھی نہیں رکھا اور یہی بات سچ بھی تھی۔ مرزا روزہ نماز کے پابند نہ تھے۔ بادشاہ ظفر بات کی تہہ تک پہنچ تو گئے مگر ان سے یہ نہ بن پڑا کہ وہ پھر دوسرا سوال کریں۔ ہنس کر خاموش ہوگئے۔ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک بار غالب لکھنؤ پہنچے اور نواب آصف الدولہ کے مہمان ہوئے ایک روز دوپہر کو کھانے اور قیلولہ کرنے کے بعد نواب کے ہمراہ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ نواب صاحب اپنے کسی نکتے کی وضاحت بڑے پرجوش انداز میں کر رہے تھے۔ غالب ان کی جانب متوجہ ہونے کی بجائے پکے ہوئے آموں کو بڑے غور سے دیکھے جارہے تھے۔ نواب صاحب نے غالب کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر بڑی خفت محسوس کی اور جزبز ہو کر مرزا سے پوچھا کہ کیا آپ نے کبھی آم نہیں دیکھے۔ مرزا نے بڑی متانت سے جواب دیا قبلہ آم تو دیکھے ہیں مگر میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کسی آم پر میرا بھی نام لکھا ہوا ہے کہ نہیں۔ نواب صاحب ان کا مطلب سمجھ گئے اور دوسرے ہی دن ایک ٹوکری آم ان کی قیام گاہ پر بھجوا دیے۔

اسی قبیل کا ایک اور واقعہ ہے مرزا اپنے دوستوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ آم ہی موضوع گفتگو تھا سب ہی اپنی اپنی آرا کا اظہار کر رہے تھے۔ غالب کی باری آئی تو انھوں نے کہا بھائی میں اتنا جانتا ہوں کہ "آم میٹھے ہوں اور خوب ہوں" اتفاقاً اسی لمحہ ایک گدھا گلی کے نکڑ پہ نمودار ہوا اور پڑے ہوئے آموں کے چھلکوں کی جانب منھ بڑھایا اور کھائے بغیر چل دیا۔ ایک بے تکلف دوست نے موقع پا کر مرزا کو ستانے کے لیے کہا مرزا صاحب دیکھیے "آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں پوچھتا" مرزا نے برجستہ جواب دیا "بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔"

غالب بچوں میں بچے بن جایا کرتے تھے ایک بار غالب نے بچوں سے پیسہ کے عوض پیر دبانے کو کہا۔ بچے جب پیر دبا چکے تو اجرت کے طالب ہوئے۔ غالب نے کہا بھائی کیسے پیسے! تم نے میرے پیر دبائے میں نے تمہارے پیسے دبائے حساب برابر۔ مرزا کی نظم ہو کہ نثر ایسے واقعات سے پر ہے جس میں ان کی ظرافت شوخی اور بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ان کی باتوں میں پھکڑ پن یا سفلہ پن نام کو بھی نہیں ہوتا۔ ان کی تحریر وتقریر میں حس مزاح تو ہوتی ہے مگر وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔ وہ طنز ومزاح کے معاملے میں ایک مقررہ سطح سے نیچے نہیں اترتے۔ لطافت اور نازک خیالی اس میں رچی بسی ہوتی ہے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کہتے ہیں خدایا ہم فرشتوں کے لکھے پر قابل تعزیر ٹھہرائے جاتے ہیں فرشتوں کے جو جی میں آتا ہے ہمارے خلاف لکھ دیتے ہیں ہمارا نہ کوئی گواہ ہوتا ہے نہ کوئی وکیل۔ فرشتوں کو ہم سے پرخاش اور عداوت بھی تو ہوسکتی ہے۔ نرے انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ شکایت درج ہوتے وقت ہمارا بھی کوئی آدمی وہاں موجود ہوتا تو حق اور انصاف کا بول بالا ہوتا۔ یہ تو ایک طرفہ بات ہوگئی جو تیرے انصاف اور تیری شان کے منافی ہے۔

غالب کی فطرت میں طنز ومزاح کا عنصر اس قدر تھا کہ غم کے موقع پر بھی کبھی کبھی ان کی حس مزاح پھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اپنے جواں سال بھانجے کی موت پر مرثیہ لکھنے بیٹھے تو اس موقع پر بھی ان کی فطری طبع موقع کی مناسبت کی پابند نہ رہ سکی بھانجے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ تم اپنی زندگی میں تو قول قرار کے اتنے پکے نہ تھے کہ اگر کسی سے کوئی وعدہ کیا تو وقت پر اسے پورا بھی کیا۔ تو پھر ملک الموت سے کیوں اس قدر ثابت قدمی اور راستی سے پیش آئے۔ ملک الموت نے تم سے کہا چلو اور تم چل دیے جس طرح اوروں کو ٹال جایا کرتے تھے ملک الموت کو بھی دو چار دنوں کی لیے ٹرخا دیتے۔

غالب نے اس مرثیہ میں اپنے غم کا اظہار بھی کیا ہے تو ایک انوکھے انداز میں۔ بھانجے کی موت سے ان کا سینہ دردوغم سے شق ہوا جا رہا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی مگر غالب کو اپنی جبلت اور فطری سوچ کے آگے بند باندھنے پر اختیار ہی کب تھا۔

غالب ہشت پہلو اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ان کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت ان کی شوخی اور بذلہ سنجی ہے وہ شاہوں اور پیغمبروں کو بھی اپنی شوخیِ طبع اور شرارت کا ہدف بنانے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ وہ فرشتوں کو بھی نہیں بخشتے۔ انھیں فرشتوں کی غیر جانب داری پہ بھی شک گزرتا ہے۔ وہ جنت اور دوزخ کی حقیقت کو حوروں کے معمر ہو جانے کا بہانہ بنا کر حق وانصاف، سزا و جزا کے خیال سے خود کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے غالب یہ سب باتیں محض ہنسنے ہنسانے کے لیے کرتے ہیں حقیقت سے ان باتوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مرزا اپنے دوستوں اور مذہب کے معاملے میں بڑے آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ وہ مذہبی رسومات کی سختی سے پابندی کے قائل نہ تھے۔ ایک بار رمضان کا مہینہ تھا ایک دوست دوپہر کو ان سے ملنے آئے ان کی موجودگی میں غالب نے نوکر کو پانی لانے کو کہا۔ پانی آیا اور غالب بلا عذر اور تکلف پانی غٹاغٹ پی گئے۔ بے تکلف دوست سے رہا نہ گیا اور سوال کر بیٹھا کیا مرزا تم روزہ نہیں رکھتے مرزا نے برجستہ کہا میں چونکہ سنی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے افطار ذرا جلدی کر لیتا ہوں۔

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ غالب کو شطرنج سے بڑا شغف تھا۔ وہ ایک دن شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے اتفاق سے ایک دوست جو شرع کے پابند تھے مرزا سے ملنے آئے۔ مرزا کو شطرنج کھیلتا دیکھ کر کہا۔ میں نے ایک حدیث پڑھی تھی کہ رمضان کے مہینہ میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے برجستہ جواب دیا تھا بھائی حدیث کی صحت میں احتمال کی کوئی گنجائش نہیں۔ حدیث درست ہے دراصل یہی وہ جگہ ہے جہاں شیطان کو قید کیا گیا ہے۔

غالب دنیا کو تماشا گاہ اور بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ انھیں نہ صرف دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہے بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا کی یہ رونق اور چہل پہل چند روزہ ہے۔ انسان کی زندگی مثل حباب ہے جو چند ثانیوں کے لیے سطح آب پر ابھرتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے۔ انسان اس مختصر سی زندگی میں کبھی تو تماشائی ہے اور کبھی خود ہی تماشا۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ایک کٹھ پتلی کی مانند دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار نبھاتا ہے اور پردوں میں چھپ جاتا ہے۔ وہ کہاں سے آتا ہے کہاں جاتا ہے کوئی نہیں جانتا۔

غالب کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے شعبہ ہائے زندگی کے کم وبیش ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے رموز واسرار کی تفسیر اس خوبی سے کی ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع کی ترجمانی کسی اور اردو شاعر سے نہ ہو سکی۔

دکھ اور سکھ انسانی زندگی کے دو اہم پہلو ہیں۔ حیات وموت کا دامن سکھ اور دکھ سے جڑا ہوا ہے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رشتہ یا تعلق ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ دکھ اور سکھ زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ دکھ ہے تو زندگی ہے زندگی نہیں تو دکھ بھی نہیں۔ فنا اور بقا کے مسئلہ کو غالب نے الفاظ کا جو لباس پہنایا ہے وہ کتنا جاذب نظر اور دل پذیر ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہمارے معاشرے میں روزمرہ اور ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کوئی بھی موقع ہو کوئی بھی محل ہو۔ بزم شاعری ہو کہ بزم خوباں بزم شادی ہو کہ بزم ماتم یا پھر بے تکلف دوستوں کی محفل ہو۔ غالب ہر موقع پر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ہمارے درمیان آموجود ہوتے ہیں۔ یہی وہ پیمانہ ہے یا صیغۂ راز جہاں غالب کی مقبولیت کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔

غالب کو فلسفی شاعر ہونے کا اعزاز بھی ملا۔ غالب فلسفی نہ بھی سہی مگر ان کا اسلوب شعر گوئی فلسفیانہ ضرور ہے۔ یہی وہ خوبی ہے کہ غالب اپنے ہمعصروں پر غالب تھے۔ وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں۔

ان کے خیال میں مذہب کی بنیادوں پر انسان کی تقسیم یا تفریق نہیں ہو سکتی ہے۔ بحیثیت انسان تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ غالب کی زندگی مذہبی رواداری اور آزاد خیالی کی ایک درخشاں مثال ہے۔

وہ کہتے ہیں جب تک مذہبی عصبیت کا دور دورہ ہے انسان دوستی، اور آپسی بھائی چارہ فروغ نہیں پا سکتا۔ اخوت ومحبت کی بقا کے لیے مذہبی عصبیت کا خاتمہ ضروری ہے ایمان کی نمود اور تکمیل مذہبی تفریق کو مٹائے بغیر ممکن نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

عام خیال ہے کہ جنت میں دودھ وشہد کی نہریں جاری ہوں گی اور عابد وزاہد حضرت وہاں وہی لطف اٹھائیں گے جو دنیا میں میسر ہے، غالب جنت کے اس تصور سے اتفاق نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اسے قابل اعتنا سمجھتے ہیں۔

عبادت اور فرمابرداری اگر اس نیت سے کی جائے کہ اس کے عوض بہشت میں وہ تمام آسائشیں اور مراعات انسان کو ملیں گی جو انسان کو دنیا میں پیسہ کے عوض میسر ہیں۔ غالب اس عبادت اور بندگی کو اچھا نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں ایسی جنت سے دوزخ ہی بھلی جو انسان کو برے کاموں سے دور رکھنے کا سبب بنتی ہے اور اچھے کاموں کی جانب مائل کرتی ہے:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

جب تک زندگی ہے دنیاوی مال ومتاع، نفع ونقصان کے متعلق آدمی سوچتا ہے فکر اور پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے مگر آنکھ بند ہوتے ہی انسان کو اس فکر اور پریشانیوں سے نجات مل جاتی ہے یہ نہ نفع ہونے کی خوشی ہوتی ہے اور نہ نقصان ہونے کی فکر ستاتی ہے۔

غالب اگرچہ مذہبی رسومات کے سختی سے پابند نہ تھے تاہم وہ خود کو قصوروار ضرور مانتے ہیں جب ہی تو وہ زیارت کعبہ سے مشرف ہونے سے کتراتے ہیں ان کی نظر میں دنیاوی زندگی کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ وہ دنیا کو ایک تماشا گاہ سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

غالب چند روزہ زندگی مستعار کو ہنس ہنسا کر گزارنا چاہتے ہیں غالب کی نظر میں رنج والم اور زندگی میں ازلی رشتہ ہے۔ دونوں لازم ملزوم ہیں جب تک زندگی ہے تب تک دکھوں کو جھیلنا ہی پڑے گا اس لیے ہنسی اور چہل کا وہ سہارا لیتے ہیں تا کہ غموں اور دکھوں کا یہ بار کچھ تو کم اور ہلکا محسوس ہو۔

حواشی:

1۔ تاریخ رام بابو سکسینہ، لکھنؤ، 1986
2۔ یادگار غالب، الطاف حسین حالی، علی گڑھ
3۔ تاریخ ادب اردو، نورالحسن نقوی، دہلی، 2000
4۔ فنکار ماہنامہ، قمر برتر گوالیار، 2007
5۔ مہ لقا اعجاز، نقوش ادب، دہلی، 1998
6۔ دیوان غالب، علی گڑھ

■

Prof. Dr. Lateef Ahmad
Department of Languages
University of Rajshahi- 6205 (Bangladesh)
+ 8801983-494407

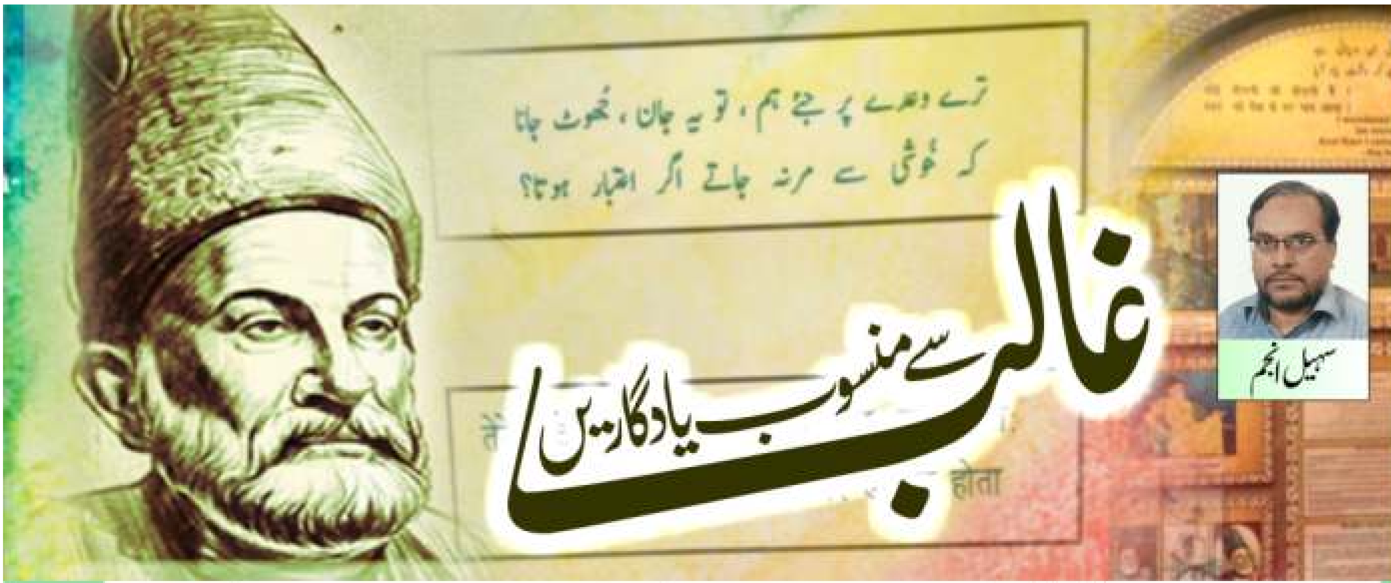

غالب سے منسوب یادگاریں

سہیل انجم

اگر اٹھارویں صدی کو خدائے سخن میر تقی میر کی صدی کہا جائے تو انیسویں صدی کو بلا شبہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صدی کہنا پڑے گا۔ غالب نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں وہ عہد بڑا پر آشوب تھا۔ مسلم حکومت اور اس کا جاہ وجلال سب کچھ تاریخ کے صفحات میں گم ہونے کو بے چین تھا اور نئے مگر غیر ملکی فرماں روا سریر آرائے سلطنت ہو رہے تھے۔ ان حالات کے جبر کا اثر غالب کی فکر پر بھی پڑا جس کا اظہار ان کی شاعری اور نثر دونوں میں ہوا ہے۔ غالب کی عظمت کو ان کے عہد میں نہیں پہچانا گیا جس پر وہ تا زندگی افسوس کرتے رہے۔ لیکن ان کے بعد اور بالخصوص بیسویں صدی کے وسط میں ان کو ان کے جائز منصب پر فروکش کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ جہاں غالب کی زندگی اور ان کے فکر وفن پر تحقیقات کا سلسلہ تیز ہوا وہیں ان کی یادوں کو دوام بخشنے کے لیے ان کے نام پر متعدد ادارے قائم ہوئے اور ان کے یوم پیدائش اور یوم وفات کو بڑے پیمانے پر منایا جانے لگا۔ غالب یوں تو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی زندگی دار الحکومت دہلی میں گزری۔ اسی لیے انھیں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دہلی پر یہ فرض تھا کہ وہ غالب کے شایان شان ان کی یادگاریں قائم کرتی۔ اس فرض کی ادائیگی سے سبک دوش ہونے کے لیے یہاں ان کے نام پر کئی ادارے قائم کیے گئے ہیں جن میں غالب اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل قانونی اور سیاسی جدو جہد کے بعد غالب کی حویلی کے ایک حصے کو بازیاب کرایا گیا ہے جہاں ان کو مختلف طریقوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکیڈمی کے زیر سایہ غالب کا مزار بھی ہے جس پر ان کے یوم پیدائش اور یوم وفات پر گل پوشی کی جاتی ہے اور مختلف پروگراموں کے توسط سے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں ہم کوشش کریں گے کہ دہلی میں غالب کے نام پر جو ادارے قائم ہیں ان کی تفصیلات پیش کی جائیں اور ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی جائے۔

آیئے سب سے پہلے گلی قاسم جان، بلی ماران میں واقع غالب کی حویلی چلتے ہیں۔ دہلی میں غالب نے کئی رہائش گاہیں تبدیل کی تھیں۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ اسی حویلی میں گزارا تھا۔ یہ حویلی ان کے زمانے میں بہت بڑی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ 412 گز تھا اور یہ گلی قاسم جان سے لے کر کٹرہ عالم بیگ تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں اس کے کئی مالک اور کرایہ دار بدلے۔ لیکن آخر میں دہلی حکومت نے اسے نیلام کر دیا تھا۔ معروف قلمکار اور سماجی کارکن فیروز بخت نے متعدد مقامی شخصیات کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''حویلی کے دوسرے حصے کے بارے میں مسرور خان نے بتایا کہ 1960 کی دہائی میں اس کو حکیم محمد شریف نے جو کہ کانگریس پارٹی سے اس علاقے کے کارپوریشن ممبر تھے، محمد ابراہیم کو فروخت کر دیا تھا جنھوں نے یہاں لکڑی اور کوئلے کی ٹال کھول دی۔ اس کے بعد جب مٹی کے تیل اور گیس کے چولھوں کا رواج بڑھا تو انھوں نے لکڑی کا کام چھوڑ کر بلڈنگ بنانے کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔''

فیروز بخت اور ایک قانون داں اطیب صدیقی نے حویلی کی بازیابی کے لیے عدالت میں ایک پٹیشن داخل کی۔ ایک طویل عرصے کی قانونی جنگ کے نتیجے میں بالآخر 8 اگست 1997 کو جسٹس چندر موہن نیر نے ایک تاریخی فیصلہ سناتے ہوئے حکم دیا کہ دہلی حکومت چھ ماہ کے اندر غالب کی رہائش گاہ کو محفوظ کر کے اس عظیم شاعر کے شایان شان ایک یادگار قائم کرے۔ بہر حال 15 فروری 2000 کو دہلی حکومت نے حویلی میں ایک تقریب کا اہتمام کر کے اسے عوام کو وقف کر دیا۔ اس تقریب میں دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت اور لیفٹننٹ گورنر سمیت متعدد سیاسی، سماجی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ اس طرح 412 گز کی اس حویلی کے محض 130 گز کو واگزار کیا گیا اور اس میں غالب میوزیم قائم کیا گیا۔ جس کا مقصد غالب کی یاد کو زندہ رکھنا اور اہل ذوق سے اس عظیم شاعر کو متعارف کرانا ہے۔

ہم نے اس حویلی کی یوں تو بارہا زیارت کی ہے اور غالب کے شایانِ شان انتظام کے فقدان پر آنسو بہائے ہیں۔ لیکن یہاں غالب اور کلام غالب کے ساتھ کی جانے والی زیادتی ہمارے دیدۂ بینا سے اکثر و بیشتر اوجھل ہی رہی۔ لیکن حالیہ دنوں میں جب ہم ایک بار پھر زیارتِ حویلی کو گئے تو کئی باتوں نے ہمیں مایوس کیا۔ ہمارے ایک دیرینہ دوست، روزنامہ قومی آواز کے سابق کارکن اور ہمسایۂ غالب ریحان ہاشمی نے جب ہماری توجہ بد انتظامیوں کے ساتھ ساتھ غالب اور کلام غالب کے ساتھ کیے جانے والے بھونڈے مذاق کی طرف مبذول کرائی تو ہم واقعی ششدر رہ گئے۔

حویلی میں غالب اور ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلات اور متعدد اشعار اردو اور ہندی میں دیواروں پر آویزاں ہیں اور نیچے انگریزی میں ان کے ترجمے دیے ہوئے ہیں۔ لیکن کئی اشعار میں فاش غلطیاں نظر آئیں۔ غالب کا ایک شعر ہے: ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا''۔ یہ شعر ایک دیوار پر آویزاں ایک بڑے بورڈ پر کئی تصاویر کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی میں لکھا ہوا ہے اور نیچے انگریزی میں اس کا ترجمہ دیا ہوا ہے۔ جب ہم نے شعر پر غور کیا تو یہ عقدہ کھلا کہ مصرعہ ثانی غلط ہے اور یوں لکھا ہوا ہے: ''گھر کو دیکھ کر دشت یاد آیا''۔ کیا تیا پانچہ کیا گیا ہے مصرعے کا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بد ذوق کاتب شعر نے عمداً غالب کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کو شعر وسخن سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ وہ کم از کم یہی دیکھ لیتا کہ مصرعہ بحر سے خارج ہو رہا ہے۔ خیر کاتب شعر کو کیوں برا بھلا کہیں جن مداحانِ غالب نے وہ بورڈ آویزاں کرایا کیا ان کو بھی اتنا شعور نہیں تھا کہ وہ اسے ایک بار پڑھ لیتے اور غلطی کی اصلاح کرا لیتے۔

غالب کا ایک اور شعر یوں ہے: ''اگ رہا ہے درو

دیوار پہ سبزہ غالب، ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے''۔ یہ شعر ایک دوسری دیوار پر غالب کی دیوار پوش تصویر کے ساتھ اسی حجم میں آویزاں ہے۔ غالب اس رنگین، بڑی اور خوبصورت تصویر میں نیم دراز ہیں، بائیں ہاتھ سے حقے کی نے تھامے ہوئے ہیں اور دائیں ہاتھ سے ایک ڈائری پر کچھ لکھ رہے ہیں اور نیچے ایک موٹی سی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ غالباً اس سے دیوان غالب کا تصور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں جو شعر درج ہے اس کا مصرعہ اولی یوں لکھا ہے: ''اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب''۔ اس میں 'پہ' کو 'سے' کر دیا گیا ہے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک دوسری جگہ پر دیوان غالب کی پہلی غزل کے مصرعہ اولی کو ہی غلط لکھا گیا ہے۔ 'نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا' کو 'نقش فریادی' لکھا گیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ غلطیاں اردو میں ہیں ہندی میں نہیں ہیں۔ اگر ہندی میں ہوتیں تو بات سمجھ میں آنے والی تھی اور صبر کرنے والی بھی تھی کہ ہندی کے بہت سے لوگ دیوان غالب کو 'دیوانے غالب' کہتے ہیں۔ لیکن اردو میں ایسی فاش غلطیاں؟ اللہ کی پناہ۔ آج اگر غالب آجائیں اور ان غلطیوں پر ان کی نظر پڑ جائے تو یقیناً وہ اپنا سر پیٹ لیں گے اور ممکن ہے کہ وہ اپنا یہ شعر با آواز بلند پڑھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں: ''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں، مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں''۔

ہم مطمئن تھے کہ ہندی میں کوئی غلطی نہیں ہے لیکن بہت غور کے بعد ہندی میں بھی کئی غلطیاں نظر آگئیں۔ غالب کا ایک شعر یوں ہے: یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح، کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا۔ ہندی میں اس کے مصرعہ اولی میں ''یہ کہاں کی دوستی ہے'' کو 'یہ کہاں'' کہ'' دوستی ہے'' لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ہندی میں یہ شعر بھی درج ہے: ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا، کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔ اس کے دوسرے مصرعے میں ''آگر اعتبار ہوتا'' لکھا ہوا ہے۔ ایک اور شعر ہے: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اس کے دوسرے مصرعے میں 'مرے' غائب ہے اور شعر یوں درج ہے ''بہت نکلے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے''۔ چلیے یہ تو اشعار کی بات ہو گئی۔ حد تو تب ہو گئی جب ایک جگہ خود غالب کا نام غلط لکھا ہوا پایا گیا اور وہ بھی سب سے پہلے بورڈ پر۔ حویلی کے محراب نما دروازے سے جوں ہی اندر داخل ہوتے ہیں، بائیں جانب ایک بورڈ پر اردو، ہندی اور انگریزی میں مرزا غالب کا مختصر تعارف درج ہے۔ اردو میں مرزا ''اسعد اللہ'' خاں غالب لکھا ہوا ہے۔ ایسی فاش غلطی دیکھ کر جو کوفت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ اشعار کا جو حشر کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر۔ کم از کم غالب کے نام کے ساتھ تو زیادتی نہ کی جاتی۔

غالب کی اس حویلی میں بالکل ان کی اُسی کوٹھری کی مانند نیم تاریکی ہے جس میں وہ رمضان میں دن میں بیٹھ کر مصروف خورد و نوش رہا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب ان کے ایک قدردان نے ان کو محو خورد و نوش دیکھا تو اس نے ان سے کہا تھا کہ سنا ہے کہ رمضان میں شیطان قید کر لیا جاتا ہے تو انھوں نے برجستہ جواب دیا تھا کہ ''ہاں! اور وہ جہاں قید کیا جاتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے''۔ ہم نے سوچا کہ یہاں کی کچھ تصاویر بطور یادگار اپنے موبائیل میں قید کر لیں مگر نیم تاریکی نے ہماری امیدوں پر پانی پھیرنے کی بھرپور کوشش کی۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ یہاں کے چوکیدار سے اپنے موبائیل سے روشنی ڈالنے کو کہا جائے۔ ہم نے فرمائش کی کہ موبائیل کی ٹارچ سے ذرا روشنی ڈالیے، ہم حویلی کی کچھ یادگاریں قید کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے اپنے موبائیل کی ٹارچ روشن کی تو انکشاف ہوا کہ اس میں اتنی بھی جان نہیں ہے کہ وہ اس نیم تاریک حویلی کے کسی گوشے کو کم ہی سہی، روشن کر سکے۔ اس ٹارچ کو دیکھ کر میر کا یہ شعر زبان پر آ گیا: ''شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے، دل ہوا ہے چراغ مفلس کا''۔ لیکن بہر حال ہم ان عجائبات کا تحفہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لہٰذا ہم نے کم روشنی ہی میں کچھ تصویریں اتاریں۔ آج کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ ہلکے ہی سہی، ان عجائبات کے عکس ہم نے قید کر لیے۔ غالب بہت دور اندیش تھے۔ انھوں نے ایک بار انگریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارا مقابلہ اس قوم سے ہے جو ایک بٹن دبا کر تاریک کمرے میں اجالا کر دیتی ہے۔ آج اسی قوم کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی نے ان کی تصویریں اتارنے میں ہماری مدد کی۔

یہاں دالان میں شیشے کے دو شوکیسوں میں دیوان غالب کے بڑے بڑے نسخے محفوظ کیے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ وہ غالب کے زمانے کے ہوں گے۔ بوسیدہ کاغذ اور بڑے حروف میں لکھاوٹ۔ یہ دیوان یا تو غالب ہی کے زمانے کا ہے یا پھر ان کے فوراً بعد کا ہے۔ وہ آج کا نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس دور میں عام طور پر دو لفظوں کو ملا کر لکھنے کا چلن تھا۔ مثال کے طور پر سامنے جو غزل ہے اس میں نیم کش کو ''نیمکش'' لکھا ہوا ہے۔ یہاں ایک شوکیس میں اس وقت کے کچھ برتن رکھے ہوئے ہیں اور وہاں لکھا ہوا ہے کہ یہ اوریجنل نہیں ہیں بلکہ غالب کے دور میں استعمال ہونے والے برتنوں کے نمونے ہیں۔ یہاں ستم ظریفی کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ بھی دیکھنے کو ملا۔ جس شوکیس میں برتن رکھے ہوئے ہیں اسی میں ایک کونے میں حویلی کی صفائی ستھرائی میں استعمال ہونے والا جھاڑو پونچھا بھی رکھا ہوا ہے۔ انجان شخص اس کو دیکھ کر کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ بھی غالب کے عہد کے ہیں۔ اس شوکیس کے برابر میں دیوار میں شیشے کی ایک الماری بنی ہوئی ہے جس میں غالب سے متعلق کچھ کتابیں اور کچھ رسالے رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی بدسلیقگی سے کام لیا گیا ہے۔ کتابیں اور رسائل گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ یہیں ایک گوشے میں غالب خوب اونچی ٹوپی زیب سر کیے ہوئے اور حقے کی نے تھامے ہوئے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے ایک چھوٹی سی میز اور برابر میں ایک چھوٹا سا پاندان رکھا ہوا ہے۔ پشت کی طرف گاؤ تکیہ ہے۔

جبکہ حویلی میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب کے کمرے میں غالب کا ایک سنگی مجسمہ اونچائی پر نصب ہے اور اس کی دونوں جانب بھی اسٹینڈوں پر دیوان غالب کے نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ حصہ چونکہ بڑا ہے اس لیے کسی شوکیس میں نہیں ہے بلکہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ سامنے کی جانب ڈوری باندھ کر رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس رکاوٹ میں بھی کوئی سلیقہ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ مجسمہ شاعر، نغمہ نگار اور فلم ساز گلزار کا عطا کردہ ہے۔ یہاں غالب کا ایک چغہ بھی لٹک رہا ہے۔ برابر میں ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر اردو، ہندی اور انگریزی میں حیات غالب کے چند شخصی پہلو تحریر ہیں۔ اس کے بالمقابل دیوار پر ایک بورڈ اور ایک بڑا سا شوکیس آویزاں ہے۔ بورڈ پر غالب کی شریک حیات امراؤ بیگم کی اور خود ان کی تصویر ہے اور نیچے امراؤ بیگم کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ جبکہ شوکیس میں ان کا لباس سجایا ہوا ہے۔ ان تفصیلات کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا، کیا پتا ان میں بھی غلطیاں موجود ہوں۔

مجموعی طور پر یہاں کے حالات بدانتظامی اور بد ذوقی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ غالب بڑے اعلیٰ ذوق کے حامل اور نفاست پسند انسان تھے اور عمومیت تو انھیں بہت ناگوار خاطر تھی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایسے وبائی عالم میں جبکہ لوگ مر رہے تھے، مرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن بہر حال یہی کیا کم ہے کہ بعض مداحان غالب کی کوششوں سے ان کی حویلی کی بازیافت ہوئی ورنہ کیا پتا کہ اب تک یہاں لکڑی اور کوئلے کی ٹال ہی ہوتی۔ اردو کے اس زوال آمادہ دور میں وہ لوگ بہر حال مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے فردوسِ ہند مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حویلی کی بازیابی میں اہم رول ادا کیا۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ وہاں کے انتظامات بہتر ہوں۔ روشنی کا

معقول انتظام کیا جائے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اشعار اور نام میں جو غلطیاں ہیں ان کی تصحیح کی جائے۔ کم از کم یہ کام تو ہر حال میں ہو جانا چاہیے۔

یہ غالب اکیڈمی ہے۔ متھرا روڈ پر چڑیا گھر کی طرف سے جنوب کی طرف آئیں تو دہلی پبلک اسکول واقع ہے اور اس کے بعد آسمانی گنبد ہے۔ اس گنبد سے آگے بڑھتے ہی پولیس اسٹیشن کے برابر سے مغرب کی جانب ایک سڑک جاتی ہے جو دائیں ہاتھ پر بنگلے والی مسجد سے ہوتے ہوئے جو کہ تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، آگے نکل جاتی ہے۔ یہیں بائیں جانب غالب اکیڈمی کی تین منزلہ عمارت موجود ہے۔ یہی راستہ آگے حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ تک لے جاتا ہے۔ غالب اکیڈمی کو ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید نے 1969 میں قائم کیا تھا اور اس کا افتتاح اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا۔ غالب کی یاد کو زندہ رکھنے کی غرض سے اکیڈمی کے قیام کی خاطر حکیم صاحب نے غالب اکیڈمی کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی تھی۔ غالب اکیڈمی کے موجودہ سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد کے مطابق سوسائٹی میں کرنل بشیر حسین زیدی، قاضی عبدالودود، مالک رام، کنور مہیندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد فاروقی، گوپی ناتھ امن، خواجہ غلام السیدین، محمد مجیب، ہمایوں کبیر، تارا کیشوری سنہا اور وی کے کرشنا مینن وغیرہ شامل تھے۔ یہاں 910 مربع گز پر مشتمل دو قطعات آراضی خریدے گئے اور ان پر غالب اکیڈمی کی تعمیر ہوئی جس کا خاص مقصد غالب کی یاد کو ہندو بیرون ہند قائم و دائم رکھنا ہے۔ اکیڈمی میں ایک غالب میوزیم بنایا گیا ہے جس میں غالب کے عہد کی جھلک نظر آتی ہے۔ غالب کے مکانوں کی تصاویر میوزیم کی خاص زینت ہیں۔ یہاں غالب کے مجسمے کے علاوہ ان کی غزلیں گانے والی ڈومنی کا مجسمہ بھی نصب کیا گیا ہے۔

میوزیم میں غالب کے لباس سجا کر رکھے گئے ہیں۔ ان کی مرغوب غذاؤں کو اس انداز میں رنگ و روغن لگا کر بنایا گیا ہے کہ ان پر اصل کھانے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے عہد کے سکے، ڈاک ٹکٹیں، مہریں اور خطوط کے نمونے بھی موجود ہیں۔ مشہور مصور ایم ایف حسین اور ستیش گجرال وغیرہ کی پینٹنگس جو کہ غالب کے اشعار پر مبنی ہیں، قابل دید ہیں۔ معروف فنکار کیپٹن برجیندر سیال نے چھوٹے چھوٹے دو دو تین تین سنگ ریزوں کو ایک ساتھ ملا کر ان میں غالب کے اشعار کے معنی پہنائے ہیں، جو کہ عجوبہ روزگار ہیں۔ غالب اکیڈمی کے ذریعے غالب کی یادوں کے ساتھ ساتھ ان کے فن و فلسفہ کو بھی پوری دنیا میں پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر ماہ ادبی نشست کا اہتمام کیا جاتا ہے اور غالب لیکچرس منعقد کروائے جاتے ہیں۔ جہانِ غالب کے نام سے ایک ماہنامہ جریدہ بھی شائع کیا جاتا ہے اور اکیڈمی کے پروگراموں میں جو مقالے پڑھے جاتے ہیں ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی مختلف زبانوں میں غالب پر جو کام ہو رہا ہے اس کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے مختلف قسم کے تعلیمی پروگرام بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

غالب اکیڈمی کی مغربی دیوار کے ساتھ ہی ایک قطعہ آراضی ہے جہاں غالب کا مزار واقع ہے۔ غالب اکیڈمی کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خطبے میں کہا تھا: ''سو سال بیت گئے کہ اسی مہینے میں

غالب کا جنازہ بلی ماروں سے حضرت نظام الدین کی اس بستی میں آیا تھا اور یہیں وہ سپرد خاک کیے گئے تھے۔ غالب عمر بھر ذاتی اور معاشرتی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ لیکن وہ مایوس کبھی نہیں ہوئے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیے اور کہا کہ یہ بھی گزر جائے گا۔ ان کی زندگی میں امید کی شمع کبھی گل نہیں ہوئی اور اسی امید کے سہارے وہ زندگی سے پورا لطف اٹھاتے رہے۔ اسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ آج نہیں تو کل لوگ مجھے پہچانیں گے۔ زندگی میں اگر مجھے اطمینان و سکون کا چمن زار نصیب نہیں تو اس سے کیا ہوا۔ ایک دن وہ ہوگا کہ میرے مزار کے چاروں طرف چمن بندیاں اور پھولوں کی کیاریاں ہوں گی۔ اس لیے کہ زندگی میں میرا دل کسی کے حسن کے جلووں سے معمور اور اس کے قرب کا متمنی تھا۔ میری یہ تمنا میرے مزار کے چاروں طرف لالہ و گل کی شکل میں نمایاں ہوں گی۔ غالب کے مزار کے چاروں طرف جو کچھ کیا جا رہا ہے اس میں غالب اکیڈمی کا قیام شامل ہے''۔ آج اگرچہ غالب کے مزار کے اطراف میں چمن بندیاں اور پھولوں کی کیاریاں نہیں ہیں تو کیا ہوا مزار سے متصل گزرگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ تک جاتی ہے اور یہ پوری گزرگاہ شب و روز پھولوں اور گلدستوں سے سجی رہتی ہے اور خوشبو بکھیرتی رہتی ہے۔

مزار غالب کے بارے میں بہت سے قلمکاروں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اس بارے میں خواجہ حسن ثانی نظامی لکھتے ہیں: ''سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے تشریف لانے سے قبل ہماری بستی کا نام غیاث پور تھا۔ دلی والے اسے سلطان جی بھی کہتے رہے ہیں۔ اس کو حضرت نظام الدین کب سے کہا گیا، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اول اول اس کے موجودہ مقام پر آبادی اس وقت شروع ہوئی جب حضرت نے خود یہاں قبرستان بنوایا۔ خانقاہ چونکہ دریا کے کنارے تھی اور سیلاب کا کچھ ٹھکانہ نہیں تھا اسی لیے شاید اس مقام کو سیلابوں سے بچا کر زندوں کے لیے نہیں ان مردوں کے لیے پسند کیا گیا جو بظاہر مردہ مگر دراصل زندہ تھے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب بھی انہی مردوں میں سے ایک زندہ تھے جو حضرت کے چھ سو برس بعد یہاں آکر بسے یا لا کر بسا دیے گئے۔ غالب کی زندگی میں اور پھر دفن کے وقت تک یہ جگہ ایک باغ کی شکل میں تھی جس کے مشرق میں نہر بہتی تھی اور باغ کو شاید نیا نویلا ہونے کے سبب باغچی انارکلی جیسا شاعرانہ نام دیا گیا تھا۔ غالب مذکورہ بالا جس باغچی انارکلی میں دفن ہوئے اس کے مالک سید نقی اور سید تقی دو بھائی پیرزادگان درگاہ حضرت اولیا میں سے تھے جن کی وراثت چونکہ میرے والد، میری والدہ اور ماموں اور خالہ کو بھی پہنچی تھی، اس لیے اس کے کچھ حصے کی فروخت بحیثیت مختار عام راقم الحروف کے ذریعے حکیم عبدالحمید صاحب کے نام اور ذکی خان صاحب کے نام ہوئی۔ غالب کے مزار کی تعمیر کے حوالے سے جو ہوائیاں اڑتی رہی ہیں اور جن میں سہراب مودی کا نام مالا کی طرح جپا جاتا ہے، اصلیت کچھ نہیں ہے۔ مودی صاحب کا اس کام میں کبھی کوئی حصہ نہیں رہا۔ اپنی فلم کی ریلیز کے وقت وہ مزار پر چادر چڑھانے ضرور آئے تھے۔ مزار غالب کی موجودہ تعمیر منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے اور ہندوستان کے مشہور سائنس داں سر شانتی سروپ بھٹناگر اور اشفاق حسین آف وزارت تعلیم وغیرہ کے سر ہے''۔

آج غالب کے مزار کو قدرے سرسبز و شاداب بنا دیا گیا ہے۔ لیکن چند برسوں قبل تک یہاں خاک اڑا کرتی تھی۔ وائس آف امریکہ اردو سروس واشنگٹن میں سینئر براڈ کاسٹر قمر عباس جعفری چند سال قبل دہلی آئے تھے اور انھوں نے غالب اکیڈمی اور مزار غالب کا دیدار اور زیارت کی تھی۔ یہاں سے جانے کے بعد انھوں نے

جو سفرنامہ لکھا اس میں غالب اکیڈمی اور مزار غالب کا بھی ذکر کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہ مختصر داستان انھی کی زبانی سنی جائے۔ وہ لکھتے ہیں: ''غالب میوزیم، ان سے منسوب لائبریری اور اس کے قریب ہی واقع وہ احاطہ جہاں ان کی قبر ہے، ایک گنجان آباد علاقے میں ہے۔ یہ میوزیم عمارت کی تیسری منزل پر ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ بھی اس سے وابستہ ہے اور ادبیات کے طالب علم برابر غالب لائبریری، میوزیم اور اس سے ملحقہ اداروں میں آتے جاتے ہیں۔ ایک خاصا بڑا آڈیٹوریم بھی نچلی منزل پر ہے۔ میوزیم غالب کی تحریر کے نسخوں سے لے کر اس دور کے سکوں تک اور اس زمانے کے لباس اور غالب کی کھانے پینے کی چیزوں کے نمونوں سے لے کر اس ڈومنی کی ایک بڑی مورتی سمیت تقریباً ہر چیز موجود ہے جو غالب سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ مورتی جسے بھڑک دار لباس پہنایا گیا ہے ایک بڑے سے شوکیس میں رکھی گئی ہے۔ میوزیم اور لائبریری وغیرہ دیکھنے کے بعد سہیل انجم نے دفتر میں جا کر اس چابی کے لیے دریافت کیا جو اس احاطے میں لگے تالے کی تھی جہاں غالب کا مزار ہے۔ دفتر کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد تو سہیل انجم کے دوست تھے مگر موجود نہیں تھے۔ لیکن جو خاتون موجود تھیں وہ بھی انجم صاحب کو جانتی تھیں۔ اس لیے چابی مل گئی اور ہمارے دوست بڑی مشکل سے زنگ آلود تالا اور پرانا سلاخوں دار دروازہ کھول سکے۔ اس کے بعد ہم لوگ احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک خستہ حال کمرہ تھا جس کے اندر غالب کی خستہ سی قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر پر فاتحہ پڑھ کر جب نکل رہے تھے تو احساس ہو رہا تھا کہ غالب جب زندہ تھے تب بھی ان کو وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ واقعی حقدار تھے اور مرنے کے بعد بھی وہی بدحالی مسلط ہے۔ معمولی معمولی بادشاہوں کے مقبرے کیسے عظیم الشان بنے ہوئے ہیں اور ایک وہ تاجدار سخن، بادشاہ غزل جس کی شاعری الہام کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جس کی عظمت اور شاعری کی ایک دنیا معترف ہے اور جس کی عظمت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی ہے اس کا مقبرہ بھی اس کے شایان شان نہ بن سکا۔ کیسی بے حسی ہے، کیسی علم ناشناسی ہے، کیا کمزوری احساس ہے، صد حیف''۔

یہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہے۔ دہلی گیٹ پر واقع مولانا آزاد میڈیکل کالج کے عقب میں اور ماتا سندری لین پر ماتا سندری کالج کے بالمقابل اسے قائم کیا گیا ہے۔ 1969 میں غالب صدی تقریبات کے موقع پر اس کا بھی جنم ہوا تھا۔ اس وقت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی سرپرستی اور فخر الدین علی احمد کی سکریٹری شپ میں ''یادگار غالب کمیٹی'' قائم کی گئی تھی۔ اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بھی اس میں دلچسپی لی تھی اور اس کے لیے ایک اعشاریہ ایک نو ایکڑ کا ایک قطعہ آراضی الاٹ کیا تھا۔ اس وقت ذاکر حسین نے یہاں ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ 16 فروری 1969 کو صد سالہ عالمی جشن غالب کی تقریبات کا آغاز ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین ہی نے کیا تھا۔ اس کے بعد 1971 میں ''یادگار غالب کمیٹی'' کو ایک مستقل ادارے ''غالب انسٹی ٹیوٹ'' میں بدل دیا گیا۔ یہاں ایک بڑا آڈیٹوریم ہے جس کا نام ''ایوان غالب'' ہے۔ اس کے علاوہ ایک آفس بلاک، فخر الدین علی احمد کے نام پر ایک لائبریری، ایک میوزیم، ایک سمینار ہال اور ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔

یہاں تقریباً پورے سال غالب کے نام پر متعدد سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ ہر سال دسمبر میں ایک بین الاقوامی غالب سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ایک بین الاقوامی ریسرچ اسکالر سمینار کیا جاتا ہے۔ غالب کے ہمعصر جیسے کہ بہادر شاہ ظفر، ذوق اور مومن وغیرہ پر سمیناروں کا اہتمام ہوتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ہر سال شاعری، نثر، تنقید اور ڈرامہ کے شعبوں میں خدمات انجام دینے والوں کو غالب ایوارڈ تفویض کیے جاتے ہیں۔ سال میں ایک بار فخر الدین میموریل لیکچر منعقد ہوتا ہے۔ ہر ماہ شام شہریاراں کے عنوان سے ایک ادبی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ ''ہم سب ڈرامہ گروپ'' کی جانب سے غالب پر ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً غالب کی غزلوں پر موسیقی ریز پروگرام بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشاعرے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ہر چھ ماہ پر ایک تحقیقی جریدہ ''غالب نامہ'' شائع کیا جاتا ہے۔ یہاں سے غالب اور ان کے ہمعصروں پر ریسرچ پیپر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک غالب میوزیم ہے جو کہ مذکورہ دونوں میوزیموں کے مقابلے میں کہیں خوبصورت ہے۔ دو مقامات پر غالب اور ان کے دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ گلی قاسم جان کی حویلی میں رہائش اختیار کرنے سے قبل وہ جن علاقوں میں رہائش پذیر رہے وہاں کے ان کے مکانوں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ یہاں ایک شوکیس میں دیوان غالب کے خوش خط نسخے کا وہ ابتدائی حصہ بھی موجود ہے جو انھوں نے نواب سید یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کو بھیجا تھا۔ یہاں بھی ان کے چغے سجے ہوئے ہیں۔ ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کا بہت شاندار مجسمہ زرق برق لباس میں موجود ہے۔ یہاں بھی ڈومنی کا مجسمہ دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ان اشیا کے علاوہ غالب کے زمانے میں استعمال ہونے والی چیزوں کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ان پر جاری ہونے والے ڈاک ٹکٹ کے نمونے بھی ہیں۔ یہاں ایوان غالب کے سایے میں غالب کا ایک بہت خوبصورت مجسمہ نصب کیا گیا ہے جو آنے والوں کی توجہ اپنی جانب بے ساختہ مبذول کرتا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ڈاکٹر سہیل انور نے بتایا کہ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ دہلی جو کہ غالب کا شہر ہے ان کے نام پر کوئی سڑک ہی نہیں ہے۔ جبکہ الہ آباد میں ان کے نام پر ایک سڑک موجود ہے۔ گیا میں مرزا غالب کالج ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے افراد اپنے پتے میں ماتا سندری لین کو غالب مارگ لکھتے ہیں۔ لیکن حکومت نے اسے منظوری نہیں دی ہے۔ البتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے لان میں غالب کا ایک مجسمہ نصب ہے۔

غالب کی یادوں کو زندہ رکھنے اور عام لوگوں تک ان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے میدان میں ایک اہم نام ملک کی معروف رقاصہ اوما شرما کا بھی ہے۔ وہ 1973 سے غالب پر مختلف انداز میں سال بہ سال پروگرام کرتی ہیں جس میں سب سے اہم یہ ہے کہ وہ غالب کی غزلوں پر رقص پیش کرتی ہیں اور اپنے انداز، حرکات و سکنات اور اشارۂ چشم و ابرو سے اشعار کے مفہوم کو رقص کے ذریعے نمایاں کرتی ہیں۔ اوما شرما نے ''غالب میموریل موومنٹ'' کے نام سے ایک گروپ بنا رکھا ہے۔ انھوں نے بات چیت میں بتایا کہ وہ غالب کے فن کو رقص کی مدد سے ملک و بیرون ملک میں متعارف کرانا چاہتی ہیں۔ وہ غالب کے یوم پیدائش پر چاندنی چوک میں واقع ٹاؤن ہال سے غالب کی حویلی تک کینڈل مارچ بھی نکالتی ہیں جس میں ملکی و غیر ملکی مداحان غالب شرکت کرتے ہیں۔

■

Mr. Suhail Anjum
370/6A Zakir Nagra
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025

عبدالرازق

گوشۂ غالب

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی تدوین میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا طریقِ کار

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (1904-1981) جدید تحقیق و تدوین کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مولانا 1933 میں رام پور کی رضا لائبریری کے ناظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے وہاں موجود نادر علمی خزانے سے بھرپور استفادہ کیا اور مختلف تاریخی و ادبی حیثیت کی حامل کتابوں کو تصحیح و تحشیہ اور اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ منظر عام پر لائے۔ مولانا اگرچہ شاعر بھی تھے اور اپنے ماموں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت بھی کرتے تھے لیکن انھوں نے اس کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا یہاں تک کہ اپنے کلام کو شائع کرانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ مولانا کی اصل پہچان اور ان کی اصل دلچسپی اس بات میں تھی کہ کسی نادر علمی خزانے کی تحقیق کی جائے اور اس کو خاص و عام کے استفادے کے لیے منظرِ عام پر لایا جائے۔ انھوں نے غالب سے متعلق بہت سے تحقیقی کام کیے۔ جیسے 'مکاتیب غالب' (1937)، 'فرہنگ غالب' (1947)، 'انتخاب غالب' اور 'دیوانِ غالب نسخۂ عرشی' وغیرہ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار ماہرین غالبیات میں بھی کیا جاتا ہے۔ غالبیات کے علاوہ انھوں نے دوسری کتابوں کی بھی تدوین کی ہے۔ ان میں 'دستور الفصاحت' مصنفہ احد علی خاں یکتا لکھنوی، 'تاریخ اکبری' مصنفہ عرفان سمرقندی قابل ذکر ہیں۔

غالبیات کے سلسلے میں مولانا کی جن چار تصانیف کا ذکر اوپر کیا گیا اس اعتراف کے ساتھ کہ وہ تمام ہی تصانیف اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں کیونکہ ان سب میں مولانا نے اپنی علمی کاوشوں اور اصول تدوین کا مکمل نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ان کی آخر الذکر تصنیف 'دیوانِ غالب نسخۂ عرشی' ان کا وہ کارنامہ ہے جو اکیلا ہی تمام تصانیف کی ہمسری کرتا ہے، جس کو انجمن ترقی اردو (ہند) نے 1958 میں پہلی بار اور 1982 میں دوسری بار شائع کیا۔ دیوانِ غالب کا یہ اندازِ ترتیب کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ کہا جائے کہ یہ اندازِ ترتیب کسی بھی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ غالب اردو کے خوش قسمت شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور نثر پر جتنا تحقیقی کام ہوا ہے اتنا کسی اور کے اوپر نہیں ہوا۔ ان کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ ان کے کلام کی تدوین مولانا عرشی نے کی ہے۔

مولانا کے مرتب کردہ دیوان کی سب سے بڑی اور پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انھوں نے اس وقت تک دستیاب غالب کے متداول اور غیر متداول تمام کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ مولانا نے اس نسخے میں غالب کے کلام کو تین عنوانات کے تحت جمع کیا ہے:

(1) گنجینۂ معنی

(2) نوائے سروش

(3) یادگارِ نالہ

ان میں سے اول الذکر حصے میں غالب کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے جس کو غالب نے دیوان مرتب کرتے وقت نہیں چھپوایا تھا۔ ثانی الذکر میں غالب کا وہ کلام ہے جو متداول ہے اور جس کو غالب نے اپنی حیات میں ہی چھپوا کر تقسیم کیا تھا اور آخر الذکر حصے میں وہ کلام ہے جو مختلف اخبارات، رسائل اور خطوط میں شائع ہوا لیکن وہ دیوانِ کلام متداول کا حصہ نہ تھا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نسخے میں مولانا نے کلام کو جمع کرنے میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے جیسا کہ ماقبل میں مذکور تفصیل سے معلوم ہوتا ہے اور یہ اس نوعیت کا پہلا، منفرد اور کامیاب تجربہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اس طرح کی کوششیں ہوئی تھیں لیکن وہ نامکمل رہی تھیں۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے جملہ کلام کو

تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ان کے تیار کیے ہوئے مواد کا صرف نصف حصہ ہی منصۂ شہود پر آسکا۔

تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالب کے کلام کو غالب کی منشا کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ تدوین کا پہلا اصول بھی ہے۔ مولانا نے خود اپنے مقدمے میں صراحت کی ہے کہ املا اور رسم الخط کے معاملے میں موجودہ اصول اور غالب کے اختیار کردہ اصول دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ اصول مشہور ہے کہ وہ 'خورشید' کو بحذف الواو یعنی 'خُرشید' لکھتے تھے چنانچہ مولانا نے بھی اس نسخے میں 'خُرشید' ہی لکھا ہے۔ مثلاً نسخۂ عرشی حصۂ قصائد میں صفحہ نمبر 7 کے پہلے شعر میں لفظ 'خورشید' آیا ہے اور اُس کو مولانا نے 'خُرشید' لکھا ہے۔ شعر اس طرح ہے:

درست اس سلسلۂ ناز کے، جوں سنبل وگل
ابرِ میخانہ کریں ساغرِ خُرشید شکار 1

اسی طرح غالب فارسی اور اردو الفاظ میں 'ذ' لکھنا غلط قرار دیتے تھے اور اس کی جگہ 'ز' لکھتے تھے مثلاً زرا، گزر، رہگزر، گزارش وغیرہ۔ چنانچہ نسخۂ عرشی میں ان جیسے الفاظ غالب کی منشا کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب 'ہائے مختفی' (ہ) پر ختم ہونے والے الفاظ کو محرف صورت میں 'ے' کے ساتھ لکھتے تھے مثلاً 'رتبہ' کو 'رتبے'، 'کوچہ' کو 'کوچے' اور 'زمانہ' کو 'زمانے' وغیرہ۔ یہ تمام وہ مثالیں ہیں جن کے اس طرح کے املا پر غالب اصرار کرتے تھے اور مولانا نے ان کا ہی خیال رکھا ہے، لیکن بعض مقامات پر موجودہ دور کے املا کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے جیسے پچھتاتا اور اس جیسے الفاظ میں غالب 'ہائے مخلوط' (ھ) کو حذف کر کے صرف 'چ' لکھتے تھے جیسے 'پچتاتا'، 'پچتایا' اور 'پچتاوا' وغیرہ یا اس کے برعکس 'تڑپنا'، 'تڑپتا' اور 'تڑپا' میں غالب 'پ' کے ساتھ ہائے مخلوط کا اضافہ کرتے تھے اور اس طرح لکھتے 'تڑپھنا'، 'تڑپھتا' اور 'تڑپھا' وغیرہ۔ مولانا نے ان الفاظ کو لکھنے میں رائج الوقت رسم الخط کا لحاظ کرتے ہوئے 'پچھتانا' اور 'تڑپنا' لکھا ہے۔

اس نسخے کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اگر غالب کے کسی شعر یا غزل کی تشریح خود غالب کے الفاظ میں دستیاب ہوگئی ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک عنوان 'شرحِ غالب' کے نام سے قائم کیا ہے یعنی شرح کلام غالب بہ الفاظِ غالب۔ تشریحِ شعر کے علاوہ اگر کسی شعر کے سلسلے میں اس کا سبب تحریر بھی معلوم ہوگیا ہے تو انھوں نے اس کو بھی پیش کر دیا ہے دونوں جزئیات کی ایک ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔ غالب کے متداول دیوان اور اس نسخے کے حصۂ دوم 'نوائے سروش' کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا؟
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا 2

مولانا عرشی نے 'عودِ ہندی' کے ایک خط کے حوالے سے اس شعر کی تشریح اس طرح نقل کی ہے:

''ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دل کو جلانا، یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا''3

دوسرے جزو کی مثال یہ ہے کہ ایک شعر ہے جس کے کہنے کا سبب خود غالب نے میر مہدی مجروح کو لکھا ہے اور وہ خط 'اردوے معلی' ص 183، 'عودِ ہندی' ص 93، 'خطوطِ غالب' ج 1، ص 255 میں شامل ہے۔ مولانا نے اس خط کو بھی اس شعر کے حوالے سے نقل کر دیا ہے۔ شعر اس طرح ہے:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا؟
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

میرزا غالب لکھتے ہیں:

''نواب گورنر جنرل بہادر 15 دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں؟ رہے دربار عام والے، مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود ومطرود ومحروم ومغموم۔ بیت:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام وسبو پھر ہم کو کیا؟
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے 4

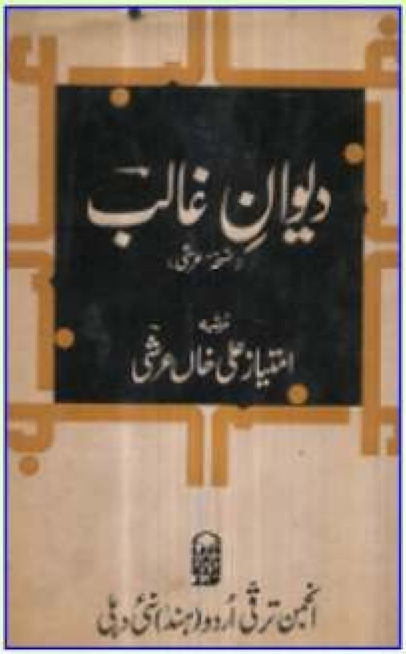

اس طرح کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں جن میں غالب نے خود اپنے اشعار کا مفہوم یا وجہِ تحریر کسی کے نام خط میں لکھی ہے۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا عرشی نے ان کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس شعر کی تاریخی اور زمانی ترتیب کا بھی اندازہ لگایا اور اس کو بروئے کار لائے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ مولانا نے تاریخی ترتیب کو قائم رکھنے کے لیے اور ان کا پتا لگانے کے لیے ان تضمینات کے بارے میں تلاش وجستجو کی جو غالب کے کلام پر کی گئیں اور ان سے اس سلسلے میں مدد حاصل کی مثلاً کسی تضمین کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ غالب کی فلاں غزل پر ہے اور اس کا زمانۂ تحریر یہ ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جس غزل پر وہ تضمین ہوئی ہے یقیناً وہ غزل اس تضمین سے قبل کہی گئی ہوگی۔ لہٰذا تلاشِ تضمین بر کلامِ غالب بھی زیرِ بحث کتاب کا اہم خاصہ ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی غزل یا شعر میں بیان کردہ مضمون یا موضوع کسی دوسری غزل یا شعر میں بھی بیان کیا گیا ہو خواہ وہ فارسی کلام میں ہو یا اردو میں، حاشیے میں 'نیز ملاحظہ ہو' کی سُرخی کے تحت وہ دوسرا شعر بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال درج ذیل ہے:

'نوائے سروش' صفحہ نمبر 231 پر دوسرا شعر ہے:

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

"
مولانا نے تاریخی ترتیب کو قائم رکھنے کے لیے اور ان کا پتا لگانے کے لیے ان تضمینات کے بارے میں تلاش وجستجو کی جو غالب کے کلام پر کی گئیں اور ان سے اس سلسلے میں مدد حاصل کی مثلاً کسی تضمین کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ غالب کی فلاں غزل پرہے اور اس کا زمانۂ تحریر یہ ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جس غزل پر وہ تضمین ہوئی ہے یقیناً وہ غزل اس تضمین سے قبل کہی گئی ہوگی۔ لہٰذا تلاش تضمین بر کلام غالب بھی زیر بحث کتاب کا اہم خاصہ ہے۔
"

حاشیے میں اسی مضمون کا دوسرا شعر اس طرح نقل کیا گیا ہے:

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا، خلد میں گر، یاد آیا [5]

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں مناسبت اور ان کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ ان میں کوچۂ یار کو جنت سے برتر قرار دینے کی کوشش کی ہے نیز اس بات کا بھی بیان ہے کہ آخرت کے تمام عیش وعشرت کے باوجود محبوب کی یاد دل سے نہیں جاتی۔

عرشی صاحب نے متن کو نقل کرنے میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر غزل پر نمبر ڈالے ہیں پھر اس نمبر کے نیچے اس نسخے کی/ان نسخوں کی علامت بنائی ہے جن سے وہ غزل نقل کی گئی ہے۔ صفحے میں ہر پانچویں شعر پر نمبر ڈالا ہے۔ حاشیہ لکھنے کے لیے انھوں نے 'الف' اور 'ب' کی علامات قائم کی ہیں۔ 'الف' سے مراد مصرعۂ اول ہے اور 'ب' سے مراد مصرعۂ ثانی ہے۔ چنانچہ اگر مصرعۂ اولی میں کوئی اختلاف یا وضاحت طلب بات ہو تو اس کو 'الف' کے ذیل میں لکھتے ہیں اور اگر مصرعۂ ثانی میں ہے تو اس کو 'ب' کے تحت لکھا ہے۔ جیسے 'گنجینۂ معنی' میں صفحہ نمبر 89 پر چوتھا شعر ہے:

شوخیِ اظہار غیر از وحشتِ مجنوں نہیں
لیلیِ معنی ،اسد، محمل نشینِ راز ہے [6]

حاشیے میں شعر نمبر 4 ڈالا ہے کیونکہ یہ اس صفحے کا چوتھا شعر ہے پھر چونکہ حاشیہ مصرعۂ اول اور مصرعۂ ثانی دونوں پر ہے اس لیے پہلے مصرعۂ اول کا اختلاف بیان کرنے کے لیے 'الف' کی علامت بنائی ہے۔ اس کے بعد نسخوں کا اختلاف نقل کیا ہے کہ نسخۂ 'ق' میں عبارت اس طرح ہے 'کو جز وحشت مجنوں اسد'۔ اسی طرح مصرعۂ ثانی کے اختلاف کو بیان کرنے کے لیے 'ب' کی علامت بنائی ہے۔ اس کے بعد نسخوں کا اختلاف نقل کیا ہے کہ نسخۂ 'ق' اور 'ح' میں 'بسکہ لیلائے سخن' لکھا ہے۔

مقدمے میں موجود صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ق' سے نسخۂ بھوپال اور 'ح' سے نسخۂ حمیدیہ اول مراد ہے۔ گویا عرشی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نسخۂ بھوپال میں شعر کی صورت اس طرح سے ہے:

شوخیِ اظہار کو جز وحشتِ مجنوں اسد
بسکہ لیلائے سخن محمل نشینِ راز ہے

اور مصرعۂ ثانی کا اختلاف نسخۂ بھوپال کے ساتھ ساتھ نسخۂ حمیدیہ اول میں بھی موجود ہے۔

نسخۂ عرشی کے آخر میں عرشی صاحب نے 'فہرست اشعار' دی ہے جس کے ذریعے سے غالب کی کوئی بھی غزل جو اس نسخے میں موجود ہو حروف تہجی کی ترتیب سے دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً اگر غزل یا شعر کی ردیف 'الف' پر ختم ہورہی ہو تو 'الف' کی ردیف میں دیکھیں گے۔ اور اگر دو غزلوں کی ردیف مماثل ہو تو ردیف سے پہلے والے لفظ کو دیکھیں گے کہ کیا ہے اور اس طرح غزل کی تلاش کریں گے اس میں صفحہ نمبر اور شعر نمبر کی نشان دہی کردی گئی ہے کہ یہ غزل کس صفحے پر اور کتنے نمبر شعر سے شروع ہورہی ہے۔

> ”
> نسخۂ عرشی کی اشاعت ثانی میں درج بالا تین حصوں 'گنجینۂ معنی'، 'نوائے سروش' اور 'یادگار نالہ' کے علاوہ ایک چوتھا حصہ 'بادآورد' کے نام سے شامل ہے۔ اس حصے میں غالب کا وہ کلام ہے جو غالب صدی تقریبات کے موقع پر 1969 میں دستیاب ہوا تھا۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اس حصے سے قبل اپنی تمہیدی تحریر میں لکھا ہے کہ اس حصے کی دستیابی کے وقت نسخہ عرشی اشاعت ثانی کے لیے پریس میں جاچکا تھا اور اس کا اکثر حصہ چھپ بھی چکا تھا اس لیے اس حصے کے کلام کو اصل متن میں اس کی ترتیب سے شامل کرنے کی بجائے علاحدہ سے شامل کردیا گیا ہے۔ عرشی زادہ کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حصہ مولانا عرشی کے صاحب زادے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے شامل کیا ہے اور اس حصے پر مولانا نے کوئی نظر نہیں ڈالی ہے۔
> “

'فہرست اشعار' کے بعد تین اشاریے ہیں۔ پہلے اشاریے میں اشخاص، اقوام اور فرقوں کے متعلق وضاحتیں ہیں۔ دوسرے اشاریے میں مقامات کا ذکر ہے اور تیسرے اشاریے میں کتب ورسائل کا ذکر ہے۔

اخیر میں اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ عرشی کی اشاعت ثانی میں درج بالا تین حصوں 'گنجینۂ معنی'، 'نوائے سروش' اور 'یادگار نالہ' کے علاوہ ایک چوتھا حصہ 'بادآورد' کے نام سے شامل ہے۔ اس حصے میں غالب کا وہ کلام ہے جو غالب صدی تقریبات کے موقع پر 1969 میں دستیاب ہوا تھا۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اس حصے سے قبل اپنی تمہیدی تحریر میں لکھا ہے کہ اس حصے کی دستیابی کے وقت نسخۂ عرشی اشاعت ثانی کے لیے پریس میں جاچکا تھا اور اس کا اکثر حصہ چھپ بھی چکا تھا اس لیے اس حصے کے کلام کو اصل متن میں اس کی ترتیب سے شامل کرنے کی بجائے علاحدہ سے شامل کردیا گیا ہے۔ عرشی زادہ کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حصہ مولانا عرشی کے صاحب زادے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے شامل کیا ہے اور اس حصے پر مولانا نے کوئی نظر نہیں ڈالی ہے۔ مقدمے میں اس نسخے کا تعارف بھی عرشی زادہ نے ہی پیش کیا ہے اور اس بات کی وضاحت نہ ہونے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید اس نسخے کا تعارف بھی مولانا عرشی نے ہی پیش کیا ہے اور یہ اشاعت مولانا کی نظر سے گذری ہے حالانکہ یہ امر خلاف واقعہ ہے کیونکہ جس وقت یہ حصہ ترتیب دیا جارہا تھا اس وقت مولانا بستر علالت پر تھے اور اس کو دیکھ نہیں سکے تھے۔

خلاصہ یہ کہ نسخۂ عرشی اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر دیوانِ غالب کی دیگر اشاعتوں کے بالمقابل امتیازی حیثیت کا حامل ہے جو کہ ادب کے قارئین کے لیے بالعموم اور غالبیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے بالخصوص ایک قابل اعتماد ماخذ ہے۔ یہ نسخہ فن تدوین کا ایک مکمل نمونہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس کی دو اشاعتوں کے بعد تیسری اشاعت نہیں ہوسکی جس کی وجہ سے یہ شاہ کار گم گشتۂ تاریخ ہوتا جارہا ہے۔ مارکیٹ میں تو اس کے نسخے دستیاب ہیں نہیں اور جو نسخے لائبریریوں میں موجود ہیں وہ بھی خستہ اور بوسیدہ ہیں۔

حواشی:

1. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ قصائد، ص 7، اشاعت دوم 1982
2. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ نوائے سروش، ص 142، اشاعت اول 1958
3. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ شرح غالب، ص 317، اشاعت اول 1958
4. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ شرح غالب، ص 319، اشاعت اول 1958
5. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ نوائے سروش، ص 231، اشاعت دوم 1982
6. دیوان غالب نسخۂ عرشی، حصہ گنجینۂ معنی، ص 89، اشاعت دوم 1982

■

Abdur Razique
Research Scholar, Dept of Urdu
Muslim University
Aligarh - 202001

آفاق عالم صدیقی

خود کفیل شاعر

حمید الماس

حمید الماس اردو کے ان خود کفیل شعرا میں سے ایک ہیں جو بجز اپنی تخلیقی طراوت اور سرشاری کے کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ اپنے تخلیقی وفور کو کسی آئیڈیالوجی کے تابع رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے شعرا پر ادبی فضا کے سرد و گرم کا کچھ خاص اثر نہیں پڑتا ہے، اور جب پوری ادبی فضا پر کسی غاصب کا قبضہ ہو جاتا ہے تو صحرائے ادب کی زرخیزی کے لیے اسی طرح کے شعرا کھاد بنتے ہیں۔

حمید الماس کی نظموں کو توجہ سے پڑھیں تو احساس ہوگا کہ ان کی نظموں کا اجتماعی آہنگ نہ تو ان کے ہمعصروں سے ملتا ہے اور نہ ان کے نظمیہ آہنگ کے باطن میں ان کے کسی پیش رو شاعر کا لحن گونجتا ہے۔ گویا حمید الماس کے پاس شاعری کے نام پر جو کچھ بھی ہے وہ ان کا اپنا ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے کے دوران ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ بظاہر ایک سیدھے سادے آدمی کی تصویر نظر آتی ہے۔ مگر اس تصویر کے باطن میں ہر پل سلگتا، اپنی ہی موج میں ڈوبتا ابھرتا، سب کے ساتھ چلتا پھرتا ایک ایسے تنہا اور تیکھے فنکار کا عکس نمایاں ہوتا ہے جو ہر چیز کو، ہر رشتے کو، اور ہر واقعے کو عام لوگوں سے مختلف انداز میں دیکھتا ہے، نتیجتاً عام لوگوں سے زیادہ دکھ جھیلتا ہے۔ دکھ کا یہی احساس، چیزوں کو دیکھنے کا یہی ڈھب ان کی نظموں کو دبازت بخشتا ہے۔

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ حمید الماس کے یہاں کلاسیکیت اور روایت کے انجذاب کی مثالیں نہیں ملتی ہیں یا بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے باوجود کلاسیکیت اور روایت کے منبع سے روحانی رشتے کی خوشبو ان کی تخلیقیت خیزی کے نافے سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی جڑوں، اپنی روایات اور اپنی مٹی سے کتنے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔

اردو شاعری میں شروع ہی سے داخلیت اور خارجیت کے موضوع پر گفتگو ہوتی رہی ہے مگر ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ خارج کے بدلنے سے آدمی کا باطن نہیں بدلتا ہے۔ مگر باطن کے بدلنے سے خارج یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ خود کفیل شاعر وہ ہوتا ہے جو خارج سے زیادہ اپنے باطن پر بھروسہ کرتا ہے۔ باہر سے زیادہ اپنے اندر جیتا ہے۔ خود کو دنیا کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور خارجی رشتوں، رویوں، المیوں اور صوت و صدا پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے باطن کی آواز پر کان دھرتا ہے، بھلے سے اس کے لیے اسے کتنی ہی اذیت کیوں نہ اٹھانی پڑتی ہو، دراصل اپنے آپ کو پہچاننے کا یہی عمل کسی بھی فنکار کو منفرد بناتا ہے اور اس کی آواز میں تاثیر پیدا کرتا ہے جس کو سنتے ہی شعلہ سا لپک جائے ہے، کا احساس فزوں تر ہو جاتا ہے اور اس غیرت ناہید کے احترام میں سرخم ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ شعلہ سا لپک جانے کا احساس صرف حسن صوت اور صدائے دل افروز تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ معنی یابی کی انتہاؤں اور فطرت انسانی کی منتہاؤں تک پھیل جاتا ہے اور شاعری ساحری کا اعزاز محسوس ہونے لگتی ہے۔ حمید الماس کی چند نظموں سے مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

میں نے آخر کرلیا ہے فیصلہ
بند رکھوں سارے دروازے دریچے
گھر کے اندر ہی رہے میری مکمل کائنات
پھر نہ چھیڑے ناخن سود و زیاں
لذت خنداں رہے لب پہ دوام

(امروز فردا)

لذت خنداں کو دوام بخشنے کے لیے دروازوں اور دریچوں کو بند کرنے کا حوصلہ بجز خود آگاہ و خود کفیل فنکار کے کوئی نہیں کرسکتا۔ اتنی بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ جس کا باطن منزہ اور مطہر ہوتا ہے، اس کے اندر رب بستا ہے اور جس کے اندر رب بس جاتا ہے اسے اپنے مکان سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے رو سو نے بہت پہلے کہا تھا کہ ہمیں زندگی گذارنے کے لیے دوسرے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ دوسرے لوگوں کا مطلب ہی جہنم ہے۔ اس تناظر میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حمید الماس اور اس جیسے فنکاروں کو نہ جانے کتنے جہنموں سے روز گذرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میر باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو فراموش نہیں کرتے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے کہ حمید الماس ایک خود کفیل فنکار ہیں۔ خود کفیل فنکار ہمیشہ اپنے اندر جیتا ہے۔ حمید الماس کی چند رمزی اور روایتی نوعیت کی نظموں کے حصے دیکھیے:

بصارت کی مسافت ہوگئی محدود
یہ منظر ہے آنکھوں میں کہ
ننھے سے شکم کے بل
زمیں کے سانولے سینے پہ
پہروں رینگتا ہے
مسکراتا ہے مرا بچہ
(حد نظر)

میں نے اس نظم کو اور اس جیسی چند اور نظموں کو رسمی اور روایتی نوعیت کی نظموں کے زمرے میں اس لیے رکھا ہے کہ اکثر فنکار اپنے بچوں کی پیدائش اور اپنی بیوی کی رفاقت سے متعلق اس طرح کی نظمیں لکھا ہی کرتے ہیں۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ حمید الماس کی یہ رسمی نظم بھی رسمی نہیں ہے اور نہ اس نظم کا مقصود ہی وہ ہے جو بظاہر نظر آتا ہے۔ اس نظم کے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے شاعر اپنے معصوم بیٹے کے ہمکنے کا منظر اپنی آنکھوں کی اسکرین پر دیکھ رہا ہے۔ مگر 'بصارت کی مسافت ہوگئی محدود' والا مصرعہ اس نظم کے سیاق کو بالکل تبدیل کر دیتا ہے۔ یعنی شاعر بالواسطہ طور پر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جس انسان اور فنکار کی بصارت لامحدود ہونی چاہیے تھی جس کی محبت سے لبریز اور اپنائیت سے شرابور بصارت کے دائرے میں بنی نوع انسان کے تمام بچوں اور ان کے مستقبل کو ہونا چاہیے تھا، اس فنکار کی نظر اتنی محدود ہو چکی ہے کہ وہ اپنے بچے یعنی اپنے مفاد سے آگے نہیں دیکھ رہا ہے۔ نتیجتاً اس کا بچہ زمین کی آغوش میں ہمکنے کی بجائے اس کے سینے پر رینگ رہا ہے۔ اور صورت حال کی ہولناکی تو دیکھیے اسے زمین کا سانولا پن بھی نہیں چونکاتا ہے۔ اسے اس حال میں بھی یہ خیال نہیں آتا ہے کہ پہلے زمین کو جھلنے سے بچانے کی کوشش کی جائے، اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اس دھرتی پر کوئی بچہ تادیر نہیں مسکرا سکے گا۔

حمید الماس کی ایک اور نظم ہے 'ٹی بی' آیئے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

کاش تجھ کو ہو خبر
یہ لرزتی ہوئی بجتی ہوئی زنجیر ازل
نہیں پگھلتی نہ گل سکتی ہے
درد کی آگ کی ان لمبی زبانوں سے کبھی
کاش تجھ کو ہو خبر
میں ترا جسم تری روح بھی ہوں
مشترک روگ ہے تیرا میرا

یہ نظم بظاہر میاں بیوی کی رفاقت اور محبت کے پرسوز نغموں سے لبریز معلوم ہوتی ہے۔ تو کیا یہ نظم بس اتنی ہی کچھ ہے یا اس میں اور بھی کچھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی شریک حیات سے محبت کا اظہار کرنا اور اس کے دکھ میں خود کو گھلتا ہوا محسوس کرنا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ عام انسانی رویہ ہے مگر اس نظم کو توجہ سے پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر کا غم تو اس دکھیاری سے بھی سوا ہے جو درد سے تڑپ رہی ہے۔ کیونکہ شاعر صرف اس کا جسم ہی نہیں اس کی روح بھی

ہے۔ اس نظم میں عورت اور مرد کے ازلی رشتے کو اس کی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ اس خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ حیرت دامنگیر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم، حوا کا باپ بھی ہے، ماں بھی ہے۔ اور شوہر بھی ہے اس لیے جب حوا کو دکھ ہوتا ہے تو اس سے تین گنا زیادہ دکھ آدم کو ہوتا ہے۔ مگر اس بات کا احساس بہت کم عورتوں کو ہوتا ہے۔ حمید الماس کی ایک اور نظم ہے..... اور بھی غم ہیں زمانے میں...... نظم دیکھیے:

ویراں آنکھیں
لرزاں پیکر
دونوں بجھ گئے آخر کار
مرگ پدر کو مرگ جہاں کہتے ہیں لیکن
میری نورانی آنکھوں کی پلکوں تک بھی
اشک نہ آئے
دیکھو
دل کے اندر
میرا بھی اک بیٹا ہے جو
چپکے چپکے روتا ہے

یہاں بھی بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پدر کی موت پر اشک شوئی کر رہا ہے۔ اس کی ذات میں اپنی پوری کائنات کو گم ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ مگر یہ پوری سچائی نہیں ہے اور نظم کا مواد اس کی تائید بھی نہیں کرتا ہے۔ باپ کی موت کا ماتم کرنا اور کہنا کہ ان کی موت سے ایک جہان مر گیا محض رسمی بیان ہے۔ اور اگر یہ سچ بھی ہے تو خود بیٹے میں باپ بننے کا امکان بھی تو روشن ہے۔ یعنی ایک بیٹے میں کئی بیٹے امکانی طور پر سانس لے رہے ہیں اور کئی نئے جہانوں کی بشارت دے رہے ہیں تو ایسے میں ایک گم کردہ جہان کے لیے خود کو ہلکان کرنا ٹھیک ہوگا یا امکانی جہانوں کی دریافت اور تعمیر کے لیے خود کو تیار کرنا مناسب ہوگا! صاف ستھرے انداز میں سمجھنا ہو تو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ بیٹے کی موت پر تو باپ اس طرح رو سکتا ہے کہ وہ اندھا ہو جائے۔ مگر باپ کی موت پر جسے مرگ جہان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہماری نورانی پلکوں پر کوئی قطرہ نہیں جھلملاتا ہے۔ کیونکہ باپ ہماری کائنات نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اولاد اس کی کائنات ضرور ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ حمید الماس کی عمومی نوعیت کی نظمیں تھیں، مگر ذرا غور تو فرمایئے کہ اگر ان کی عمومی نوعیت کی نظمیں بھی اتنی جہتیں اور طرفیں رکھتی ہیں تو خصوصی نوعیت کی نظموں کا کیا عالم ہوگا۔ یاد رہے کہ جب شاعر اپنے باطن میں سفر کرتا ہے اور اپنی ہی شرطوں پر خارجی مسائل پر توجہ کرتا ہے اور اس کی جڑوں تک پہنچتا ہے تو پھر اس کی گفتگو کا انداز یکسر بدل جاتا ہے۔ اس کی یہ گفتگو کسی بھی مصلح سے زیادہ محترم ہوتی ہے۔ کیوں کہ بھاشن باز لیڈروں اور رہنماؤں کے الفاظ ہمیشہ بے روح اور بے لباس ہوتے ہیں، اس لیے وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ مگر فنکاروں کی تحریر و تقریر میں اس کا دل دھڑکتا ہے۔

اس کے علامات و استعارات کے پیکر میں اس کی روح بستی ہے۔ اس کے حرف وصوت میں اس کا خلوص لہو بن کر دوڑتا ہے۔ اس لیے اس کے الفاظ فضا میں تحلیل نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ہوا کی سلوٹوں پر اس کے دستخط کی طرح ثبت ہو جاتے ہیں۔

حمید الماس ایک تجربہ پسند شاعر تھے اس لیے وہ اپنے تخلیقی اظہار کی نارسائی پر قابو پانے کے لیے نت نئی ترکیب سازی اور لفظوں کے اختراع سے بھی کام لیتے تھے، جس میں وہ بہر حال کامیاب رہتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ و تراکیب دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا ذہن کتنا رسا اور ان کا مزاج کتنا شاعرانہ تھا۔

ترشتے فرش کا سرد سینہ، سبز آرزو کی روشنائی، ماتم موسم رفتہ، وادی زہرہ، مظہر جلوۂ فردا، حسن امروز فروزاں کی شباہت سرد انگارے اگلتی دانش گاہیں، کاخ سطوت کی فصیلوں پہ لپکتے شعلے، پاؤں کی چاپ سے لپٹا ہوا قرنوں کا غبار، برہنہ شاخوں کی پشیمانی، زمین کے خشک سینے سے ابھرتا گرسنہ پتھر، دعائیں مانگتا بے خواب سناٹا، اجلی امیدوں کی راکھ، بے بصر پھولوں کی آلودہ رفاقت، رہگزاروں کی سرخ جبین، رفاقت کی روشنی، سایۂ سنگ گراں، وغیرہ

ان الفاظ و تراکیب پر غور کریں اور ان کے آہنگ پر توجہ کریں تو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب کے سب الفاظ و تراکیب تخلیقی تناؤ کی شدید ترین کیفیات کی زائیدہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی فنکار اپنے نجی تجربوں کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے جانے پہچانے الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ جانے پہچانے لفظوں کے معانی متعین ہوتے ہیں۔ جب کہ فنکار کا تجربہ بالکل نیا ہوتا ہے۔ اتنا نیا کہ وہ جانے پہچانے لفظوں کے آہنگ اور طے شدہ معنیاتی نظام کے سانچے میں نہیں ڈھل پاتا ہے۔ اس طرح اسے نت نئی ترکیب سازی اور نئے لفظوں کے وضع و اختراع سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ اور یہ بات طے ہے کہ نئے الفاظ اختراع کرنا یا نئی ترکیب بنانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس راہ میں اکثر قلمکار خون تھوک کر رہ جاتے ہیں اور دو چار منزل بھی طے نہیں کر پاتے ہیں اس لیے نئی لفظیات کا شاعر کسی بھی زبان میں بہت کم ہوتا ہے۔

حمید الماس بھی نئی لفظیات کے شاعر نہیں ہیں ہاں انھوں نے لفظ سازی کی کوششیں ضرور کی ہیں جو ان کی اختراعی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فنکار جو نت نئی تراکیب اور جملے بندی سے کام لیتا ہے تو اس میں اس کی شعوری کوشش کا اتنا عمل دخل نہیں ہوتا ہے جتنا اس کی اضطراری کیفیت کا ہوتا ہے۔ یہی

حمید الماس ایک تجربہ پسند شاعر تھے اس لیے وہ اپنے تخلیقی اظہار کی نارسائی پر قابو پانے کے لیے نت نئی ترکیب سازی اور لفظوں کے اختراع سے بھی کام لیتے تھے، جس میں وہ بہر حال کامیاب رہتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ و تراکیب دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا ذہن کتنا رسا اور ان کا مزاج کتنا شاعرانہ تھا۔

وجہ ہے کہ ان نئی تراکیب میں سے کچھ ترکیبیں یا ان اختراع شدہ لفظوں میں سے کوئی لفظ یا لفظوں کے درمیان تلاش کیے گئے نئے رشتے اور حرف و صوت میں بسے فنکار کے تخلیقی خلوص کی خوشبو بسا اوقات ہماری روح میں اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھول کر فنکار سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی فن اور فنکار کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ حمید الماس کے یہاں شعری ترکیب کے حامل الفاظ تلاش بسیار کے بعد ملتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو پوری کی پوری شعریت اور شاعرانہ ترکیب بندی کی جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک نظم دیکھیے:

ندا آئی
انبوہ شیدائیاں
نازنینان شہر تخیل
غزالان فکر و نظر
غمگساران دار و صلیب و رسن
دیرے عقیدت کی نایاب سوغات لے کر
در گنبد فن پہ سجدہ کناں ہیں
پئے دیدن منظر شاد کاماں
بڑی تمکنت سے اٹھا
اٹھ کے میں نے جو دیکھا
تو حد نظر تک فروکش
لہو کی لکیروں کا اک کارواں تھا
کبھی جو رگ و پے میں میرے رواں تھا

(نہ ستائش کی تمنا)

ظاہر ہے کہ مرکب الفاظ سے کام لینا یا مرکب الفاظ کو اپنی شاعری میں کھپانا، یا ترکیب سازی سے اپنی تخلیقی دنیا کے حسن میں اضافہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اور سچ کہوں تو آسان اور سادہ شاعر نظر آنے والے حمید الماس نے اپنی نظموں میں آسانیوں سے کام لیا بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کو ہلکے پھلکے انداز میں لینے والے لوگ ان کے فنکارانہ کمال کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ ان کی نظمیں 'سفر اندر سفر'، 'چراغ اور زندگی'، 'دیار غیر میں'، 'شکست' اور 'عدم سے عدم تک' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شعریت کا وفور اور موضوع کو برتنے کا شعور بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔

حمید الماس رسمی اعتبار سے ایک ہمہ جہت قلمکار تھے ورنہ فطرتاً وہ صرف ایک فنکار تھے۔ ان کی روحانی سرشاری کا راز تخلیقی تناؤ کی آبیاری میں مضمر تھا۔ وہ ایک سماجی انسان ضرور تھے۔ مگر وہ سماج میں پیوست نہیں تھے اور نہ سماجی سروکار ان کے لیے سامان عیش تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو صرف تخلیق کی گھنی چھاؤں میں ہی سکون ملتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تخلیقی تناؤ کی شدید ترین کیفیت میں بھی اخلاقی اقدار کو نظر انداز کرنے کا گناہ نہیں کر سکے نہیں تو ان کے یہاں بھی میراجی اور راشد کی بعض نظموں کی گونج ضرور سنائی دیتی اور جسمانی کثافت اور جنسی اکساہٹ کی رسمساہٹ نظر آتی کیوں کہ یہ وہی زمانہ تھا جب اردو نظمیہ شاعری کی فضا پر میراجی، راشد، اور اختر الایمان چھائے ہوئے تھے۔ اور ہر نظم گو شاعر کم و بیش انھیں کو اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔ ایسے ماحول میں نظمیں کہتے ہوئے اپنے آپ کو ان شعرا کے اثرات سے محفوظ رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے حمید الماس کو خود کفیل شاعر کہا ہے۔ آپ محمود ایاز صاحب کے یہاں اختر الایمان کے اثرات سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ نظم کے آج کے اہم شاعر خلیل مامون صاحب کے یہاں م۔ ن راشد کی دانشورانہ اور متفکرانہ فراست اور تخلیقی ابعاد کا پرتو تلاش کر سکتے ہیں۔ مگر حمید الماس کے یہاں اس طرح کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔

بعض لوگ حمید الماس کو خاموشی کا شاعر قرار دیتے ہیں تو کچھ لوگ انھیں نرم آہنگ سادہ شاعر کہتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب حمید الماس کی شاعری کی مختلف جہتیں اور کیفیتیں ہیں، ہاں خود آگہی کے شدید ترین احساس کو ان کی شاعری کا سرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے اظہار کے لیے انھوں نے کبھی خاموشی سے کام کا تو کبھی سادگی سے پیچیدگی کا تو کبھی نرم آہنگ سے گرم احساس کا اور کبھی ساعت نایاب سے دریا بہ اندر حباب کا کام لیا۔ اور بھیڑ میں نئی راہ نکال کر اپنا شعری کردار متعین کیا۔ جو بہر حال لائق تعریف ہے۔

■

Dr. Afaque Alam Siddiqui
Zubeda Degree College, Jai Nagar
Post Box No.: 6, Shikaripur
Shimoga - 577427 (Karnataka)

اوپندر ناتھ اشک کا تخلیقی سفر

شریف الدین

اوپندر ناتھ اشک بیک وقت شاعر، ڈرامہ نگار، مضمون نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، ناول نگار اور دانشور سب کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت کی رنگارنگی نے انھیں عہد حاضر میں ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اشک نے تخلیقی سفر کے ہر دور میں مزاج، رویہ اور رجحان کے مطابق زمانے کا ساتھ دیا ہے اور ہر حیثیت سے کامیاب رہے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ایک وسیع عرصے پر محیط ہے۔

اشک نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ مگر ان کا افسانوی سفر 1926 میں 'ودھوا کے جذبات' نامی افسانہ سے شروع ہوتا ہے۔ شخصی خاکے کی تکنیک میں لکھا ہوا یہ افسانہ جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اشک کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نورتن' 1931 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کے مطالعے سے پریم چند کی حقیقت نگاری اور سدرشن کی اصلاح پسندی کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ:

''اپنے شروع کے افسانے میں نے پریم چند اور سدرشن کے زیر اثر لکھے تھے اور وہ معاشرتی افادیت بھرے تھے۔ ناپختہ تھے۔ خام تھے، لیکن سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو لے کر لکھے گئے تھے۔''

(پیش لفظ ناول 'گرتی دیواریں' اوپندر ناتھ اشک، ص 5)

ابتدائی دور میں اشک پریم چند کا چربہ اتارنے کے ساتھ ساتھ 'انگارے' گروپ کے ادیبوں سے بھی غیر ارادی طور پر متاثر رہے ہیں۔ دونوں اثرات کی نمائندگی کرنے والی ان کی کہانیاں مایا، ماں، نشانیاں، اور تین سو چوبیس وغیرہ ہیں۔ یہ کہانیاں ڈرامائی انداز میں شروع ہو کر قاری کو تجسس کرتی ہوئی نقطۂ عروج کو پہنچتی ہیں۔ ان کہانیوں میں 'نشانیاں' پریم چند کی اور 'ماں' بیدی کی پسندیدہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کے فنی ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے جعفر رضا اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''یہ چاروں کہانیاں پہلے کی تمام کہانیوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان میں اشک پہلی بار تخیلی اور تصوراتی دنیا سے باہر نکل کر حقیقی دنیا سے روشناس ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ان کے تجربات سے گزر کر صفحۂ قرطاس پر منقش ہوتی ہیں۔''

(میری افسانہ نویسی کے چالیس برس: اوپندر ناتھ اشک، نیا دور الہ آباد 1988، ص 20)

اشک کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'عورت کی فطرت' 1932 میں سامنے آیا جس کے بیشتر افسانے معاشرتی رجحان کے تحت تخلیق ہوئے ہیں۔ مجموعے میں شامل نو افسانوں میں سے عورت کی فطرت، تانگہ والا، جاہل بیوی، اور کفارہ نے کافی شہرت حاصل کی۔ پریم چند نے اس مجموعے کے دیباچے میں عورت کی فطرت، نئی زندگی، نام رقاصہ، اور جاہل بیوی وغیرہ افسانوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ خصوصاً عورت کی فطرت کو انھوں نے حقیقت پر مبنی بتایا ہے۔

اشک کو صحیح معنوں میں اہل علم طبقے سے متعارف کرانے والا افسانوی مجموعہ 'ڈاچی' ہے جس میں ہندو مسلم اختلافات، فسادات، خونریزی، بلوے اور ملک گیر سطح پر ہندوستان کی سیاسی پالیسی کو بے نقاب کیا گیا۔ 'ڈاچی' میں اس نقطۂ نظر کے علاوہ رومانی، جذباتی اور معاشرتی افسانے بھی موجود ہیں۔

'ڈاچی' کے بعد افسانوں کے مجموعے کونپل، قفس، ناسوا، چٹان وغیرہ جو غالباً 1940 کے بعد لکھے یہ تمام افسانے نسبتاً زیادہ لطیف، نازک دقیق اور گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا ذاتی غم جذباتیت کے طور پر ظاہر نہیں ہوا ہے بلکہ ان کے ادراک کا حصہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''1934 سے پہلے میری کہانیوں کا درد حقیقی درد نہیں تھا۔ شعوری یا تخلیقی تھا۔ آج سوچتا ہوں تو صاف صاف سمجھ میں آتا ہے کہ میں کیوں حقیقی درد سے بھری ایک بھی کہانی نہ لکھ سکا۔ دراصل میں نے سچا درد جانا ہی نہیں تھا۔ سچے درد کا احساس ہی مجھے نہیں تھا اور جو شخص غم و اندوہ سے دوچار نہیں ہوا وہ محض کتابیں پڑھ کر دوسروں کے درد کی ماہیت نہیں سمجھ سکتا۔''

(میری افسانہ نویسی کے چالیس برس: اوپندر ناتھ اشک، نیا دور، الہ آباد، ص 73-72)

اس خیال کی روشنی میں ان کی افسانہ نگاری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ان افسانوں میں بلاشبہ فنی احساس کی جھلک نمایاں ہے۔ اشک نے اپنی افسانہ نگاری کے ہر دور میں ہر مذاق کے ناظر کی دلچسپی کا خیال رکھا ہے۔ افسانہ 'کونپل' سے چند دردناک جملے ملاحظہ ہوں جو تیرہ سال کی ہنکری کی جنسی نا آسودگی اور فطری خواہشات

کے ترجمان ہیں۔

''درحقیقت اپنے کپڑے زیب تن کرتے کرتے کچھ عجیب طرح کی کسمساہٹ ہنکری کے جسم میں پیدا ہوجاتی ہے۔کوئی نامعلوم سی آرزو اس کے دل میں سلگنے لگتی تھی۔'' (ایضاً،ص 39-38)

''اسے اپنی بیوگی کا بھی خیال آیا۔دھرم اور سماج کی پابندیوں کی بات بھی اس نے سوچی۔'' (ایضاً،ص 48)

''دوسرے دن جب ماں واپس جانے لگی اور اندر لے جا کر اس نے ہنکری سے گہنے مانگے تو اس نے ٹال دیا۔'' (ایضاً، 52)

یہ جملے ہنکری کی صرف جنسی خواہشات کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اس کی نفسیات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ وہ کتنے شدید ذہنی کرب واذیت میں مبتلا ہے۔

اشک کی افسانہ نگاری کی نشاندہی کرنے والی مشہور علامتی کہانی 'قفس' ہے جو طبقاتی کشمکش کو لے کر لکھی گئی ہے۔اشک کی افسانہ نگاری میں نظریۂ حیات کی ترجمانی کے سلسلے میں شاہد لطیف نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''ڈاچی،کونپل،قفس اور یہ انسان،اشک کے کامیاب افسانے ہیں۔ انھیں انھوں نے انسانیت کے اساسی جذبات کی ترقی پسند نظریہ کے مطابق ترجمانی کی ہے۔''

اردو کے کسی بھی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کے ارتقا کی اتنی زیادہ منزلیں طے نہیں کیں جتنی اشک نے۔ انھوں نے نچلے متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی، زندگی کی جزئیات اور جنسی عدم مساوات کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ وہ کہانی میں پلاٹ اور واقعات کی ترتیب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

اشک کا قیام جہاں بھی رہا چاہے وہ لاہور ہو، یا پنجاب۔ الہ آباد ممبئی ہو یا امرتسر، دلی ہو یا کشمیر۔ وہ وہاں کے بھی حالات سے نہ صرف متاثر ہوتے رہے ہیں بلکہ اپنے افسانوں کا موضوع بھی بنایا۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ بچے، افسانہ نگار خاتون، اور جہنم کے سات پل بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مائنز (Mainz) یونیورسٹی کے پروفیسر گیارگ بوداوس نے اشک کی حقیقت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اشک کی حقیقت نگاری کسی ازم سے بندھی ہوئی نہیں ہے۔ انسانی سچ کے بیکراں امکانات کا میدان اس کے لیے کھلا ہے اور وہ اپنی ترغیب کے مطابق ان کا کوئی پہلو چن لیتا ہے۔'' (میری افسانہ نویسی کے چالیس برس: اوپندر ناتھ اشک، نیا دور، الٰہ آباد 1988)

اشک نے اپنے زمانے کی حقیقتوں کو جس خوبی اور

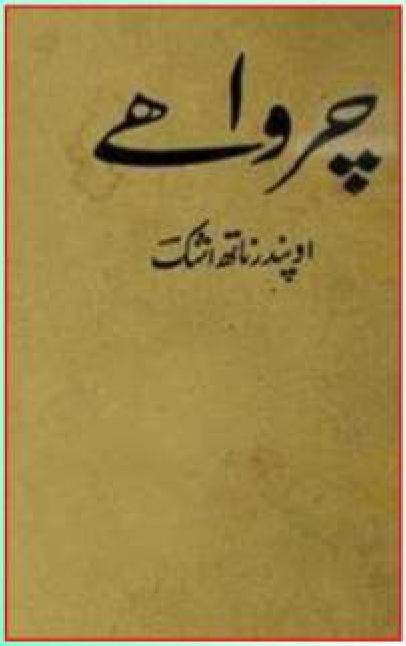

سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'ٹھہراؤ' جو خط کی تکنیک پر مشتمل ہے ایک سہیلی دوسری سہیلی کو خط لکھتے ہوئے اپنے گذشتہ پیار کی بے پناہ شدت کا موازنہ موجودہ ازدواجی زندگی میں اپنے شوہر سے پیار کرتے ہوئے یہ طے نہیں کر پاتی کہ کون سا پیار سچا ہے۔ وہ اپنے نظریہ اور جذبات اس طرح ظاہر کرتی ہے:

''کبھی کبھی سوچتی ہوں وہ محبت سچی تھی یا شفقت بھرا یہ پیار۔ ہوسکتا ہے دونوں سچے ہوں مگر مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو چھوٹا سا بیر ہا تھا جس کے کنارے میں پیاس کے مارے جا پہنچی تھی مگر جس سے پیاس بجھا کر میں تشنہ ہی رہ جاتی اور وہ تو گھنے سایہ دار درختوں میں چھپا شفاف و شیریں پانی کا ایک ایسا چشمہ ہے جس نے میری ساری تپش کو دور کر کے ہمیشہ کے لیے میری پیاس بجھا دی۔'' (میری افسانہ نویسی کے چالیس برس: اوپندر ناتھ اشک، نیا دور الٰہ آباد، 1988،ص 132)

مختصراً یہ کہ اشک نے معاشی اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ہر دور کے مسائل اور سچویشن کو اپنی کہانی کینوس میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو کسی دور سے وابستہ نہ کرتے ہوئے ہر زمانے اور ہر دور کا ساتھ دیا ہے اور ان کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ ان کے بیشتر کرداروں کا تعلق ہندو گھرانے کے نچلے اور درمیانی درجہ سے ہے۔ عورتوں کی بے بسی و بے کسی، مجبوری اور سماجی بندھنوں کے پاس ولحاظ کی پر اثر عکاسی کی ہے۔ اقتصادی بدحالی، جہالت اور تنگ نظری کے بھیانک وخطرناک نتائج کی نشاندہی کی ہے۔ طبقاتی کشمکش، بھوک، بیماری اور دیگر ضروری مسائل کو موضوع بنا کر 1934 کے اخیر تک مسلسل لکھتے رہے مگر 1935 سے ان کا رجحان ہندی زبان کی طرف منتقل ہوا اور انھوں نے دیوناگری لپی کو اپنا لیا۔ دو سال بعد پھر اردو زبان کی طرف مائل ہوئے اور 'ڈاچی' جیسا شہرہ آفاق افسانہ لکھا۔ 1926 سے 1936 تک انھوں نے تقریباً پچاس افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں فنی جھول، کمزوری، انفرادی نقش کی کمی، ذاتی عنصر کی شدید کمی کا احساس اور تکنیک کی تشنگی کے باوجود کشش، ربط، زبان و بیان، پلاٹ، تاثیر اور واقعات کی خوبصورت ترتیب موجود ہے۔

اسی لیے گل ہائے رنگا رنگ کی طرح ان کی تخلیقات ملکی اور غیر ملکی (تراجم کے توسط) ادب کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔

کتابیات

(1) اردو افسانہ اور افسانہ نگار: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مکتبہ جامعہ، دہلی 1982

(2) اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل: ڈاکٹر صغیر افراہیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1991

(3) اردو فکشن: آل احمد سرور، علی گڑھ 1973

(4) اردو افسانہ روایت اور مسائل: گوپی چند نارنگ، دہلی 1981

(5) اردو فکشن: اختر انصاری، دہلی 1984

(6) افسانہ حقیقت سے علامت تک: سلیم اختر، الٰہ آباد، 1980

(7) پریم چند شخصیت اور کارنامے: مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1983

(8) نیا افسانہ: وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1990

(9) کونپل اوپندر ناتھ اشک، مکتبہ اردو، لاہور، 1991

(10) داستان سے افسانہ تک: وقار عظیم، 1972

(11) افسانے کی حمایت میں: شمس الرحمٰن فاروقی، دہلی 1982

(12) جدید افسانہ اردو ہندی: طارق چھتاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1992

رسائل

(1) علی گڑھ میگزین: رشید احمد صدیقی، نومبر دسمبر 1922

(2) ہزار داستان: ماہنامہ لاہور حکیم احمد شجاع، مارچ-مئی 1932

(3) ادب لطیف (ماہنامہ) افسانہ نمبر

(4) مخزن (ماہنامہ) لاہور، شیخ عبدالقادر، مارچ 1903 اگست-دسمبر

(5) الفاظ، افسانہ نمبر وحید اختر، 1981

(6) نقوش، افسانہ نمبر انتظار حسین، 1954

(7) الفاظ (نئی کہانی) (دوماہی)، مہدی جعفر 1979

■

Dr. Shareefuddin Khan
Reader, Dept of Urdu, Ratan Sen Degree College
Bansi, Siddharth Nagar (UP)

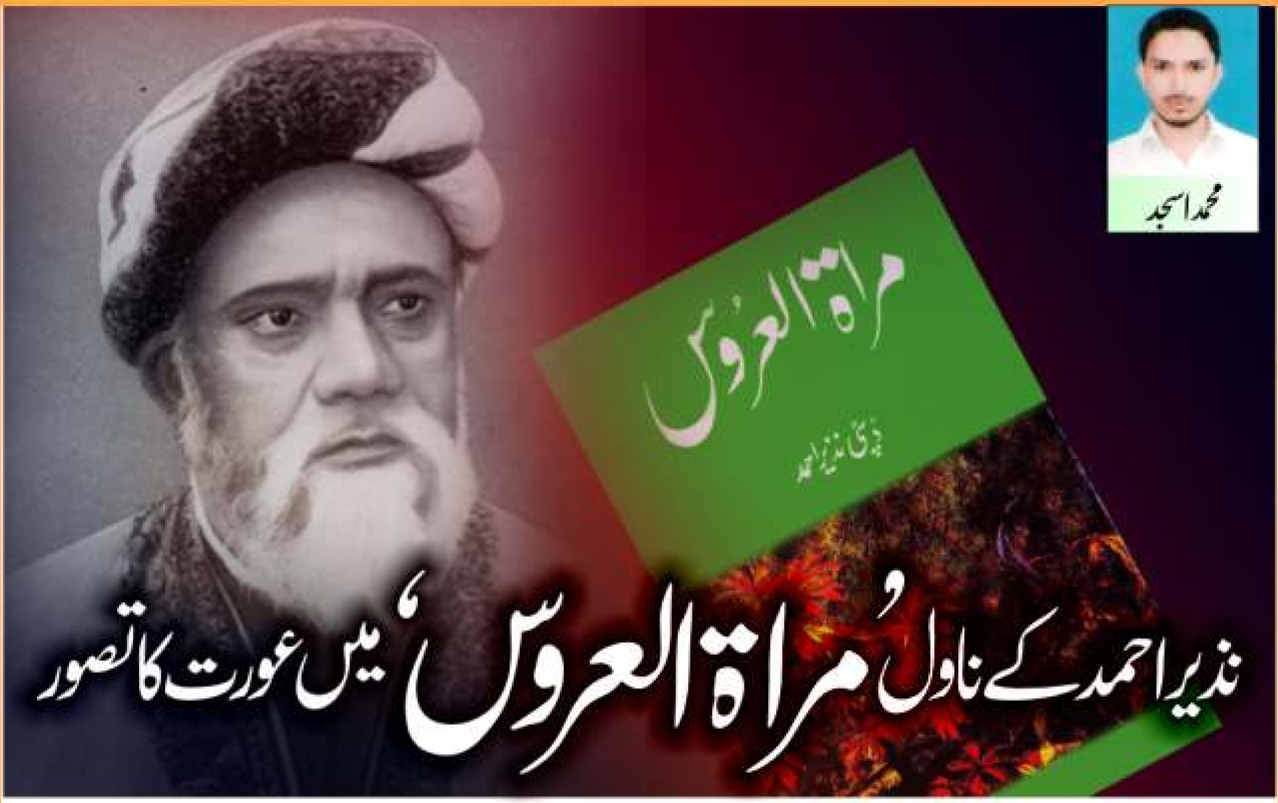

نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' میں عورت کا تصور

نذیر احمد کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سرسید تحریک سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ اس تحریک کے بنیادی عناصر سادگی، سلاست، مقصدیت اور عقلیت پسندی تھے۔ یہی عناصر ہر اس شخص کی تحریر وتقریر میں ملتے ہیں جو اس تحریک سے وابستہ تھے۔ نذیر احمد نے بھی اس تحریک کی روشن خیالی اور مقصدیت سے اثر قبول کیا۔ مغربی اثرات کی وجہ سے ہندستان میں بھی آزادی نسواں اور خواتین میں تعلیم کو عام کرنے اور ان کی اقتصادیات کو بہتر بنانے کی تحریکات کا آغاز ہو چکا تھا۔ نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنھوں نے معاشرے کی ترقی کے لیے عورتوں کی اصلاح کو بنیادی اہمیت دی اور اپنے ناولوں کے ذریعے اس کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ دل سے عورتوں کی تعلیم کو ضروری سمجھا اور اس کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش بھی کی۔

نذیر احمد نے دہلی کے مختلف طبقوں کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عورتوں کی حیثیت اور وقعت کچھ بھی نہیں ہے۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر بیٹھی اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا رہی ہیں۔ باہر کی دنیا سے انھیں کچھ علاقہ نہیں۔ اس لیے مردوں کے لیے ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ مسلم گھرانے کی عورتیں مختلف توہمات کا شکار، خانگی مسائل میں الجھی ہوئی تھیں۔ ان ساری باتوں نے مل کر عورت کے مقام کو مردوں کی نظر میں اور بھی گھٹا دیا تھا۔

نذیر احمد کا خیال تھا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرد کا بنایا ہوا قانون جو جبراً عورتوں پر لاد دیا گیا ہے اور کچھ اس طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ عورت کم عقل اور نا سمجھ ہے اس کو رد کیا جائے اور عورتیں اپنی موجودہ حالت اور خیالات کو بدلیں اور اس روایتی تصور کی نفی کریں جو عورتوں کے بارے میں رائج ہے۔ فہمیدہ کبیر نذیر احمد کے تصورات کو ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

''نذیر احمد کو اس کا بھی احساس ہے کہ عورت کو اس سطح تک پہنچانے کی ذمے داری مردوں ہی پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے اپنی جاگیردارانہ ذہنیت اور مطلق العنانی کے باعث عورت کو اس کی انفرادیت اور بنیادی حقوق سے محروم کر کے اسے مکمل طور پر اپنا تابع فرمان بنا لیا ہے۔''

(فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور نذیر احمد سے پریم چند تک، ص 15)

نذیر احمد کے عہد میں جہاں ایک طرف نئی تہذیب کے تقاضے تھے جنھیں عقل تسلیم بھی کرتی تھی۔ وہیں دوسری طرف رسم ورواج کی پابندیاں تھیں جس میں عوام کے ساتھ خواص بھی گرفتار تھے۔ جدید وقدیم کی کشمکش کا عکس اس دور کے مصلحین کی اصلاحی کوششوں میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ یہ نہیں طے کر پا رہے تھے کہ ماضی کے خزانے سے کیا اخذ کریں اور کیا ترک اور نئی تہذیب سے کس حد تک استفادہ کریں۔ قدیم وجدید کی اس کشمکش کا خاص طور سے اس وقت اور بھی احساس ہوتا ہے جب یہ لوگ عورتوں کے بعض مسائل مثلاً پردہ، تعلیم اور آزادی نسواں وغیرہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ نذیر احمد عورتوں کی اصلاح کے پرزور حامی اور ان کے اکثر معاملات میں خاصے ترقی پسندانہ خیالات کے حامل نظر آتے ہیں۔

مراۃ العروس (1869) نذیر احمد کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، یہ اردو ادب میں پہلی ایسی تصنیف ہے جس میں باقاعدہ طور پر تعلیم نسواں اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر اشفاق احمد انگریزی ناول 'پامیلا' کو اس کا ماخذ بتاتے ہیں۔ وہ دونوں ناولوں کا موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس طرح نذیر احمد ایک مقصدی ناول نگار ہیں ٹھیک اسی طرح انگریزی ناولوں کی ابتدا بھی مقصدی ناولوں سے ہوئی۔ جس طرح 'مراۃ العروس' میں ایک مثالی کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اسی طرح 'پامیلا' بھی اپنے ناول سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

''پامیلا کے مقابلے میں اصغری کے کردار میں کوئی زیادہ غیر معمولی چیز نہیں ملتی۔ محمد فاضل کے خاندان کے لوگوں کو صرف اتنا نیک دکھایا گیا ہے کہ وہ اکبری سے بھی نباہ کر لیتے ہیں۔ جہاں تک اصغری کے جذبات اور اس کی محبت کا سوال ہے اس کے بارے میں پہلے بھی کہا جا چکا

ہے کہ اصغری اور کامل کی محبت گھریلو انداز کی ہے۔''

(اشفاق احمد اعظمی، نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، ص 157)

مراۃ العروس کے مطالعے سے ایک مسلم متوسط گھرانے کی زندگی کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جس میں نذیر احمد نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سلیقہ مندی اور انتظام خانہ داری گھریلو زندگی کو انتشار سے بچا سکتے ہیں۔ عورت پر ہی گھر کے بننے اور بگڑنے کا دارو مدار ہے۔ عورت سلیقہ شعار اور ہنر مند ہے تو گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ ورنہ اس کی جہالت، پھوہڑ پن اور بد سلیقگی سے گھر انتشار اور بربادی کے دلدل میں دھنس سکتا ہے۔

اس ناول کے بیشتر کردار نسوانی ہیں اور جو مرد کردار ہیں ان کا کردار بس اتنا ہے کہ وہ عورتوں کے کردار کو ابھارنے کی غرض سے پیش کیے گئے ہیں۔ اکبری، اصغری اس ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ جبکہ باقی سب معاون اور ضمنی کردار کے زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً محمودہ، شاہ زمانی، سلطانہ بیگم، حسن آرا، ماما دیانت، ماما عظمت، بی جمن وغیرہ۔

اس ناول کے ہر کردار کی اپنی ایک شخصیت ہے ان کے عادات واطوار سوچ وفکر، رہن سہن ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔ ان کرداروں کی شخصیت نذیر احمد کے عہد کی معاشرتی وتہذیبی زندگی کا آئینہ ہے۔ چوں کہ یہ ایک مقصدی ناول ہے اس لیے ہر کردار کی پشت پر ایک مقصد ہوتا ہے جو اصلاح کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ اس ناول کے ذریعے نذیر احمد عورتوں کی تعلیم واصلاح اور امور خانہ داری سے واقف کرانا چاہتے تھے اسی بنا پر امور خانہ داری اور تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ دی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے عورت اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنا سکتی ہے۔ اس کے لیے عورت کو علم وہنر، عقل وفہم، سلیقہ مندی اور شائستگی سے آراستہ ہونا نذیر احمد ضروری سمجھتے تھے۔ ناول کے شروع میں ہی وہ لکھتے ہیں:

''اس طرح عورتوں میں حیا، پاک دامنی، پردہ داری، نیکی جو کچھ سمجھو خدا کے فضل وکرم سے بہتری ہے مگر برا مانو یا بھلا مانو ابھی تک ہے مجبوری کی یعنی مذہبی اور ملکی رواج اور مردوں کی حکومت نے عورتوں کو زبردستی نیک بنا رکھا ہے۔ لیکن اگر خود عورتوں کے دل سے نیکی کا تقاضا ہو تو سبحان اللہ نور علیٰ نور ایک تو سونا کھرا اور اوپر سے ملا سہاگا کیا کہنا مگر دل سے نیکی کے تقاضے کے پیدا ہونے کی علم کے سوائے اور کوئی تدبیر نہیں۔'' (مراۃ العروس، ص 13)

نذیر احمد اپنی بچیوں کو مہذب معاشرے میں پروان چڑھانا چاہتے تھے ان کو کیسی تعلیم دی جائے کس طرح پرورش کی جائے جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی کامیاب بنا سکیں۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ معاشرے میں اچھائی بھی ہے اور برائی بھی۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے اکبری اور اصغری جیسا مرکزی کردار تخلیق کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ اس کی پرورش، تربیت اور آس پاس کے ماحول کا اثر اس پر زیادہ پڑتا ہے۔

یوں تو اکبری واصغری دونوں سگی بہنیں ہیں مگر دونوں کے عادات واطوار، سوچ وفکر، ذہن ودماغ میں بہت فرق ہے۔ جہاں اصغری تعلیم وتربیت یافتہ، سلیقہ مند، شائستگی واخلاق کے زیور سے آراستہ ہے وہیں اکبری بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بد سلیقہ، جاہل، بے ہنر، بدتمیز ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ماحول اور بہتر پرورش کا نہ ہونا ہے۔ جہاں اصغری کو ماں باپ نے پالا اور اس کو اچھی تعلیم وتربیت سے اچھے اخلاق سکھائے وہیں اکبری کو اس کے ننیہال والوں نے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اس کی نہ تو بہتر تعلیم وتربیت کی اور نہ ہی اسے اچھے اخلاق وآداب سکھائے۔ جس کی وجہ سے وہ بگڑتی ہی گئی اور اس کا اثر بڑے ہونے تک ہی نہیں بلکہ شادی ہونے کے بعد تک رہا۔

مراۃ العروس کے مرکزی کردار دو ہیں مگر اولیت اصغری کو حاصل ہے۔ نذیر احمد کا مقصد چوں کہ اصلاح وتعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری بھی تھا اور ان چیزوں کے لیے جس سلیقہ مندی وہنر مندی کی ضرورت تھی وہ سب کی سب اصغری کے کردار میں موجود ہیں۔ اکبری واصغری دونوں کا ایک سسرال میں ہونے کے باوجود اصغری نے اپنی تعلیم، سلیقہ وہنر مندی سے اپنے ہی گھر کو نہیں بلکہ اکبری کے گھر کو بھی سنوارتی ہے۔ نذیر احمد اصغری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر میں ایسی تھی جیسے باغ میں گلاب کا پھول یا آدمی کے جسم میں آنکھ ہر ایک طرح کا ہنر، ہر ایک طرح کا سلیقہ اس کو حاصل تھا۔ دانائی، ہوشیاری ادب قاعدہ، نیک دلی، ملن ساری، خدا ترسی، حیا، لحاظ سب حقیقی خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں۔ لڑکپن سے اس کو کھیل کود ہنسی اور چھیڑ سے نفرت تھی پڑھنا یا گھر کا کام کرنا۔ کبھی اس کو کسی نے واہیات بکتے یا کسی سے لڑتے نہیں دیکھا۔'' (مراۃ العروس، ص 67)

چونکہ اکبری کی بہ نسبت اصغری کو زیادہ سازگار ماحول ملا اس بنا پر اس میں ایک اچھی عورت کے اندر جو خوبیاں ہونی چاہیے وہ سب موجود تھیں۔ اس نے کم عمری ہی میں قرآن مجید کے علاوہ دیگر علوم ومذہبی کتابوں کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ لکھنا بھی سیکھ لیا تھا جس کی بنا پر اپنے والد سے خط وکتابت کرتی تھی۔ ان سب کے علاوہ سب سے اہم کام امور خانہ داری جس میں وہ ماہر تھی۔ مثلاً عمدہ اور لذیذ کھانا پکانا، سینا پرونا، گھر کا حساب وکتاب رکھنا اچھے اخلاق کے علاوہ بہت سی خوبیوں کی مالک تھی۔ اتنی ساری خوبیوں کی وجہ سے وہ گھر اور باہر دونوں جگہ داد تحسین حاصل کرتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب اصغری کے والد اس کی شادی کا ذکر سنتے ہیں تو رنج وغم میں ڈوب جاتے ہیں اور اصغری کو خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''اب تمھارے رخصت ہو جانے سے ایسا نقصان ہوا کہ اس کی تلافی شاید اس عمر میں ہونے کی مجھے کوئی امید نہیں ہو سکتی۔'' (مراۃ العروس، ص 74)

شادی کے بعد اصغری نے جب اپنے شوہر کے گھر میں قدم رکھا تو اپنے ہنر، اخلاق، رکھ رکھاؤ اور بات چیت سے گھر کے ساتھ پاس پڑوس کا بھی دل جیت لیا۔ سب سے پہلے وہ گھر کے کاموں میں دھیرے دھیرے دلچسپی لینے کی کوشش کرتی ہے۔ محمودہ سے دوستی کرنے کے بعد وہ سسرال کے لوگوں اور آس پاس کے لوگوں کے مزاج، رہن سہن سب کچھ جان لیتی ہے۔ چوں کہ بڑی بہن کے پھوہڑ پن اور جہالت نے اس کی بھی شخصیت کو مشکوک بنا دیا تھا لہٰذا وہ کوئی بھی کام بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔

اپنی سلیقہ مندی کی بنا پر سسرال اور رشتے داروں میں ایک تمیز دار بہو کے نام سے جانی جانے لگی۔ یہاں تک پہنچنے میں اسے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جب سے اس نے ماما عظمت کی چوری پکڑی اس وقت سے ماما عظمت اس کی جان کی دشمن ہی نہیں بلکہ اس کے اور سسرال والوں کے بیچ تفرقہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کرنے لگتی ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی وہ اپنی قابلیت اور سچائی سے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے سسرال کو بھی بچا لیتی ہے۔ اور سسرال کو ماما عظمت کے 25 سالہ ظلم وستم سے نجات دلا دیتی ہے۔

ماما عظمت کو گھر سے نکالے جانے کے بعد گھر کا سارا کام اصغری اپنے ذمے لے لیتی ہے۔ ماہانہ بیس روپیہ امور خانہ داری کے لیے اصغری کی ساس کو ملتے تھے اور یہ پیسہ ان کے لیے ناکافی ہوتا اور اس کے لیے وہ اپنے شوہر سے لڑتیں بھی۔ اب وہی پیسہ اصغری کے لیے کافی تھا۔ اس نے نہ صرف گھر کا نظام سلیقے سے چلایا بلکہ گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ ہر طرف اس کی قابلیت اور ہنر مندی کی تصویر دکھائی دینے لگی۔

اصغری نہ صرف خانہ داری میں دلچسپی لیتی ہے بلکہ ان کی اصلاح کی بھی کوشش کرتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے محمودہ اور اپنے شوہر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اپنے شوہر کے بے جا مشاغل کو چھڑا کر نوکری حاصل کرنے کے لیے نوکری پیشہ لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور وہ جلد ہی دس روپیہ ماہوار کا نوکر ہو جاتا ہے۔ اور یہ تنخواہ اس کے شوہر کو ناکافی لگتی ہے۔ لیکن وہ اپنے شوہر کو سمجھاتی ہے اور ترقی کرنے کے لیے اسے سیال کوٹ روانہ کرتی ہے جہاں وہ پچاس روپیہ ماہوار کی نوکری کرنے لگتا ہے۔ پیسے کی زیادتی اور دوست واحباب کی صحبت میں اس کا شوہر بھٹکنے لگتا ہے جس کو اصغری جلد ہی بھانپ لیتی ہے۔ اس نازک موقع پر وہ اپنی خالہ زاد بہن تماشہ خانم سے مشورہ لیتی ہے لیکن اس کے روکنے کے باوجود اپنی بڑی بہن کو گھر بلا کر اپنے شوہر کی اصلاح کرنے اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے اس کو راہ راست پر لے آتی ہے پھر اپنے شوہر کو کچہری کی نوکری پر لگا دیتی ہے۔

اپنے شوہر کی اصلاح کے بعد وہ واپس چلی آتی ہے۔ آنے کے بعد اپنے ضعیف العمر سسر کو آرام کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اور ان کی جگہ اپنے بہنوئی محمد عاقل کو ملازمت دلوا دیتی ہے۔ پھر وہ اپنی نند محمودہ کی اصلاح وتربیت کرتی ہے اور جلد ہی محمودہ بلند اخلاق واعلیٰ تربیت یافتہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اصغری اس کی شادی شہر کے بڑے خاندان فتح اللہ خاں کے لڑکے ارجمند اور حسن آرا کے بھائی سے کرا دیتی ہے۔ اس کے بعد اپنے بیٹے محمد عامل کی شادی محمودہ کی بیٹی مسعودہ سے طے کرا دیتی ہے اس طرح محمد فاضل کے خاندان کو وہ پھر سے اعلیٰ خاندان میں شامل کرا دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ فرصت کے لمحوں میں گھر پر محلہ کی لڑکیوں کو پڑھانے لگتی ہے۔ اصغری کے ان سب کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے نذیر احمد لکھتے ہیں:

''خانم کے بازار میں تمیز دار بہو کا عالیشان محل کھڑا ہے کہ آسمان سے باتیں کرتا ہے اور اصغری خانم ہی کے نام سے وہ محلہ خانم کا بازار مشہور ہوا۔ جوہری بازار میں وہ اونچی مسجد جس میں حوض اور کنواں ہے تمیز دار بہو ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ خاص بازار سے آگے بڑھ کر لال ڈگی کی بغل میں تمیز گنج اسی کا ہے۔ مولوی محمد حیات کی مسجد میں اب تک بیس مسافروں کو اس کے لنگر خانے سے خمیری روٹی اور چنے کا قلیہ دونوں وقت پہنچا کرتا ہے۔ قطب صاحب میں اولیا مسجد کے برابر سرائے اسی تمیز دار بہو کی بنوائی ہوئی ہے۔ رمضان کے رمضان فتح پوری میں بیسی کے چھاپے کے قرآن اس کی طرف سے تقسیم ہوا کرتے ہیں۔ ہزار کمبل آتے، جاڑے میں مسکینوں کو اس کے گھر سے ملتے ہیں۔'' (مراۃ العروس 73-72)

اس کے ساتھ ہی اصغری کی دوسری صفت جو اسے دوسروں سے بلند کرتی ہے وہ اس کی خودداری ہے۔ وہ حسن آرا کے ساتھ ساتھ محلے کی دوسری شریف زادیوں کو بغیر معاوضہ کے پڑھاتی تھی۔ جب حسن آرا کی والدہ سلطانہ بیگم اسے معاوضہ دینے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ لینے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ جبکہ اس وقت اس کے گھر کی مالی حالت بہتر نہیں تھی۔ اور جب اس کا شوہر محمد کامل اپنی نوکری کے سلسلے میں اپنے سسرال والوں کی مدد لینے کی بات کرتا ہے تو اصغری اس کو منع کر دیتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کسی کا احسان لیا جائے اور ساری زندگی اس احسان سے اپنے آپ کو دبا ہوا محسوس کرے۔ علی عباس حسینی، اصغری کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس تہذیب کی پتلی اور اخلاق کی مشین سے شروع سے آخر تک کوئی ایسا فعل اضطراری بھی سرزد نہیں ہوتا جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ خطا اور خامیوں سے مرکب انسان ہے اور اس کے پہلو میں دل اور اس دل میں درد ہے۔ اس کی سیرت کے اہم ترین پہلو اس کی یہ خشک عقلیت ہے جب وہ ایثار بھی کرتی ہے تو بہت زیادہ سوچ سمجھ کر اور تمام مراحل اور نتائج پر نظر کر کے مثلاً تیرہ برس کے سن میں جب وہ بیاہی جانے لگتی ہے تو عواقب پر اس قدر گہری نظر تھی کہ اس نے بہت زیادہ جہیز لینا منظور نہیں کیا۔'' (ناول کی تاریخ وتنقید 186)

رنج وغم کے موقع پر بھی اصغری صبر وتحمل سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ جب اس کی سات سالہ بیٹی بتول کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ اور ماؤں کی طرح آہ وبکا نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے۔ اگر چہ انسانی فطرت کے مطابق اس کو رنج ہوا لیکن اس موقع پر بھی اس نے صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اکبری مراۃ العروس کا دوسرا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ نذیر احمد نے اس کو اصغری کے برعکس پیش کیا ہے۔ چوں کہ اس کی پرورش وپرداخت ننیہال میں ہوئی تھی وہاں اس کو اصغری جیسا سازگار ماحول نہیں ملا۔ نانی کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے اس کی وہ پرورش نہیں ہو پائی جو اصغری کی ہوئی تھی۔ چوں کہ اکبری سب سے بڑی لڑکی تھی اور دوسرے یہ کہ شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے اس کے ناز نخرے زیادہ سہے گئے اس کی ہر جائز وناجائز خواہش پوری کی گئی۔ اس کو بدزبانی، بدمزاجی اور شرارت کرنے پر بھی منع نہیں کیا گیا اور اس پر ستم یہ ہوا کہ محلے کی تمام خراب لڑکیوں سے ربط ضبط پیدا کر لیا۔ اس ماحول نے اس کے مزاج میں اس طرح کی برائیاں پیدا کر دیں۔ نذیر احمد اپنے مقصد کے تحت اس طرح کا کردار وضع کر کے اچھائیوں اور برائیوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا اندازہ ہو سکے۔

لیکن شادی کے بعد بھی اس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ منع کرنے پر اور زیادہ مزاج میں برہمی پیدا ہو گئی۔ دن چڑھے تک سونا، محلے کی خراب لڑکیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، خانہ داری میں دلچسپی نہ لینا، بدتمیز اور پھوہڑ پن میں اضافہ ہو گیا۔ شادی کے دو مہینے بعد سے ہی الگ گھر کی مانگ کرنے لگی اور اپنی سہیلیوں کے کہنے پر شادی کے پانچویں مہینے میں ہی الگ گھر لے کر رہنے لگی۔ جب اس کی ساس اس کو سہیلیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتی ہیں تو ساس کی جھوٹی شکایت وہ اپنے شوہر سے کرتی ہے۔ لیکن اس کا شوہر اس کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

''تم کو ان لڑکیوں کا کچھ حال معلوم بھی ہے؟ چنیا تو بھٹیاری ہے۔ زلفن شاید بخشو قلعی گر کی کوئی ہے۔ رحمت سقنی ہے اور اس کالی کلوٹی سلمتی کو میں نے اکثر مولن کنجڑے کی دوکان پر دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ضرور اس کی بیٹی ہوگی۔ مولن سے اس کا نقشہ بھی ملتا ہے۔ بھلا پھر یہ لوگ اس قابل نہیں کہ تم ان کو اپنی سہیلیاں بناؤ؟ محلے کے بھلے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ غریب ہونا کچھ عیب کی بات نہیں ہے مگر ایسے لوگوں کی عادتیں اچھی نہیں ہوتیں اس خیال سے والدہ نے ان لڑکیوں کے آنے کی ممانعت کی ہوگی۔'' (مراۃ العروس، ص 24)

اکبری کو اپنی سہیلیوں سے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ ہے جس کی وجہ سے اپنے شوہر اور خود کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے اور الگ گھر میں ہونے کے باوجود بھی گھر کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتی۔ کچھ دن اس کا شوہر باہر سے کھانا لاتا ہے لیکن جب وہ باہر کا کھانا کھاتے کھاتے اوب جاتا ہے تو وہ اپنی بیوی سے کھانا پکانے کو کہتا ہے۔ اس کھانے کے بارے میں نذیر احمد لکھتے ہیں:

''روٹی پکائی تو عجیب صورت کی نہ گول نہ چوکھٹی ایک کان ادھر سے نکلا ہوا اور چار کان ادھر کنارے موٹے بیچ میں ٹکیہ کہیں جلی کہیں کچی، دھوئیں سے کالی اور دال جو پکائی تو پانی الگ دال الگ غرض مزاج دار ایسا لذیذ اور لطیف کھانا پکاتی تھی کہ نمک ڈالا تو زہر اور کبھی پھیکا پانی۔''

(مراۃ العروس 55-54)

اس طرح کا کھانا کھا کر اس کا شوہر واپس اپنی ماں کے گھر کا کھانا کھانے لگتا ہے۔ یہ چیز اکبری کی آرام طلبی میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ اپنی جہالت اور کم عقلی کی وجہ سے پہلے وہ گھر کا سارا سامان فروخت کر دیتی ہے اس کے بعد اس کے بھولے پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چنیا اس کا سارا زیور لے کر فرار ہو جاتی ہے۔ اکبری کے کردار میں بظاہر بہت ساری خرابیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن علی عباس حسینی نے اس کے کردار کو بہت پسند کیا ہے اور اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وہ الڑھ ہے، بے پرواہے، بے سلیقہ ہے، فضول خرچ ہے، صحبت ارزل میں بیٹھنے والی ہے۔ لیکن وہ صاف دل ہے اس کو غصہ بھی آتا ہے وہ کوستی کاٹتی بھی ہے، طعنے بھی دیتی ہے، ہنستی بھی ہے روتی بھی ہے، اس لیے ہمیں اس سے زیادہ ہمدردی ہوتی ہے اور ہمارا جی چاہنے لگتا ہے کہ اگر ہم کاتب تقدیر ہوتے تو اتنی تکلیفوں کے بعد اس کے دن ضرور پھیر دیتے۔'' (ناول کی تاریخ و تنقید،ص 190)

اس ناول کے نسوانی کرداروں میں ماما عظمت کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسا کردار تخلیق کر کے نذیر احمد نے ناول کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ پچھلے پچیس سالوں سے محمد فاضل کے گھر کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور گھر کے قرضوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ سبزی، دال، چاول، کپڑے وغیرہ سے رقم بچاتی تھی اور اپنی لڑکی اور دو گھرانوں کا خرچہ اسی گھر سے نکالتی تھی۔ شادی کے بعد جب اصغری نے گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں میں لیا تو اسے ماما عظمت کا کردار کچھ مشکوک نظر آیا اس لیے اصغری نے ماما کفایت النساء کو چار دنوں کے لیے رکھ لیا۔ دھیرے دھیرے ماما عظمت کی ایک ایک چوری سامنے آنے لگی۔ جب اصغری اور ماما کفایت النساء اس کو منع کرتی ہیں اور گھر سے باہر نکالنے کی دھمکی دیتی ہیں تو وہ کھلے لفظوں میں ماما کفایت النساء سے کہتی ہے کہ:

''میرا نکلنا آسان بات نہیں۔ گھر نیلام کر کے نکلوں گی، اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی۔''

(مراۃ العروس،ص 87)

لیکن جب اس کو اصغری سے زیادہ خطرہ نظر آنے لگتا ہے تو وہ کبھی اس کے شوہر اور کبھی اس کی ساس کے بیچ تفرقہ پیدا کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں وہ کچھ حد تک کامیاب رہتی ہے لیکن آخر میں اس کو فاضل کے گھر سے بے عزت ہو کر نکلنا پڑتا ہے۔ بی جَجن بھی اس ناول کا ایک اہم کردار ہے یہ کردار دھوکہ باز اور گھر میں جھگڑے لگانے والے کرداروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ نذیر احمد اس

> **نذیر احمد ایک مقصدی ناول نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناول میں اس وقت کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی عورتوں کے حالات وحیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ مثالی کردار وں کے ذریعے یہ واضح کیاہے کہ اس وقت کا سماج عورتوں سے کس طرح عادات واطوار اور افعال وکردار کا متوقع تھا۔ لہٰذا عورتوں کے متعلق سماجی روایات ورسومات اورنظریے کے ذریعے عورت کی مجموعی شبیہ پیش کی ہے۔**

کردار کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یہ مکار جَجن بے وقوف عورتوں کو پھسلانے کے لیے طرح طرح کے تبرکات اور صد ہا قسم کی چیزیں اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ تسبیح، خاک شفا، عقیق البحر اور مونگے کے دانے اور نادعلی، پنج سورے اور بہت سی دعائیں...... جَجن نے مزاج دار کو باتوں میں تاڑ لیا کہ یہ عورت جلد ہی ڈھب پر چڑھ جائے گی۔ ایک پیسہ کا بہت سا سرمہ تول دیا اور دو آنے کو نادعلی کے حوالے کی اور فیروزے کی ایک انگوٹھی تبرک کے طور پر اپنے پاس سے مفت دی مزاج دار بچھ گئی۔'' (مراۃ العروس،ص 56-57)

آہستہ آہستہ جَجن بی اکبری کو اپنے دام میں لینے کی کوشش شروع کرتی ہے کبھی معجزاتی لونگ دے کر اور کبھی سستے سامان دے کر اور کبھی لچھے دار باتیں کر کے۔ اس کے بعد وہ اکبری کو اولاد ہونے کا یقین دلا کر اس کا سارا زیور لے کر فرار ہو جاتی ہے۔

اس ناول کو لکھتے وقت نذیر احمد کا جو مقصد تھا اس میں وہ پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ کردار نگاری کے تقاضے کو انھوں نے بہت ہی خوبصورتی سے برتا ہے اور خاص کر نسوانی کردار نگاری میں انھوں نے مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کے عہد میں کٹنیاں بھی سماج کا ایک جز و تھیں۔ انھوں نے اس عہد کی کٹنیوں کی جعل سازی، مکاری، عیاری اور ٹھگی کو بیان کرنے میں غیر معمولی مشاہدے اور فطرت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ شریف گھرانوں میں ایک خاص طرح سے رسائی حاصل کرتیں اور اپنے آپ کو نیک و پارسا ثابت کر کے بھولی بھالی اور جاہل عورتوں کے زیورات لوٹ لیتی تھیں۔ یہ کٹنیاں اس قدر چالاک، مکار اور عیار ہوتی تھیں کہ آسانی سے ان کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے مذہبی تقدس کو اس طرح ظاہر کرتی تھیں کہ جاہل اور بد عقیدہ عورتیں ان پر بہت جلد اعتماد کرنے لگتی تھیں۔ اس زمانے کی عورتیں عام طور پر جاہل اور توہمات کی اسیر ہوا کرتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان کا استحصال کیا جا سکتا تھا۔ کٹنیاں ٹھگی کے علاوہ مرد وزن کے تعلقات بڑھانے، بگاڑنے اور جنسی کشیدگی بڑھانے میں اہم رول ادا کرتی تھیں۔ نذیر احمد نے کٹنیوں کے کردار کے ذریعے اس عہد کی عورتوں میں اخلاقی گراوٹ، جہالت، بداعتقادی کی عکاسی کی ہے۔

اس عہد کے مسلم اعلیٰ اور متوسط گھرانے میں کام کاج کرنے کے لیے نوکر اور مامائیں رکھنے کا رواج تھا۔ گویا ان کو رکھنا اپنی خوشحالی اور آن بان کو ظاہر کرنے کے لیے بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ خواہ گھر قرض میں ڈوبا ہوا کیوں نہ ہو۔ مامائیں گھر کا سودا سلف لایا کرتی تھیں۔ چوں کہ اس عہد میں متوسط طبقے کے افراد خود سے گھر کا ساز و سامان لانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ خود سے ادھار مانگنا تو اور بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

مامائیں عورتوں کی جہالت اور ان کی شرافت کا خوب فائدہ اٹھایا کرتی تھیں۔ بازار سے سودا سلف لاتیں اس میں غلط حساب جوڑ کر کچھ پیسوں کا غبن کر لیا کرتی تھیں۔ لالہ اور مہاجن سے ادھار مانگ کر لاتیں اس میں بھی خرد برد کرتیں۔ دراصل شریف گھرانے کی عورتیں ادھار حساب کتاب نہیں سمجھ پاتی تھیں اور زبانی حساب کو یاد رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ پورا گھر قرض میں ڈوب جاتا۔ مامائیں ان گھرانوں میں اس قدر دخیل ہوتی تھیں کہ اگر ان کی چوری پکڑی بھی جاتی تو بھی ان کو نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

نذیر احمد ایک مقصدی ناول نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں اس وقت کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی عورتوں کے حالات وحیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ مثالی کرداروں کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ اس وقت کا سماج عورتوں سے کس طرح کے عادات واطوار اور افعال وکردار کا متوقع تھا۔ لہٰذا عورتوں کے متعلق سماجی روایات ورسومات اور نظریے کے ذریعے عورت کی مجموعی شبیہ پیش کی ہے۔

■

Mohd Asjad
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

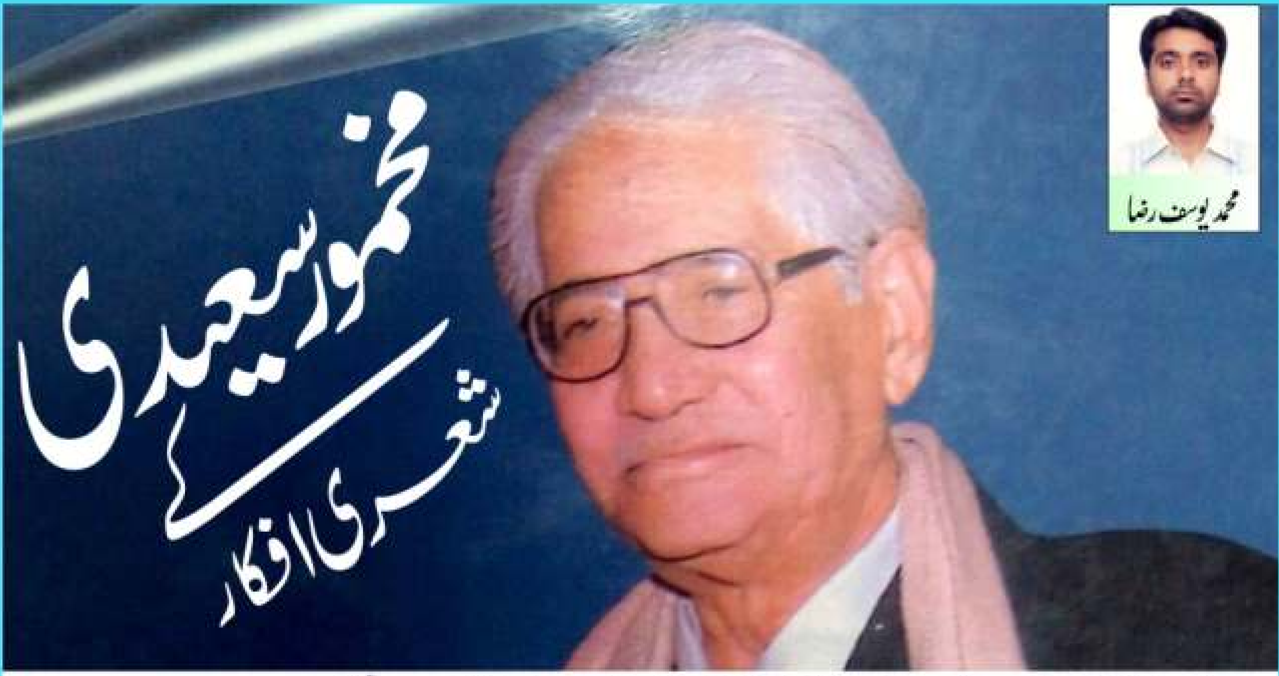

مخمور سعیدی کے شعری افکار

محمد یوسف رضا

مخمور سعیدی ٹونک میں 31 دسمبر 1934 کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سلطان محمد خاں تھا۔ ٹونک راجستھان میں واقع ہے اور یہ سیاسی وادبی لحاظ سے بہت مشہور ہے۔ ان کے آباواجداد کا تعلق ترکوں کے تاجک قبیلے سے ہے۔

مخمور سعیدی کے والد کا نام احمد خاں تھا اور والدہ کا نام انیس النسا بیگم، دادا کا نام شیر عالم خاں دادی کا نام محمودہ بیگم تھا۔ مخمور سعیدی کے والد کا انتقال 1959 میں ہوا۔ ان کے والد اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ مخمور سعیدی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے دادا شیر عالم خاں بھی شاعری کرتے تھے اور ان کا تخلص زخمی تھا۔ یہی شعری جراثیم ان کے بیٹے یعنی احمد خاں میں بھی آئے اور وہ بھی شعر کہنے لگے۔ ان کا تخلص نازش تھا۔ یہی روایت آگے بڑھی تو مخمور سعیدی کو بھی شعر کہنے کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ شاعری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کے دادا کے دو بیٹے تھے ایک تو ان کے والد دوسرے چچا وہ بیدل تخلص کرتے تھے۔ ان کا گھرانا ایک عزت دار گھرانا تھا۔

مخمور سعیدی جب سن شعور کی منزلیں طے کر رہے تھے تو اس وقت چاروں طرف قتل وغارت گری کا ماحول تھا۔ یہ دور ایسا دور تھا جس نے تمام انسانوں کو خون کے آنسو رلایا، اور جس کے آنسو نہ نکلے تو وہ انسانی پیکر میں چھپے ہوئے شیطان اور حیوان تھے جو یہ کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے رہے تھے ان کے چہرے پر کسی طرح کی کوئی مایوسی یا پچھتاوا نہیں تھا۔ اسی حادثے میں بہت سے لوگوں کا گھر بار لٹ چکا تھا۔ انھیں میں مخمور سعیدی بھی تھے۔ انھیں ان حالات سے پریشان ہوکر اپنا آبائی شہر یعنی ٹونک چھوڑنا پڑا۔ یہی وہ المیہ ہے جو انسان کا تمام عمر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ مخمور سعیدی کو ہندوستان میں اگر کوئی جگہ محفوظ نظر آئی تو وہ دہلی تھی۔ 1953 میں انھوں نے دہلی کا رخ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مخمور سعیدی جو بات اپنے ذہن میں رکھ کر دہلی آئے تھے وہ دہلی میں نہیں ملی۔ کیونکہ ان کا خاندان اس سانحے میں بالکل اجڑ چکا تھا۔ اس لیے یہ سفر ان کے لیے غنیمت بھی رہا۔ دہلی میں انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اسی دوران انھوں نے رسالہ 'تحریک' کی ادارت کی جس سے اردو حلقوں میں ان کی پہچان ہونے لگی۔ یہ رسالہ گوپال متل نکالتے تھے۔ مخمور سعیدی اس رسالے سے ایک طویل مدت یعنی 25 برس تک جڑے رہے۔ اس کے علاوہ 'نگار'، 'امنگ' 'ایوان اردو' 'گلفشاں' جیسے رسائل سے بھی وابستہ رہے۔ 'گلفشاں' ان کا ذاتی ڈائجسٹ تھا۔ ان کی انہی خدمات اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اردو اکادمی دہلی کا اسسٹنٹ سکریٹری بنایا گیا 1995 سے 1994 تک وہ اردو اکادمی دہلی سے اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے وابستہ رہے اور پھر انھیں اسی ادارے کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ اس کے بعد N.C.P.U.L یعنی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے ماہنامہ 'فکر وتحقیق' اور 'اردو دنیا' سے بھی وابستہ رہے۔ وہ اپنی آخری عمر تک یعنی 2010 تک ان رسالوں سے وابستہ رہے۔ ان کا انتقال جے پور کے ایک اسپتال میں، تجہیز وتکفین 2 مارچ 2010 کو ٹونک میں ہوئی۔ مخمور سعیدی کے دس شعری مجموعے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(1) گفتنی: 1960
(2) سیہ بر سفید: 1969
(3) آواز کا جسم: 1972
(4) سب رنگ: 1975
(5) واحد متکلم، 1979
(6) آتے جاتے لمحوں کی صدا: 1979
(7) بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا: 1983
(8) دیواروں کے درمیان: 1994
(9) راستہ اور میں: 2003
(10) پیڑ گرتا ہوا، (ہندی)

نثر میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے تراجم بھی کیے جس میں غالب کی 'دستنبو' کا فارسی سے اردو میں کیا گیا ترجمہ بہت مشہور ہوا۔

راجستھان استھاپنا دوس کمیٹی نے انھیں ان کی ادبی وعلمی خدمات کے اعتراف میں 'فخر راجستھان' کے خطاب سے نوازا۔

دہلی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، بنگال اردو اکادمی اور راجستھان اردو اکادمی نے بھی انھیں اہم انعامات سے نوازا۔

مخمور سعیدی کو شروع سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔ مخمور سعیدی کو بحیثیت شاعر سمجھنے کے لیے بھی لوگوں نے الگ الگ رائے دی ہے۔ کسی نے انھیں روایت پرست ٹھہرایا ہے، کسی نے جدید شاعر بتایا ہے، اور کوئی انھیں ترقی پسند بتاتا ہے۔ مخمور سعیدی کی شاعرانہ عظمت کے تعین سے متعلق پروفیسر شہپر رسول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مخمور سعیدی ایک ایسے تراہے پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں روایت، ترقی پسندی اور جدت تینوں رویے ایک دوسرے میں پیوست ہوجاتے ہیں۔ وہ اس تہذیبی تسلسل سے انکار نہیں کرسکتے جو صدیوں کی ادبی روایات کا حصہ ہیں۔ اس لیے پرانی کھیتی کی مٹی میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کے عمل کی نشاندہی ان کے یہاں کی جاسکتی ہے، ہیئت اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے جو مثبت تجربات ترقی پسندی کے پرچم تلے وجود میں آئے ان کی چھاپ بھی مخمور سعیدی کے شعری تجربات میں اپنی جھلک دکھاتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جدیدیت ان کے لیے تخلیقی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ وہ جب ذات کی تخلیقی وسعتوں میں کائناتی تحریک کا احساس کرتے ہیں تو ان کی شعری انفرادیت افراد کے مابین ایک ایسا آئینہ آویزاں کردیتی ہے جو ان کی شاعری کی سطح پر پیدا ہونے والے تازہ کار تنوع سے ہمارا تعارف کراتا ہے"۔

مخمور سعیدی کی نظم 'سبب میری اداسی کا' میں یہ بھی افکار اور رویے بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ نظم کا ایک حصہ پیش ہے:

کسی دن پاس میرے آکے بیٹھو
میرے سینے پہ رکھ کر ہاتھ دیکھو
یہ دل کی دھڑکنیں کیا کہہ رہی ہیں
میری الجھن میرا آزار کیا ہے؟
کسی دن دور مجھ سے جاکے دیکھو
سبب میری اداسی کا سمجھ لو
محبت کی یہ کیا مجبوریاں ہیں
تمھاری دوریوں میں قربتیں تھیں
تمھاری قربتوں میں دوریاں ہیں

اس نظم میں مخمور سعیدی کے تینوں رجحانات ترقی پسندی جدت پسندی اور روایت پرستی صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

مخمور سعیدی نے غزل، نظم، قطعات اور رباعیات میں طبع آزمائی کی۔ نظم اور غزل پر مخمور سعیدی کو یکساں عبور حاصل ہے۔ ہم ان کی نظم اور غزل میں امتیاز نہیں کرسکتے۔ لیکن نظم نگاری کے حوالے سے ہمارا مقصد ان کی اس انفرادیت کو سمجھنا ہے جو ان کے ہمعصروں میں انھیں ممتاز کرتی ہے، وہ ان کی ترقی پسندی، جدت پسندی اور روایت پرستی ہے، یہ تینوں کسی ایک نظم نگار کے یہاں (ہمعصروں) کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مخمور سعیدی نے اپنی شاعری کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں جدید رجحانات صاف طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

مخمور سعیدی نے اپنی نظموں میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو کہ موضوع کے عین مطابق ہیں۔ ان کی نظموں میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر مانوس نہیں۔ مخمور سعیدی جدیدیت کے دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھوں نے کبھی خود کو کسی گروہ میں قید نہیں کیا۔ جو بھی کہا آزادانہ طور پر کہا۔ مخمور سعیدی نے اپنی ایک نظم جس کا عنوان ہے 'چو سرو باش، کہ ہست از ہوائے خود در خاص' میں اپنے اس نظریہ کو پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہے:

تیرے خلوص کا میں معترف تو ہوں لیکن
تیرے خلوص کا محور بہت بھیانک ہے
میں اس کی تلخ حقیقت کو پاچکا کب کا
تو جس طلسم میں کھویا ہوا ابھی تک ہے
نظام زیست کی تشکیل تازہ تر کے لیے
بری نہیں ہے نظام کہن کی بربادی
ہر اس نظام سے لیکن ستیزہ کار ہوں میں
جو مجھ سے چھین لے فکر و نظر کی آزادی

اس نظم کے مطالعے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی گروہ کی قید میں نہیں رہنا چاہتے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تخلیق کار آزاد ہوتا ہے اور اسے آزاد ہی رہنا چاہیے۔ ناسٹلجیا جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ وہ درد ہے جسے چاہ کر بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس کا رشتہ تمام شعرا وادبا سے ہے۔ اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کا رشتہ جس تخلیق کار سے بھی ہوتا ہے، آخر تک یہ اس سے اپنا رشتہ نبھاتا ہے اور بار بار اسے بچھڑے ہوئے علاقے اور لوگوں کے پاس لے جاتا ہے۔ یہ سفر کبھی کبھی جسمانی بھی ہوتا ہے ورنہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ خیالات میں ہی اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کرتا رہتا ہے۔ مخمور سعیدی بھی اس سے دوچار رہے، کیونکہ ٹونک میں جب ان کا سب کچھ اجڑ گیا تو مجبوراً انھیں اس کو خیر باد کہتے ہوئے دہلی کو اپنا مسکن بنانا پڑا۔ ان کی نظموں میں یہ ناسٹلجیا صاف طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ناسٹلجیا (یاد ماضی) جب حد سے گزر جاتا ہے تو وہ انسان کو تمام تر چیزوں سے منحرف کردیتا ہے او زندگی بے چین ہوجاتی ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اختر انصاری کو یہ کہنا پڑا:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مخمور سعیدی نے اپنی نظموں کے لیے جن موضوعات کو منتخب کیا ہے وہ فسادات یادِ ماضی، فطرت کے مناظر، حب وطن اور تہذیب کا زوال وغیرہ ہیں۔

ان کی نظموں میں درد منتہائے کمال کو پہنچتا نظر آتا ہے اور نظموں کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو اپنی گرفت

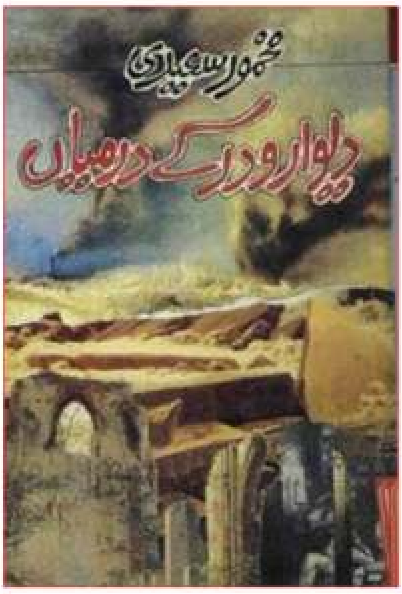

میں لے لیتا ہے، ان خوبیوں کے ساتھ ان کی نظم نگاری میں ایک خامی بھی در آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں وسعت کی کمی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ اپنی ذاتی یادوں کے سائے میں کیا ہے۔

'یادوں کا وطن' ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ناسٹلجیا ہی ناسٹلجیا ہے۔ یہاں پر ان کی اس طویل نظم کا ایک حصہ یا چند مصرعے پیش کیے جاتے ہیں:

میں کہ اک وادیِ غربت کا بھٹکتا رہرو
مدعائے سفر آنکھوں سے ہے اوجھل، لیکن
بے ارادہ قدم اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں
آج کس دھن میں نہ جانے یونہی چلتے چلتے
ایک اجڑی ہوئی بستی میں نکل آیا ہوں
ایک بے نام کشش کی اثر اندازی سے
دفعتاً آن گرا ہو کسی ویرانے میں

دور، ویران فضاؤں کے دھندلکے میں نہاں
کچھ شکستہ سے در و بام نظر آئے ہیں
ان شکستہ سے در و بام میں خوابیدہ ہے
میرا ماضی، مرے کھوئے ہوئے خوابوں کا جہاں
میرا ماضی جو مرے حال کا ہم رنگ نہیں
(بے کراں ہے مرے ماضی کا جہاں، تنگ نہیں)

نظم کے اس حصے میں شاعر اپنے وطن پہنچتا ہے۔ وہ جب اپنے وطن سے مجبور ہوکر کسی دوسری جگہ جاکر بس گیا تھا تو وہاں اس نے پریشانیاں بھی جھیلیں اور طرح طرح کے دکھ بھی اٹھائے۔ اس کے دل میں ماضی کی یادیں گھر کئے ہوئے ہیں، وہ خود کو ایک بھٹکتا ہوا رہرو کہتا ہے۔ یہ

مخمور سعیدی کے یہاں اسلوب سادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں پیچیدہ الفاظ اور مشکل تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوع میں وسعت کم ہے لیکن قدرت بیان ہونے سے اس کا احساس قاری کو کم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں انسانیت کو اول درجہ حاصل ہے انھوں نے اپنی نظموں میں مساوات کا پیغام دیاہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سبھی انسان مل جل کر رہیں یہی انسانیت اور آدمیت کا تقاضا ہے، انسانیت کا درد ہی آدمی کو انسان بناتا ہے۔

حقیقت بھی ہے آدمی اپنے گھر میں کسی طرح بھی رہے سکون محسوس کرتا ہے مگر وطن چھوڑنے کے بعد وہ کتنی بھی خوشحالی میں رہے، لیکن اس کے دل کو تو وہ سکون میسر نہیں ہوتا جو اپنے وطن میں ہوتا ہے۔ شاعر نے راستے کی طرف اپنے قدم تو بڑھادیے ہیں مگر اس کا ارادہ کچھ نہیں ہے اور اس کے قدم بس بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ اچانک جب وہ کسی مقام پر ٹھہرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک اجڑی ہوئی بستی ہے جس میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے وہ اچانک اس ویرانے میں آگیا ہو۔ وہ وہاں پہنچ کر ویران ہی ویران محسوس کررہا ہے اور وہاں کی فضا دھندلی دھندلی نظر آرہی ہے۔ سارا منظر بدلا بدلا ہے اس بستی کے در و بام بھی شکستہ ہیں اور انھیں در و بام سے اس کا ماضی جڑا ہوا ہے اور اپنے حال کو وہ اس سے ذرا بھی ہم آہنگ نہیں محسوس کرتا۔ شاعر کو اپنا ماضی بے کراں نظر آتا ہے۔ اس پوری نظم میں ہی ناسٹلجیا کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ قاری شروع سے آخر تک خود کو اسی غم میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ ان کی نظمیں 'تلاش بہاراں'، 'رات کی تاریکی میں'، 'ماضی'، 'امید کے فرشتے'، 'شنیدہ'، 'رات کا سفر'، 'عہد ماضی کی سیرگا ہیں'، 'دو گمشدہ کڑیاں'، 'ایک لڑکی'، 'حسن نظارہ'، 'ایک تبسم ایک کرن'، 'سرراہ گزارے'، 'سالگرہ'، 'چھیڑ خوباں سے'، 'تعبیر'، 'دریچے' اہم ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اپنے اسلوب بیان سے ماضی کی یادوں کو پیش کرکے نظموں کے حسن کو دوبالا کردیا ہے۔

کبھی کبھی انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ جب مصیبت میں گھر جاتا ہے اور اسے کہیں سے کوئی سہارا نظر نہیں آتا تو وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے میں جب کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا تو اس کی تنہائی ہی اس کی ڈھارس بندھاتی ہے اور اگر یہ واقعہ کسی تخلیق کار کے ساتھ ہوتو وہ اس تنہائی کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بنالیتا ہے اس میں طرح طرح کے رنگ بھر کے پیش کرتا ہے۔ مخمور سعیدی کی نظموں میں بھی ہمیں یہ تنہائی۔ یہ درد اور یہ غم ملتا ہے جسے انھوں نے فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''تنہارات کا آسیب'' اس کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ نظم کے چند مصرعے پیش ہیں:

ظلمت شب کی ردا اوڑھے ہوئے
وہ میرے کمرے میں آیا دفعتاً
اور سرگوشی میں کچھ مجھ سے کہا
اس کا لہجہ اجنبی
آواز بھی ناآشنا
ڈر گیا کمرے کی تنہائی سے میں
میں نے گھبرا کر کہا: تم کون ہو؟
(بام و در نے دی صدا: تم کون ہو؟)
کس سے ملنا ہے تمہیں
اور ہوگا کوئی وہ میں تو نہیں
(تھا کہیں جانا، چلے آئے کہیں)
میری گھبراہٹ پہ وہ ہنسنے لگا
اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا
مجھ سے کیا ڈر نہ تیرا سایہ ہوں میں
اس ٹھٹھرتی رات کی تنہائی میں
جانے کتنی دور سے چلتا ہوا
تجھ سے ملنے کے لیے آیا ہوں میں

ان سترہ مصرعوں میں شاعر نے تنہائی کے کرب کو پیش کیا ہے۔ واقعہ ایک ٹھنڈی رات کا ہے جب شاعر اندھیری رات کی ٹھنڈ میں تنہا بیٹھا ہوا کسی فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اچانک اسے کوئی انجانی آواز محسوس ہوتی ہے، اس آواز کو سن کر وہ ڈر جاتا ہے جو کہ فطری ہے کیونکہ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا تو یہ آواز کس کی، لیکن اس نے ڈرتے ہوئے ہلکی سی آواز میں کہا تم کون ہو؟ جبکہ اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا اس کے اس سوال پر اس کے کمرے کی دیواروں سے صدا آئی تم کون؟ دراصل یہ صدا کسی اور کی نہیں تھی بلکہ خود شاعر کی ہی تھی جو دیواروں سے ٹکرانے کے بعد اس کے کانوں میں آئی۔

مخمور سعیدی نے اس نظم میں اپنی فکری اساس کی عکاسی بھی کی ہے۔ کیونکہ جب ہم کبھی لق و دق صحرا میں جہاں دور دور تک کوئی نہیں ہوتا یا کسی بند کمرے میں جہاں صرف خاموشی ہی خاموشی ہو اور وہ بھی رات میں، تو ہمیں اپنی ہی آواز کئی مرتبہ سنائی دیتی ہے۔ یہی آواز اس نظم میں ابھرتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب ہم کسی سنسان جگہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے پیچھے کوئی آرہا ہے مگر جیسے ہی ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو کوئی بھی نہیں ہوتا پھر اپنے قدم بڑھاتے ہیں تو پھر محسوس ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو ہم اتنی ہمت بھی نہیں کرپاتے کہ اپنی گردن کو پیچھے کرکے دیکھ سکیں کیونکہ ایک قسم کا ڈر جو کہ ہوتا نہیں ہے ہمارے ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اصل میں یہ جو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے پیچھے آرہا ہے وہ ہمارے ہی قدموں کی آواز ہی ہوتی ہے اور ہم اس کو پہنچان نہیں پاتے اور وہم کا شکار ہوجاتے ہیں۔

نظم آگے بڑھتی ہے شاعر کہتا ہے۔ تمھیں کس سے ملنا ہے؟ پھر خود ہی کہتا ہے جس سے تمھیں ملنا ہے وہ کوئی اور ہوگا میں نہیں، تمہیں کہیں اور جانا تھا اور تم غلط جگہ یعنی میرے پاس چلے آئے۔ شاعر کی اس پریشانی اور گھبراہٹ کو دیکھ کر محسوس کرکے اسے ہنسی آنے لگتی ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ سے کیوں ڈرتے ہو؟ میں تیرا ہی تو سایہ ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس ٹھٹھرتی رات میں تو اکیلا ہے تو دور سے چل کر میں تجھ سے ملنے چلا آیا۔ دراصل اس نظم میں مخمور سعیدی نے اس وہم کو پیش کیا ہے جو انسان خود ہی پیدا کرلیتا ہے اور وہ تنہائی میں اس سے ڈر جاتا ہے، جب ہم اس نظم کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ایسا اس نظم میں ڈرامائی عناصر کے ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کی اور بھی نظمیں ہیں جو درد و غم اور یاد ماضی سے لبریز ہیں، مخمور سعیدی کی ایک نظم 'ڈھلتی عمر' میں استفہامیہ انداز ہے اور نظم میں شروع سے آخر تک یہ انداز برقرار رہتا ہے۔

مخمور سعیدی کے یہاں اسلوب سادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں پیچیدہ الفاظ اور مشکل تراکیب کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوع میں وسعت کم ہے لیکن قدرت بیان ہونے سے اس کا احساس قاری کو کم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں انسانیت کو اول درجہ حاصل ہے انھوں نے اپنی نظموں میں مساوات کا پیغام دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سبھی انسان مل جل کر رہیں یہی انسانیت اور آدمیت کا تقاضا ہے، انسانیت کا درد ہی آدمی کو انسان بناتا ہے۔

■

Mohd Yousuf Raza
H.N: B-276, Lane No.:6, Subhash Vihar
North Ghonda, Delhi - 110053
Mob.:09990778665

ڈاکٹر خلیل الرحمن راز

عطاء الرحمن قاسمی

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز اردو، عربی اور انگریزی زبان وادب کے مایہ ناز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، انھوں نے مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور سے فضلیت، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے اور ام القری یونیورسٹی مکہ مکرمہ سے، پہلے اسلامیات میں ایم اے، پھر اسی جامعہ سے اقبالیات پر پی ایچ ڈی کیا تھا آپ کے مقالے کا عنوان تھا "محمد اقبال وموقفه من الحضارة الغربية" جس میں انھوں نے مغربی افکار پر علامہ اقبال کے تنقیدی نظریات ومطالعات کا جائزہ ومحاسبہ پیش کیا ہے اور مغرب کی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں دنیاؤں کے حوالے سے با مقصد گفتگو کی ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال کو عالم عرب میں متعارف کرانے کا امکانی فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب 1988 میں بیروت سے شائع ہو چکی ہے، ان کی دوسری کتاب 'راز اقبال' ہے جو دراصل اقبالیات پر مبنی فکر انگیز تحقیقی مقالات کا اہم مجموعہ ہے جس میں 'اقبال اور قرآن، اقبال کا عرفان وعشق رسول، اقبال کا فلسفہ خودی، اقبال کی تنقید مغرب کا ماحصل، اقبال کا فلسفۂ حیات بعد الموت اور اقبال اور مسئلہ وحدت الوجود' جیسے اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ماہرین اقبالیات کے زمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز اصلاً فلسفی عالم تھے، ان کے موضوع اور مزاج دونوں فلسفیانہ تھے، وہ لکھتے بھی تھے تو فلسفیانہ اسلوب میں اور بولتے بھی تھے تو منطق وحکمت کے لہجے میں اور نظر آتے بھی تھے تو فلسفی کے روپ میں لیکن تھے دانائے راز اور صاحب اسرار اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا وہ فارسی شعر (تھوڑی ترمیم کے ساتھ) لے لیا جائے جو انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے لیے کہا تھا:

ادب (سیاست) را نقاب چہرہ کردی
وگر نہ عاشق مستانہ بودی

اس کے باوجود ان کا اسلوب بیان دلکش و دلآویز تھا، لیکن بدقسمتی سے وہ جس سطح اور جس پایے کے آدمی تھے، اس معیار کے مطابق وہ علمی وتحقیقی کام نہ کر سکے، جس کے اسباب کچھ بھی ہو سکتے ہیں، میرے لیے یہی خوش آئند بات ہے کہ برسہا برس سعودی عرب اور قطر میں رہنے کے باوجود اپنے علمی ذوق و مذاق کو ضائع نہیں کیا تھا، اور شریعت وطریقت اور علم و ادب سے رشتے کو استوار رکھا، بس اس کا صدمہ ضرور رہا کہ انھوں نے خاندانی روایات کے برعکس درس وتدریس، علم وتحقیق کے بجائے شعر وشاعری کی دنیا کو اپنا لیا تھا اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، لیکن یہاں بھی ان کا شاعرانہ مزاج کچھ فلسفیانہ ہی رہا جو ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔

ڈاکٹر راز کے متعدد شعری مجموعے منصۂ شہود پر آتے رہے ہیں، نوائے راز، سواسو سانیٹ اور 'پرواز راز' مشاہیر علم وادب سے خراج تحسین وصول کرتے رہے ہیں۔

مشہور شاعر اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز سے میری پہلی ملاقات چند برس ہوئے حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی جہاں انھوں نے بین الاقوامی سمینار میں اقبال کے فکر وفن پر ایک گراں قدر مقالہ پڑھا تھا۔ اسی قیام حیدر آباد میں ان کے ساتھ اقبالیات کے موضوع پر بات چیت بھی ہوئی اور میں ان کی اقبال فہمی سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس وقت تک میں ان کے شاعرانہ کمال فن سے واقف نہ تھا۔ اس کا علم مجھے ایک دن یہیں قطر میں ہوا جب کہ انھوں نے ایک انٹرنیشنل مشاعرے میں اپنا کلام پڑھا اور دوسرے روز مجھے ان کے غیر مطبوعہ کلام کا مسودہ 'نوائے راز' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔'' (نوائے راز، ص6)

معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا:

''مغربی شاعروں میں سانیٹ کی مقبولیت خاصی رہی ہے۔ اگرچہ ادھر اس کی تنگ دامانی اور قیود کی وجہ سے اس کا رواج کم گیا ہے، اردو میں انیسویں صدی کے آخر سے جب مغرب کا اثر ہمارے شعر وادب پر پڑنے لگا تو نظم معری کے ساتھ سانیٹ پر بھی توجہ شروع ہوئی۔ اختر شیرانی اور راشد کے یہاں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں جس طرح آزاد نظم کے تجربے عام ہو گئے اسی طرح سانیٹ کے تجربے بھی ہوئے۔ ہر تجربے کو ہمدردی سے دیکھنا چاہیے کیونکہ اس کے امکانات لامحدود ہوتے ہیں اس لیے میں راز کے 'سواسو سانیٹ' کا خیر مقدم کرتا ہوں۔'' (سواسو سانیٹ ص1)

ان کے علاوہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کے بارے میں دوسرے اردو ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے خیالات وآرا بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں جن کا ذکر طولانی ہے۔ والی آسی نے کیا خوب کہا تھا کہ:

''خلیل الرحمٰن راز نے زندگی کے رازہائے سربستہ کو پانے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا ہے، انھوں نے ماہ وسال کی گردش کو اپنے لفظوں میں اس طرح اسیر کیا ہے کہ لفظوں کو ان کے معنوں ہی سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تمام تر تہہ داریوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔''

ڈاکٹر راز ایک اچھے ترجمہ نگار اور مختلف زبانوں کے کامیاب مترجم تھے، وہ عربی، انگریزی سے اردو میں بڑے سلیس وشستہ اور بامحاورہ ترجمہ کرتے تھے، انھوں نے ترجمہ وترجمانی اور ترجمہ نگاری کو ذریعہ معاش قرار دیا تھا، وہ قطر وغیرہ میں اسی شعبے سے منسلک رہے جس کی تفصیل گرچہ میرے علم میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف سخن میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے جو ان کے ایک شعری مجموعے کے سرورق پر درج ہے:

یہ کاروبار دو عالم یہ نظم بود و نبود
کسی کے ناز کا جلوہ دکھائی دیتا ہے

اور اسی زمین میں اسی غزل کے یہ شعر بھی دیکھیے اور راز کی غزل گوئی کے رنگ وآہنگ کا اندازہ کیجیے:

شکست دل کے دھندلکوں میں راز سربستہ
نشاط غم کا اجالا دکھائی دیتا ہے

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن توحید پسند تھے اور عاشق رسول تھے، انھیں مدینہ کے گلی کوچوں سے پیار تھا اور اس کے ذرہ ذرہ سے عقیدت رکھتے تھے انھوں نے متعدد نعتیں کہی ہیں اور سبھی اثر انگیز ہیں۔

ان کے مندرجہ ذیل نعتیہ کلام بھی بڑے ہی عالم جذب اور عشق رسول میں ڈوب کر کہے گئے ہیں اور اس میں راز سراپا التجا بن گئے ہیں اور کہتے ہیں:

خدا یا کاش میں طیبہ کی گلیوں کا گدا ہوتا
مسلسل نعت خواں ہوتا، سرا پا التجا ہوتا
میں اس دربار میں حاضر ہر اک صبح و مسا ہوتا
کبھی رنگیں نوا ہوتا، کبھی غمگیں صدا ہوتا
جو عصر نو کے ہاتھوں میں نظام مصطفا ہوتا
تو اس دنیائے دوں کا ذرہ ذرہ کیمیا ہوتا

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز نعت گو اور غزل گو بھی تھے، ان کے تغزل کا رنگ و آہنگ بڑا دل فریب تھا، ان کی متعدد غزلیں معیار و اعتبار پر بھر پورا ترتی ہیں اور قدیم اساتذہ کے قریب تر ہیں، ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دل ہو پژمردہ تو ہے خندۂ گل بے معنی
ہر خوشی اور غمی دل نے چھپا رکھی ہے
چاک کرتی ہے صبا صبح کو غنچوں کے جگر
یہ کہانی مجھے شبنم نے سنا رکھی ہے
غنچہ غنچہ میں ہے پوشیدہ صلیب غم دوست
کس نے پھولوں میں یہ قاتل کی ادا رکھی ہے
دردِ ہجراں کے تسلسل سے نہ گھبرا دل زار
عشق نے درد کے اندر ہی دوا رکھی ہے
اس ستمگر کا میں اے راز کروں کیا شکوہ
ہر بلا میرے لیے جس نے روا رکھی ہے

وہ ایک جہاں دیدہ اور کرب زدہ انسان تھے، انھوں نے دنیا کے المناک حالات اور کرب ناک واقعات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے، وہ جس ضمیر و خمیر کے انسان تھے خود اپنے درد و غم سے نہیں، بلکہ دوسروں کے غموں و رنجوں سے تڑپتے تھے اور دوسروں کے دردوں و غموں کو اپنا غم و درد سمجھتے تھے، ان کے کلام میں بھی زمانے کا غم و کرب جھلکتا ہے۔

انھوں نے 'اعتدال' کے عنوان سے بڑے معنی خیز اور عبرت ناک اشعار کہے ہیں جس میں جہاں زمانے کی بے راہ رویوں اور بے اعتدالیوں پر طنز ہے۔ وہیں امارت کی برہنگی اور غربت کی برہنگی میں واضح فرق بھی کیا ہے اور انسانوں کو راہ اعتدال اپنانے کا سبق دیا ہے، چنانچہ امارت اور غربت کی منظر کشی کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں:

اک بھکارن کو دیکھا کہ عریاں تھی وہ
جسم پر اس کے مطلوبہ کپڑے نہ تھے
تنگی فقر و فاقہ سے گریاں تھی وہ
اپنا تن ڈھانپ لے اتنے پیسے نہ تھے
پھر نظر آئیں کچھ دوسری لڑکیاں
تھا برہنہ بڑی حد تک ان کا بھی تن
تھیں وہ خوش حال جیسے ہوں شہزادیاں
ناز پرور وہ نازک حسیں، گل بدن
دونوں منظر مرے سامنے تھے عجب
دیر تک ان کی تحلیل میں کھو گیا
اک برہنہ امیر، اک برہنہ غریب
یا الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا
ہیں خطر ناک دونوں زوال و کمال
سب سے اچھا ہے بس جادۂ اعتدال

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کی معرکۃ الآراء کتاب 'سیرت انبیاء و حکمت مصطفےٰ' ہے۔ یہ کتاب دراصل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب الخیر الکثیر سے ماخوذ ہے، انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا قاسمی صاحب، مجھے معاصرین نے نظر انداز کیا ہے، اور آپ بھی مجھے نظر انداز کرتے رہتے ہیں مجھ پر ایک صاحب کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے، میں آپ کا بھی احترام کرتا ہوں اور آپ کے علم و فضل کا قائل ہوں، لیکن عجیب معاملہ تھا ڈاکٹر راز جب بھی سر راہ ملتے تو یہ شکایت ضرور کرتے تھے اور میں ٹالتا رہتا تھا، حالانکہ وہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے سیمناروں میں شریک ہوتے رہے ہیں، مگر اس دفعہ کچھ سنجیدہ ہو کر عرض کیا مولانا فرمائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میری خواہش ہے کہ میری کتاب کا اجراء کسی بڑے صاحب علم آدمی سے کرا دیں، میں نے کہا کہ آپ کی کتاب کا اجراء ہو جائے گا، آپ شخصیت کا انتخاب کر لیں دوران مشورہ، کئی مذہبی شخصیتوں اور کئی سیاسی شخصیتوں کا ذکر آیا، راز صاحب ان شخصیات سے راضی نہ ہو سکے تھے، اتفاق سے اسی درمیان علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے صاحب زادے پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ، ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ کچھ دنوں سے مجھ پر خاصے مہربان بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ فلاں تاریخ کو میں دہلی آ رہا ہوں، میں نے عرض کیا کہ میں دہلی میں آپ کا تھوڑا وقت لینا چاہتا ہوں، آپ نے از راہ کرم وعدہ فرما لیا، جب میں نے اس کا ذکر راز صاحب سے کیا تو وہ بہت خوش ہوئے، اب سوال یہ تھا کہ کہاں کیا جائے، بالآخر طے کیا گیا کہ یہ اجرائی تقریب تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام انجام پا جائے۔ جس سے میرا بھی تعلق رہا ہے۔ میں نے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے قدیم مخلص ذمہ دار مولانا مزمل الحق قاسمی سے رابطہ قائم کیا اور عرض کیا کہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز صاحب جب دوحہ قطر میں تھے تو تنظیم ابنائے قدیم کی بڑی مدد کیا کرتے تھے اب ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کی کتاب کا اجرا تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے دست مبارک سے ہو مولانا مزمل الحق قاسمی صاحب نے کہا کہ یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ چنانچہ تنظیم کی طرف سے منعقد تقریب میں پروفیسر سید سلمان ندوی صاحب کے دست مبارک سے اجراء عمل میں آیا، جس سے راز صاحب بہت خوش ہوئے ان کی خوشی سے مجھے بھی خوشی ہوئی۔ اور یہ اس لیے بھی کہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز میرے کرم فرما، حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی سابق مہتمم جامعہ رحمانیہ ہاپوڑ کے بڑے بھائی تھے۔ جن سے میرے دیرینہ تعلقات تھے۔ اگر مفتی جمیل الرحمٰن مرحوم موجود ہوتے تو وہ بھی مسرور ہوتے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز 14 تا 16 مارچ 2017 کو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'شاہ ولی اللہ اور تصوف' کے موضوع پر منعقد سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار میں شریک ہوئے تھے۔ سیمنار راز صاحب کو پسند آیا تھا، انھوں نے اس سیمنار کے انعقاد پر ایک تفصیلی تاثراتی رپورٹ مرتب فرمائی تھی اور ماہنامہ براہین میں اشاعت کے لیے عنایت فرمائی تھی، یہ تفصیلی رپورٹ براہین میں شائع ہو چکی ہے، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز ماہنامہ براہین کے لیے سخت علالت کے باوجود کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی غریب خانہ پر تشریف لا کر عصری مسائل پر تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ 14 اکتوبر 2017 کو صبح فون آیا کہ میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں اور آپ کی کتاب نقوش خاطر پر تبصرہ بھی لکھ دیا ہے، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آج گومتی سے علی گڑھ جا رہا ہوں، 5 اکتوبر کو مسلم یونیورسٹی میں ایک سیمنار ہے، اور 6 تاریخ کو مجھے ناگپور بھی جانا ہے، 7 کو ناگپور سے واپسی ہوگی، اس کے بعد ملاقات ہوگی، اسی دوران 10 کو ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کے چھوٹے بھائی مولانا جمیل الرحمٰن ندوی کا فون آیا کہ مولانا خلیل الرحمٰن راز صاحب کا 9 اکتوبر کو ہولی فیملی اسپتال میں انتقال ہو گیا اور ابوالفضل انکلیو کے نئے قبرستان میں تدفین ہوئی ہے۔ یہ اندوہ ناک خبر سن کر سناٹے میں آ گیا مجھے افسوس بھی ہوا کہ اگر بر وقت اطلاع ہوئی ہوتی تو ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہو جاتا، لیکن یہ سعادت میرے حصے میں نہ تھی، اللہ مغفرت کرے عجیب مرد درویش تھے۔

■

Mr. Ataurrahman Qasmi
N-80/C, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

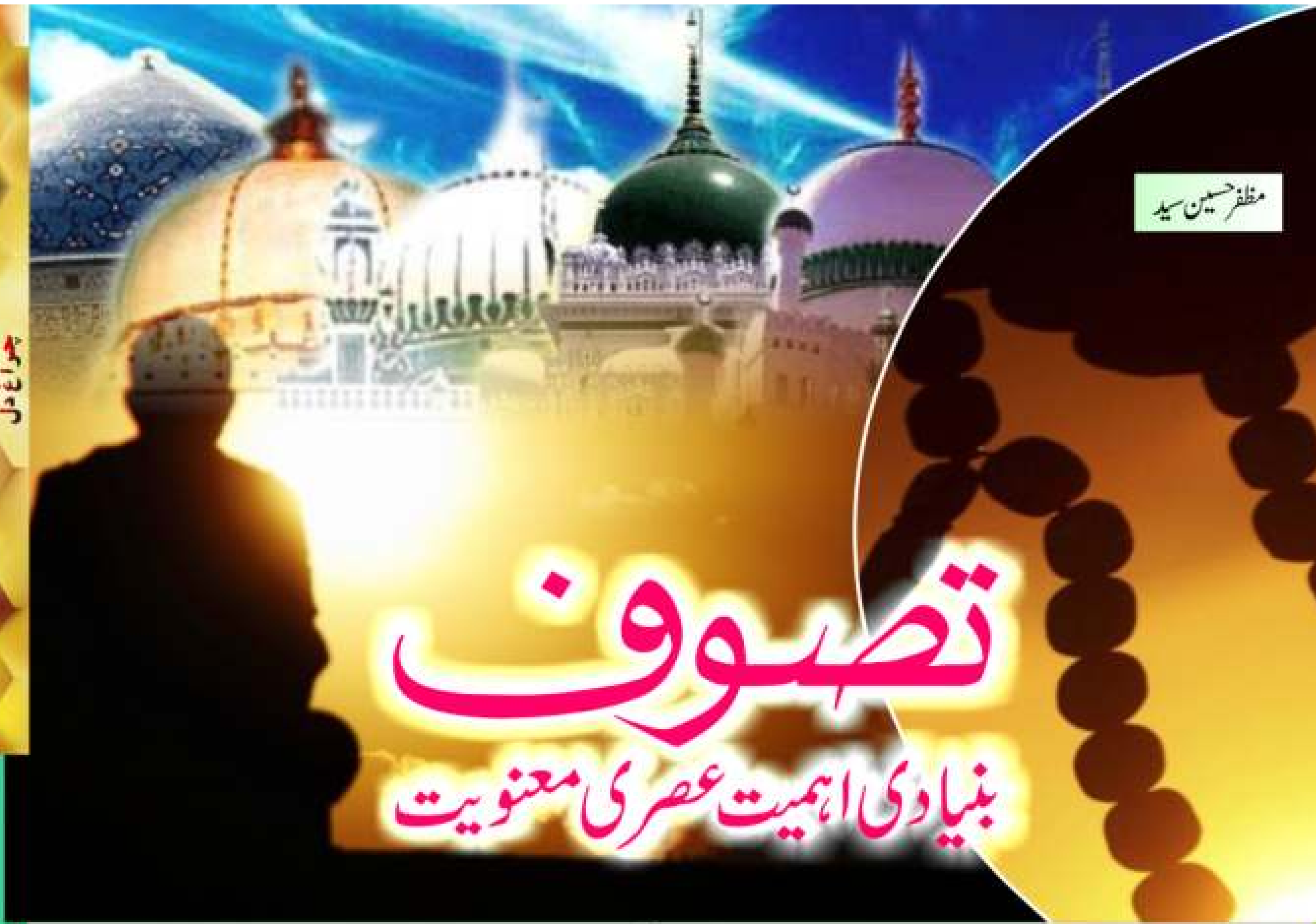

تصوف

بنیادی اہمیت عصری معنویت

مظفر حسین سید

ع۔ عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بت کدۂ تصورات

• حکیم الامت علامہ اقبال کا یہ قول صادق ہے۔ یہاں تصوف کی تعریف بیان کرنا لازم نہیں، کہ یہ سب کچھ کتابوں میں موجود ہے، نیز اہالیان علم کو اس امر کا بخوبی ادراک ہے۔ دراصل، تصوف، انتہائے عشق پر مرکوز ہے تصوف عشق ہے اور عشق تصوف۔ اس دعوے کی تائید میں چند اشعار پیش ہیں، پہلا شعر حضرت امیر خسروؒ کا ہے۔

خسرو دریا پریم کا، الٹی وا کی دھار
جو ابھرا، سوڈوبا، جوڈوبا سو پار

حضرت امیر خسرو نے تصوف کی تعریف چند الفاظ میں بیان فرمادی ہے عشق کی رو، اس کا بہاؤ، دنیا اور زمانے کے برعکس ہے۔ یہاں جو ہارا، وہ جیتا اور جو جیتا وہ ہارا۔ یہاں خود کو مٹانا پڑتا ہے، اور مٹنے کے بعد ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ یہی تصوف کا عطر ہے۔ اسی ذیل میں ایک شعر ہے، ذرا غور فرمایئے:

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا، میں پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا میں تیری

جیسا کہ عرض کیا۔ یہ ایک جہان دگر ہے۔ یہاں ہار میں جیت چھپی ہے اور فتح میں شکست پوشیدہ ہے۔ اسی بات کو ذرا علمی انداز میں سمجھیں تو، فنا فی الذات، فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا فلسفہ یہی ہے۔ یہی تصوف کی شرط اوّل ہے، اور یہی تصوف کی معراج ہے۔

اپنے سے برتر میں ضم ہوجانا۔ نفس پر قابو پالینا، خودی کو مٹا دینا۔ یعنی 'میں'، کو یکلخت ختم کرینا، خود کو فنا کر دینا، یہی معراج عشق ہے۔ دراصل خود کو مٹا کر ہی منزل ملتی ہے۔

دور جدید میں عرفان الٰہی یعنی وجود باری تعالیٰ کی فہم کی کوشش تو بہتوں نے کی ہے، مگر پتہ نہیں کسی کی سمجھ میں آیا کہ نہیں، دراصل یہ ادراک نہ تو اکتسابی علم سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ عقل و دانش کی ذہنی مشق سے۔ اس کے لیے تو کچھ اور ہی وصف اور کوئی اور ہی علم درکار ہے، بقول مولوی اسماعیل میرٹھی، ع۔ جاتی ہے عقل یہاں آئی ہوئی — خواجہ میر درد میدان تصوف کے بڑے شاعر ہیں، مگر وہ بھی حیران ہیں، فرماتے ہیں۔

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اور اس موضوع پر علامہ اقبال یوں سخن آرا ہیں۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اکبر الہ آبادی نے اس سلسلے میں فرمایا۔

عقل میں جو گھر گیا، لا انتہا کیوں کر ہوا
جو سما میں آگیا، پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

ستم ظریفی یہ ہے کہ جس نے سمجھ بھی لیا، وہ کسی دوسرے کو سمجھا نہ سکا، کہ اس کے لیے توفیق الا اللہ بھی درکار ہے۔ بہ زبان علامہ اقبال۔

وہ حرف راز، جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نطق جبرئیل دے، تو کہوں

دراصل روحانی امور کا معاملہ یہ ہے کہ، جو ان کی حقیقت تسلیم کرتا ہے، اس کو کسی دلیل کی حاجت نہیں اور جو، سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا اسے کوئی دلیل قائل نہیں کرسکتی۔ بقول سراج لکھنوی

کچھ عقل کے متوالے، کچھ عشق کے دیوانے
پرواز کہاں تک ہے کس کی، یہ خدا جانے

سنت کبیر نے اسی بات کو اپنے خاص انداز سے کہا ہے۔

مالا پھیرت جگ بھیا، پھرا نہ من کا پھیر
کرکا منکا ڈار دے، من کا منکا پھیر

یعنی ہاتھ کا دانا پھینک دے، اور قلب کا دانا گردش میں لا، تبھی کچھ حاصل ہوگا۔ تصوف دراصل واردات قلبی کا کھیل ہے۔ صرف تسبیح پڑھنے سے خدا نہیں ملتا۔ ذکر الٰہی تو دل سے ہوتا ہے۔ سچ کہیں تو یہی تصوف کا نشاستہ ہے، جسے اس عظیم شاعر نے بڑی سادگی سے بیان کردیا ہے۔

تصوف کوئی نئی چیز نہیں، اور نہ یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہوسکتا ہے۔ آپ اسے احسان کہیے، روحانیت کہیے یا تصوف، اس کا وجود قرن اوّل سے ہے۔ تصوف کی صحیح تعریف پر تکیہ کیجیے تو تمام انبیا کرام صوفی تھے، کہ جس کا قلب صاف ہے، جس کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا گزر

نہیں وہ صوفی صافی ہے، ولی ہے، اللہ کا دوست ہے۔ یوں غور کیجیے تو ہمارا سلسلۂ تصوف ہادیٔ اعظم، سید الانبیا، سرکار دو جہاں رسول اکرم تک پہنچتا ہے۔ تصوف کے سب سے بڑے علم بردار خود سرکار دو عالم ہیں۔ تمام صحابہ تصوف اور صوفیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

رسول معظم اور صحابۂ باکریم کے بعد تابعین، تبع تابعین ومتقدمین کے توسّل سے یہ سلسلہ متاخرین تک پہنچا، اور تصوف یا روحانیت کے پرچم برداروں کو ولی اور صوفی قرار دیا گیا۔ یہ سلسلہ کم وبیش پندرہ سو برسوں سے جاری ہے اور تا قیامت رہے گا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کسی نورانی محفل میں موجود حضرات میں کوئی ولی کامل ہے، یا نہیں، اس لیے کہ تعلیمات کے مطابق ہر چالیس مومنین کے گروہ میں ایک ولی ضرور ہوتا ہے۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ کے سوا کچھ نہیں، کسی کا قیام نہیں، کسی کا خیال نہیں، وہ ولی ہے، اہل اللہ ہے۔

اس ضمن میں ایک تذکرہ حضرت رابعہ بصری سے متعلق ہے۔ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ''آپ شیطان سے نفرت کرتی ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ کی محبت نے میرے دل میں اتنی جگہ ہی نہیں چھوڑی ہے کہ اس میں کسی اور کی محبت یا نفرت سما سکے''۔ یہ معرفت کی اعلیٰ ترین منزل تھی اور تصوف کی معراج۔ جب منصور حلاج نے 'انا الحق' کا نعرہ لگایا تو نہ کوئی دنیا دار سمجھا، نہ اصحاب شریعت۔ مگر بات تھی درست کہ جب بندہ اللہ کی ذات میں مدغم ہوگیا، ضم ہوگیا تو پھر افتراق کہاں۔ مگر اقتدار کے نشے میں چور حاکم اور اکتسابی علم کے حامل علما اسے کہاں سمجھتے۔ غالب نے بھی تو یہی کہا ہے۔ کہ، ع۔ عشرت قطرہ ہے، دریا میں فنا ہوجانا۔

کچھ یہی معاملہ شیخ سرمد شہید کا تھا۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ جب بندہ راہِ عرفان پر گامزن ہوتا ہے تو اس کا سفر انکار سے شروع ہوتا ہے اور ایک طویل مسافرت کے بعد اقرار تک پہنچتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی میں دنیا کے تمام معبودوں: دولت، عشرت، حکومت، اقتدار، طمع اور غرور جیسے دنیاوی معبودوں کے مکمل انکار کے مرحلے میں ہوں، تو معبود حقیقی کے وجود کا اقرار کیسے کروں۔ پھر وہی بات دہرانا پڑے گی کہ اکتسابی علم، اور ظاہری فہم والے ارباب حکومت اور ان کے حاشیہ بردار علما، سرمد کی اس عمیق فکر تک کہاں پہنچ سکتے تھے۔ نتیجتاً ان کا انجام بھی وہی ہوا، جو منصور کا ہوا تھا، فرق یہ تھا کہ وہاں سولی تھی اور یہاں شمشیر بے نیام۔

صاحب 'کشف المحجوب'، حضرت ابوالحسن علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ ہر اہل تصوف کے لیے لازم ہے کہ وہ اولاً خود کو تمام تر غیر اللہ سے منقطع کرے، دل کو دنیا کے خیال سے خالی کرے، اس کے بعد ہی وہ خود کو معبود حقیقی سے منسلک کرسکتا ہے۔ شیخ سرمد کا فلسفہ بھی یہی تھا۔ یاد رہے کہ ان واقعات سے ہزار پندرہ سو برس قبل یہی انجام، فلسفیٔ اعظم سقراط کا ہوا تھا، جو اگرچہ مومن نہ تھا مگر اپنی فہم وفراست، اپنی دانش اور اپنے علم کی بنیاد پر جسے حق سمجھتا تھا، اس پر قائم تھا۔ اور سرمد سے کوئی دو صدی قبل یہی انجام میرابائی کا ہوا تھا، جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ جسے لائق عقیدت وپرستش خیال کرتی تھی اس کے سوا کسی اور طرف متوجہ نہ ہوسکتی تھی۔

علمبرداران حق کا انجام تو یہی ہوتا ہے، زمانہ کوئی ہو، حاکم کوئی ہو۔ ظالم اور مظلوم بدل جاتے ہیں مگر ظلم قائم رہتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ دور حاضر میں یہ مرحلہ اور مشکل ہوگیا ہے۔

تصوف کا سفر منزل بہ منزل اور درجہ بدرجہ ہے۔ اس کم سواد کے محدود علم کے مطابق تصوف، شریعت سے طریقت، طریقت سے حقیقت اور حقیقت سے معرفت تک کا سفر ہے اور عرفان حق، یعنی وصل معبود حقیقی، اس کی منزل آخر ہے۔ یہ فنا فی اللہ کی منزل ہے۔ لیکن اصل سفر اس کے بعد کا ہے، جب کوئی صوفی اپنی منزل کے حصول کے بعد اس عالم ظاہری میں واپس آتا ہے اور سالک کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے، تبھی اصل امتحان سامنے آتا ہے۔ کمال تو یہی ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہوکر، ضرورت کو ضرورت تک محدود رکھ کر، تعیش وعشرت سے گریز اور پرہیز کرکے زندگی بسر کی جائے، حقوق اللہ کے شانہ بہ شانہ حقوق العباد بھی ادا کیے جائیں، تب تو بات ہے۔ یہ بقا باللہ کا مرحلہ ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس طریق زندگی کا اختیار کرنا ترک دنیا سے کہیں بڑا کارنامہ ہے، نیز اصل سنت رسول یہی ہے، طریق صحابہ کرام یہی ہے۔ جو اس کسوٹی پر کھرا اترے گا وہی اصل کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے اور اس کے مزید اظہار و اعتراف کی ضرورت نہیں کہ دنیا میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص، امن وآشتی کا پیغام صوفیاء کرام نے ہی دیا، اور حق کی روشنی کو شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ ومسکن در مسکن عام کیا۔ پورے برصغیر یعنی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بزرگان دین وکبائر تصوف کے آثار آج بھی نمایاں ہیں۔ ان کے نشان بلند اور آستانے روشن ہیں۔ ہر شہر، ہر قریہ اور ہر موضع میں کثیر تعداد میں عظیم ترین بزرگ اور صوفیاء آرام فرما ہیں اور ان کا فیض آج بھی جاری وساری ہے۔ ان کا پیغام آج بھی زندہ اور ان کی تعلیمات آج بھی تابندہ ہیں۔

ان کی ہدایات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ کبائر اسلام، اور مشائخ تصوف کے علاوہ سرزمین ہند، ہندو سادھوسنتوں، بودھ رشیوں، جین مینوں اور سکھ گروؤں کا میدان عمل رہی ہے۔ تمام مذاہب بنیادی طور پر بقائے باہم، نیز فلاح انسانی کے علم بردار ہیں۔ مذہبی رواداری کی مثال، اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ سکھ مذہب کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب میں جن اکابرین کا کلام شامل ہے، ان میں بابا گرونانک دیو کے علاوہ کل نو سکھ گیانی ہیں، اور ہندو بھگت پانچ، جبکہ مسلمان صوفی شعرا کی تعداد پندرہ ہے۔ جن میں سرفہرست بابا صاحب، حضرت فریدالدین گنج شکر کا کلام ہے۔ حضرت فریدالدین گنج شکر کی حکمت

و دانشوری سے کون انکار کرسکتا ہے۔ وہ راہِ تصوف کے محالات کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

فریدا درویشی گاکھڑی چلاں ڈنی آں وت
بانہی اٹھائی پوٹلی، کتھے ونجھاں گھت

(حوالہ: سلوک بابا شیخ فرید)

اور یہ بھی ایک روشن مثال ہے کہ دربار صاحب یعنی سنہرے مندر کا سنگِ بنیاد کسی سکھ یا ہندو نے نہیں بلکہ ایک مسلمان صوفی، میاں میر نے رکھا تھا۔ یہی میاں میر، شہزادہ داراشکوہ کے مرشد تھے، وہی داراشکوہ جو شیخ سرمد کا بھی ارادت مند تھا۔ اور جس نے 'سفینۃ الاولیا اور مجمع البحرین' جیسی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کی ہیں۔

راقم کی ناقص رائے میں تصوف کی روح یہ ہے کہ انسان کی زندگی فلاحِ ملّت و معاشرہ کے لیے وقف ہو۔ اور اس کی تمام تر عبادت و ریاضت خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے ہو، کسی دنیاوی منفعت تو کیا، انعام واکرام اخروی کے لیے بھی نہ ہو۔ اپنی اس بات کے ثبوت میں حضرت رابعہ بصری، جو صوفیائے عظام کی صف میں شامل واحد خاتون ہیں، نیز ان کی فضیلت وفوقیت سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا، ان سے وابستہ ایک واقعہ پیش ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا برتن اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل لیے بازار سے گزر رہی تھیں، کسی نے دریافت کیا کہ ''یہ کیا ماجرا ہے'' تو انھوں نے بہ آواز بلند فرمایا، ''میں اس مشعل سے جنت کو نذرِ آتش کرنے اور پانی سے جہنم کی آگ کو سرد کرنے جارہی ہوں''۔ دریافت کیا گیا کہ ''اس کا مقصد؟'' تو انھوں نے جواباً کہا، ''تاکہ لوگ جنت کی طمع اور دوزخ کے خوف سے عبادت نہ کریں، بلکہ خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے یہ عمل کریں۔'' پس ثابت ہوا کہ عبادت و ریاضت کا اصل مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہی ہونا چاہیے، اور تصوف کی تعلیم یہی ہے۔

سچائی یہ ہے کہ عرفانِ الٰہی سے قبل عرفانِ ذات لازم ہے۔ آدمی پہلے خود کو تو پہچانے، تبھی تو خدا کو جاننے اور پہچانے کے لائق ہوگا۔ اقبال نے بھی یہی کہا ہے کہ اگر اپنے بن جاؤ گے تو پھر معبودِ حقیقی کے بھی بن سکو گے۔ ان کا مشہور شعر ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

یعنی خالق کو تلاش کرنا ہے تو اپنے قلب کے اندر، اتر کر تلاش کیجیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ کے قریب ہوں۔ یعنی ہمارا معبودِ حقیقی خود ہمارے اندر جاگزیں ہے۔ اور ہم اسے دنیا بھر میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، تو اس طرح کیسے ملے گا۔

سنت کبیر کہتے ہیں۔

جن کھوجا تن پائیاں، گہرے پانی پیٹھ
میں بپورا جو ڈن ڈرا، کنارے بیٹھ

یعنی جو تلاش کریگا، منزل مقصود اسی کو ملے گی اور یہ گہرا پانی کچھ اور نہیں، خود اپنی ذات ہے۔

تصوف ہمیں اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جینے کا سبق دیتا ہے۔ اگر ہمیں ایک نیا معاشرہ بنانا ہے، دنیا جیسی ہمیں ملی ہے اس سے بہتر حالت میں اسے چھوڑ کر جانا ہے۔ تو ہمارے لیے تصوف کی راہ اختیار کرنا، اس کی پناہ میں جانا ہی، واحد راستہ ہے۔ دونوں جہان میں خیر چاہیے، نجات چاہیے تو تصوف اور روحانیت کا راستہ موجود ہے اور اگر تباہی و بربادی مقصود ہے تو راستے بہت سے ہیں۔ اب ہم حسب توفیق جسے اختیار کریں۔

ایک برگزیدہ صوفی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ 'اللہ تعالیٰ نے تمام خیر اور فلاح ایک مکان میں بند کرکے اسے مقفل کر دیا ہے، جس کی کلید عبادت اور معبودِ حقیقی کی یاد ہے۔ اور دوسری جانب اس نے تمام شر اور برائی کو ایک اور مکان میں بند کرکے مقفل کردیا ہے، جس کی کلید دنیا اور اس کی محبت ہے۔' اب انسان، جس قفل کی کلید یعنی چابی حاصل کرلے، وہی کھول لے اور فیصلہ خود انسان کو کرنا ہے۔ راستہ بتانے والے اب بھی بہت ہیں۔ ہمارے علماء ومشائخ، رشد و ہدایت کے لیے آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ کوئی سنے، جانے اور مانے تو۔

عہد حاضر، مادیت کا عہد ہے ہر سو، صارفیت کا دور دورہ ہے۔ سائنس اور دیگر علوم جدید نے بظاہر تو زندگی کو سہل اور آسان بنادیا ہے۔ مگر درحقیقت بنی نوع انسان کی مشکلات ومصائب میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ آج طمع، حرص وحسد، دور قدیم اور عہد وسطیٰ کے مقابلے میں آسمان پر ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اصل طریق زندگی وہی ہے جس کا درس تصوف دیتا ہے۔ اس سنگلاخ زمانے میں انسان کی آخری پناہ گاہ تصوف ہی ہے۔ حدِ نظر تک ایک لامحدود ریگستان ہے، مگر اس میں کہیں کہیں نخلستان اب بھی ہیں۔ فلاح و بہبود کے یہی جزیرے، ہماری جائے قیام ہوسکتے ہیں۔ اور ان میں ایستادہ شجر سایہ دار ہمیں سایہ فراہم کرسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں تمام علمی، فنی و تکنیکی ترقی کے باوصف، انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے بیشتر سوالات کے جواب میں، جدید علوم خاموش ہیں۔ یہ سوالات انسان کے وجود، بقاء اور فنا کے باب میں ہیں، جن کا جواب صرف اور صرف تصوف کے پاس ہے۔ اس لیے ہمیں تصوف کی شدید ضرورت ہے۔ دراصل تصوف ہمیں دنیاوی حجابوں اور نقابوں کے اس پار بھی دکھاتا ہے۔ اور ہمیں تاریکی کے پردوں کو چاک کرکے حقیقت کی روشنی دیکھنے کے لائق بناتا ہے۔ جہاں تک فلسفہ جدید اور علوم جدیدہ، یعنی سائنس کی رسائی ہے، تصوف ہمیں اس سے بھی کہیں آگے، تصورات سے بھی ماورا، حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ کہ آج مشرق و مغرب کے متعدد جدید علوم کے حامل، اصحاب نظر تصوف کی حمایت اور وکالت میں مصروف ہیں اور مادیت پرستی کے مقابلے میں برملا، تصوف کا دفاع کررہے ہیں۔ سردست مزید تفاصیل کی گنجائش نہیں کہ تنگیٔ صفحات کا مسئلہ حائل ہے۔ لہٰذا، اختتامِ گفتگو کے طور پر علامہ اقبال کا ہی ایک شعر پیش خدمت ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

■

عہد حاضر، مادیت کا عہد ہے ہرسو، صارفیت کا دور دورہ ہے۔ سائنس اور دیگر علوم جدید نے بظاہر تو زندگی کو سہل اور آسان بنادیا ہے۔ مگر درحقیقت بنی نوع انسان کی مشکلات و مصائب میں اضافہ ہی ہو ا ہے۔ آج طمع، حرص و حسد، دور قدیم اور عہدوسطیٰ کے مقابلے میں آسمان پر ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اصل طریق زندگی وہی ہے جس کا درس تصوف دیتا ہے۔ اس سنگلاخ زمانے میں انسان کی آخری پناہ گاہ تصوف ہی ہے۔ حدّ نظر تک ایک لا محدود ریگستان ہے ,مگر اس میں کہیں کہیں نخلستان اب بھی ہیں۔ فلاح و بہبود کے یہی جزیرے، ہماری جائے قیام ہوسکتے ہیں۔ اور ان میں ایستادہ شجر سایہ دار ہمیں سایہ فراہم کرسکتے ہیں۔

Dr Muzaffar Husain Syed (M.H. Syed)
Head, Academic Research Bureau
29/11, Sir Syed Road, Darya Ganj
New Delhi-110002
Cell: 9818827853, 92116366940
E-mail: syedmh92@yahoo.com
syedmh92@gmail.com

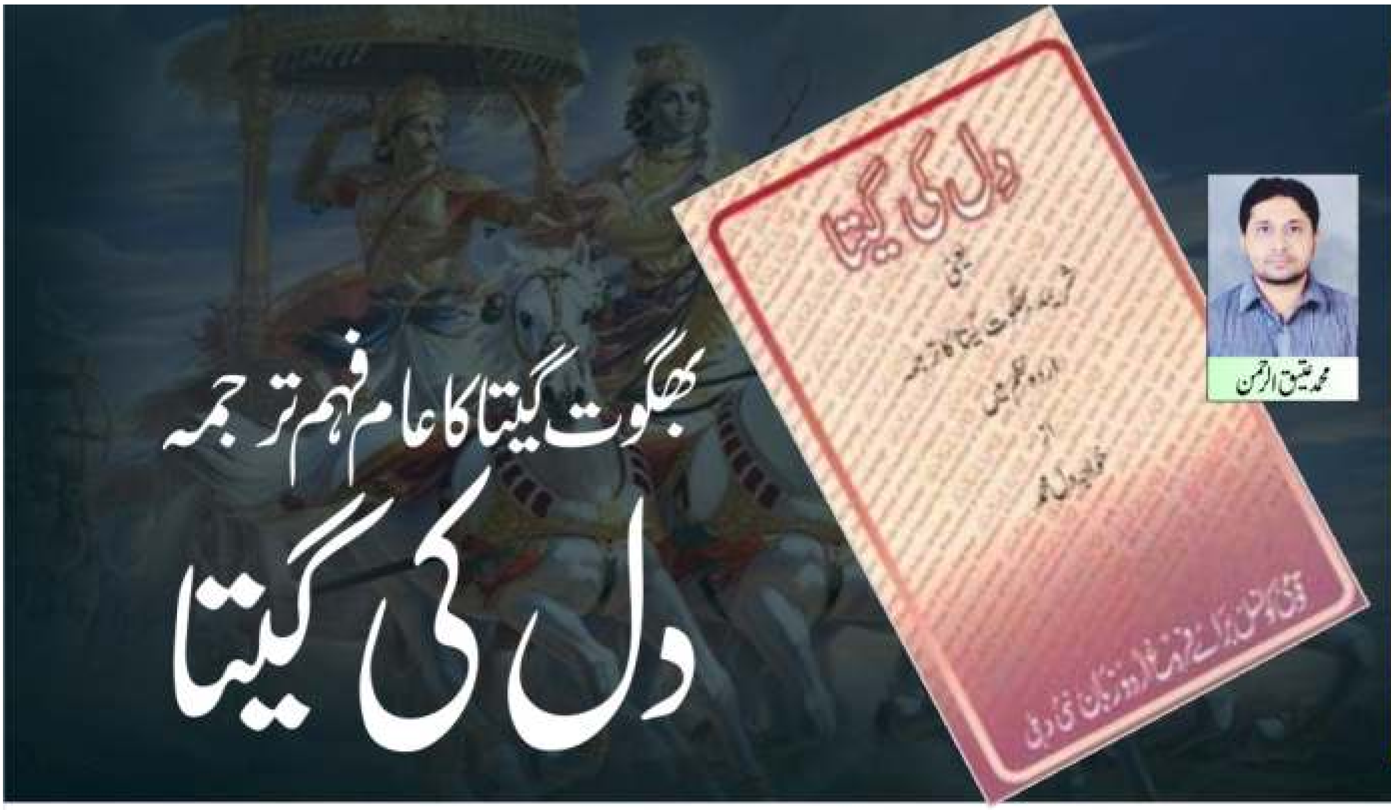

دل کی گیتا

بھگوت گیتا کا عام فہم ترجمہ

محمد عتیق الرحمن

خواجہ دل محمد صاحب کا شمار اردو دنیا کی مشہور و معروف ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ خواجہ دل محمد صاحب ایک بہترین مصنف کے ساتھ ساتھ ایک ماہر مترجم بھی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے قوم و ملت کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں فیلوشپ، سب رجسٹرار لاہور، پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے علاوہ دیگر اہم عہدوں پر فائز رہے۔ دل محمد صاحب نے ہندو بھگوت گیتا کا اردو زبان میں 'دل کی گیتا' کے عنوان سے منظوم ترجمہ کرکے گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ دل کی گیتا کا پہلا ایڈیشن 1940 میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور کسی مذہبی کتاب کا منظوم ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔

خواجہ صاحب نے بھگوت گیتا کا اردو زبان میں ترجمہ کرکے اردو داں طبقے پر بڑا احسان کیا۔ ان کے اس کام سے ہندو دھرم کے بارے میں صرف ان کی ذاتی دلچسپی ظاہر نہیں ہے بلکہ اس کثیر المذاہب ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضاء کو قائم رکھنے کے لیے ایک ناقابل فراموش خدمت ہے۔

خواجہ دل محمد صاحب کا ترجمہ 'دل کی گیتا' کو عام مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب 'بوستان ادب' کافی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سکھ طبقے کی جلیل القدر بزرگ ہستی گرونانک جی کے کلام کا اردو زبان میں 'جپ جی سکھ منی صاحب' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، جس کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ دل محمد صاحب کی ادبی خدمات کے عوض پنجاب گورنمنٹ نے انھیں انعام سے بھی نوازا ہے۔ دل محمد صاحب نے اردو زبان میں گیتا کا ترجمہ کرکے شری کرشن جی کے پیغام کو عوام اور خواص خصوصاً اردو داں طبقے تک پہنچانے کی ایک عمدہ کوشش کی ہے۔

مترجم نے کتاب کے ابتدائی حصے میں مختلف ماہرین کی آرا کو بھی شامل کیا ہے۔ ہندو فلسفہ اور مذہب کے بارے میں گہری واقفیت رکھنے والی شخصیتوں نے موصوف کے کام کو کافی سراہا ہے۔

ڈاکٹر لکشمن سروپ پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور نے ترجمہ سے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:

''میں نے آپ کے منظوم ترجمہ کے بہت سے ادھیائے پڑھے مجھے تعجب ہوا کہ آپ نے اس کام کو کس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ آپ نے نہ فقط سنسکرت کا صحت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ بلکہ اصلی روح مضمون کو قائم رکھا ہے۔ یہ نہ فقط گیتا کا خوبصورت ترجمہ ہے بلکہ اردو علم و ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ میں آپ کو اس عالیشان کامیابی پر پر خلوص دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں''۔

(خواجہ دل محمد، دل کی گیتا، خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور، 1945)

جناب خواجہ صاحب نے ترجمہ میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی یا اضافہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے معنی و مفہوم کی ادائیگی میں اپنی طرف سے کچھ جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ دل محمد صاحب کا یہ ترجمہ دراصل سنسکرت زبان میں موجود اصل بھگوت گیتا کی صحیح ترجمانی ہے۔ ہندو فلسفہ کے ماہر پنڈت ٹھاکر دت شرما نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

''دل کی گیتا کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی اس واسطے ہوئی ہے کہ یہ اردو نظم، گیتا کا سچا ترجمہ ہے۔ ایک ایک لفظ کا مناسب ترجمہ کیا ہے۔ کوئی بات اپنی طرف سے ترجمہ میں جوڑی نہیں گئی اور پھر بھی نظم کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا اور جہاں سے شروع کریں چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ فاضل مترجم کو میں سچے دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔'' (خواجہ دل محمد، دل کی گیتا ص نمبر 8)

ترجمہ نگاری بہت ہی محنت طلب کام ہے۔ اس کام کو وہی افراد یا اشخاص بخوبی انجام دے سکتے ہیں جو اصل متن کے معنی و مفہوم اور نفس مضمون کے پس منظر کے ساتھ زبان اور متن کے مطالب و دیگر تمام چیزوں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہوں۔ موصوف کے کام کی ستائش کرتے ہوئے ایک اور معروف شخصیت دیوان بہادر دیوان کرشن کشور صدر سناتن دھرم سبھا لاہور نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''مجھے اس کتاب کے مطالعہ سے از حد مسرت ہوئی۔ عالم فاضل مترجم نے اصل پستک کے خیالات کو اپنی نظم میں قائم رکھنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ترجمہ شلوک وار ہیں' خواجہ صاحب کو ان کی اس کامیاب کوشش پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

(خواجہ دل محمد، دل کی گیتا ص نمبر 7)

خواجہ دل محمد صاحب کی کتاب کی اہم خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انھوں نے کتاب کے ابتدائی

حصے میں گیتا کی تعلیمات کا خلاصہ بہت ہی جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت گیتا کے نفس مضمون اور فلسفہ حیات کو بے لاگ انداز میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جیسا کہ گیتا کی تعلیمات میں خدا کی ذات اور اس کی فطرت سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔ گیتا میں وحدت اور کثرت کے اصول کے متعلق بھی سمجھایا گیا۔ شری کرشن جی نے ارجن کو روح (آتما) کے بارے سمجھانے کے لیے عمدہ نصیحتیں کی ہیں۔ خواجہ دل محمد صاحب نے شری کرشن جی کے پیغام کو بہت ہی دلنشین انداز میں پیش کیا۔

دوسرے باب کے شلوک نمبر 23 اور 24 میں روح کے متعلق یہ کہا گیا کہ:

کٹے گی نہ تلوار سے آتما
جلے گی کہاں نار سے آتما
نہ گیلی ہو پانی لگانے سے یہ
نہ سوکھے ہوا میں سکھانے سے یہ

(دوسرا ادھیائے شلوک نمبر 23، ص نمبر 84)

ایک اور شعر پیش ہے:

نہ کٹ ہی سکے اور نہ جل ہی سکے
نہ سوکھے نہ پانی سے گل ہی سکے
قدیم اور اٹل بھی دائم بھی ہے
محیط جہاں کو تغیر زوال

(دوسرا ادھیائے، شلوک نمبر 24، ص نمبر 85)

خواجہ دل محمد صاحب کی کتاب کی اہم خصوصیات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہوں نے کتاب کے ابتدائی حصے میں گیتا کی تعلیمات کا خلاصہ بہت ہی جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت گیتا کے نفس مضمون اور فلسفہ حیات کو بے لاگ انداز میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جیسا کہ گیتا کی تعلیمات میں خدا کی ذات اور اس کی فطرت سے متعلق تعلیم دی گئی ہے۔ گیتا میں وحدت اور کثرت کے اصول کے متعلق بھی سمجھایا گیا۔ شری کرشن جی نے ارجن کو روح (آتما) کے بارے سمجھانے کے لیے عمدہ نصیحتیں کی ہیں۔ خواجہ دل محمد صاحب نے شری کرشن جی کے پیغام کو بہت ہی دلنشین انداز میں پیش کیا۔

مشکل الفاظ کو سمجھانے کے لیے فٹ نوٹ میں اس کے معنی و مفہوم کا بھی اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے حاشیے میں کٹھن الفاظ کے معنی درج کر کے قارئین کے لیے بڑی سہولت فراہم کی ہے۔

اس کے علاوہ مترجم نے ابواب کے ترجمے سے قبل تمہیدی کلام میں نفس مضمون کے اہم موضوعات سے متعلق وضاحتی تحریر پیش کی ہے۔ جیسا کہ

''آتما (روح) یہ قائم' دائم' باقی۔ بچپن میں بھی وہی' جوانی میں وہی' بڑھاپے میں بھی وہی، بے تغیر، بسیط یہی اصل چیز ہے۔ انسان نہ تن کا نام ہے نہ من۔ یہ اسی آتما (روح) کا نام ہے اور یہ روح لازوال ہے۔''

(ص نمبر 24)

خواجہ دل محمد صاحب نے ہر باب کے آغاز یا اختتام میں متعلقہ باب کا جامع خلاصہ پیش کیا ہے، جس سے قاری کو متن کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ مثال کے طور پر تیسرے ادھیائے (باب) کے اختتام پر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

تیسرے ادھیائے (باب) کے اختتام پر خلاصہ پیش کیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

''اس ادھیائے میں ذوق عمل کا سبق دیا گیا ہے۔ کرم (عمل) کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے لیے عمل ضروری ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ عمل کرتے ہوئے حواس کو قابو میں رکھے۔ ہر کام محبت اور نفرت کے جذبات سے بالاتر ہو کر سرانجام دے۔ خواہشات نفسانی کو زندگی کی قربان گاہ پر قربان کرے۔ زندگی کو مسلسل یگیہ یا قربانی سمجھ کر پھل کی خواہش اور لگاؤ نہ رکھے۔ سب کام خدا کے لیے کرے۔ سب جانداروں کو دیوتاؤں کو دیوتا کی شکل میں دیکھے ان کی خدمت کرے اور ان سے خوش ہو۔ زندگی کی خدمت کے لیے ہے اور فقط بے لوث خدمت کے لیے۔''

(تیسرا ادھیائے کرم یوگ (راہ عمل)، ص 117)

گیتا کے ترجمہ میں دل محمد صاحب کی فصاحت زبان اور انداز بیان کو کافی پسند کیا گیا اور زبان اور بیان کی خوبیوں کی وجہ ان کا ترجمہ مقبول عام ہوا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بات غلط نہیں ہوگی کہ اردو ادب اور ہندو مذہبی کتب کے تراجم کی دنیا میں دل محمد صاحب کے ترجمہ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ موصوف کا کلام، حسن زبان اور لطافت بیان سے مالامال ہے۔ زبان پر خواجہ صاحب کو اس قدر غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ کہیں بھی زبان کی شستگی و صفائی، روانی اور فصاحت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

جیسا کہ گیتا میں نجات کے لیے تین راستے بتائے گئے ہیں۔ (1) راہ عرفان (گیان مارگ) (2) عشق و محبت کی راہ (بھگتی مارگ)۔ (3) راہ عمل (کرم مارگ)

راہ عرفان کے تحت یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب انسان کو پرماتما کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس سے عجیب و غریب اعمال کا صدور ہوتا ہے۔ بلکہ ہر کسی کے لیے رحمت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کے حالات اور واقعات کا گیانی (عارف) کی زندگی میں کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس پیغام کو جناب خواجہ دل محمد صاحب نے اپنے منفرد انداز میں بیان کیا ہے:

وہ عارف خدا میں رہے استوار
نہ الجھن جسے ہو نہ دل بے قرار
مسرت جو پائے تو شاداں نہ ہو
مضرت جو پہنچے پریشاں نہ ہو

(پانچواں ادھیائے شلوک 20، ص نمبر 141)

کرشن جی کے اسی پیغام سے متعلق جناب دل محمد صاحب اپنے تمہیدی بیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جس کو گیان حاصل ہو جائے اس کی دنیا ہی نرالی ہو جاتی ہے وہ دن رات خدا کے خیال میں مست رہتا ہے۔ اس کے دل میں سکون ہوتا ہے اور دکھ سکھ کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔'' (ص نمبر 47)

اسی سے متعلق مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

''گیان (عرفان) حاصل کرنے سے انسان کے اعمال نرالے رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ وہ سرتا پا چشمہ رحمت بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے خدائی فیضان تمام مخلوق کو پہنچنے لگتا ہے۔ اعمال کی سزا و جزا کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے تمام اعمال جل جاتے ہیں۔'' (ص نمبر 49)

شری کرشن جی نے نجات کے لیے ایک اور راستے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ وہ ہے پرماتما (خدا) کے ساتھ عشق و محبت کا راستہ یعنی (بھگتی مارگ)۔ گیتا میں اس عنوان کے حوالے سے جو نصائح و ہدایات ملتی ہیں۔ اس کو سمجھانے میں مترجم کتاب نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ انھوں نے سادہ زبان اور عام فہم انداز اختیار کیا ہے۔ گیتا نے بھگتی کی جو تعلیم دی ہے اس سے محض رسوم و رواج اور ظاہری شعائر کی ادائیگی مقصود و مطلوب نہیں ہے بلکہ بھگت کو چاہیے کہ وہ سرتاپا مکمل طور پر اس میں فنا ہو جائے۔ خدا سے اس کو ایسی محبت ہونی چاہیے کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا آسان ہو جائے۔

گیتا کے مختلف ابواب میں خدا سے محبت وعقیدت کے بارے میں شری کرشن جی کی نصیحتوں کو خواجہ دل محمد صاحب نے اپنے منفرد انداز میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

رہے بے تعلق کرے جب عمل
خدا ہی کی خاطر کرے جب عمل
خطا سے ہمیشہ رہے گا بری
کنول کے نہ پتے پہ ٹھہری تری
(پانچواں ادھیائے شلوک 10 ص 137)

فقط میری خاطر تو ہر کام کر
ہون دان دے سب میرے نام پر
تیرا کھانا پینا ہو میرے لیے
تیرا تپ سے جینا ہو میرے لیے
(نواں ادھیائے شلوک 27 ص 195)

جما دھیان مجھ میں ہو مجھ پر فدا
تو کر یگ تو میرے لیے سر جھکا
اگر یوگ میں دل لگائے گا تو
میں مقصود ہوں مجھ کو پائیگا تو
(نواں ادھیائے شلوک 34 ص 197)

لگا مجھ میں دل بھگت ہوجا میرا
تو کر یگ میرے سامنے سر جھکا
مجھے تجھ سے مجھ سے تجھے پیار ہے
میرا وصل کا تجھ سے اقرار ہے
(اٹھارواں ادھیائے شلوک 65 ص 315)

جیسا کہ بارھویں ادھیائے کو عقیدت کے فلسفے (بھگتی مارگ) کا نام دیا گیا ہے۔ اس باب کی ابتداء میں ہی خواجہ دل محمد صاحب خلاصہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بارھویں ادھیائے میں بھگتی مارگ کی عظمت بیان کی گئی ہے اور اس کے حصول کے طریق بتائے گئے ہیں۔ اس میں سچے بھگت کے خصائص اور اس کی طرز زندگی کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا اپنے بھگتوں سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ بعض لوگ ہر وقت خدا کا نام لیتے اس کی عبادت کرتے اور اسی سے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ وہ خدا ہی سے عشق ومحبت کرتے ہیں۔ اسی کا نام بھگتی یوگ ہے۔ یہ لوگ عابد وزاہد ہیں۔ بعض لوگ خدا کو مکان زماں وعلائق سے مبرا سمجھتے ہوئے اس کو صفات وظہور و بیان سے بالا سمجھتے ہیں اسی کا نام گیان یوگ ہے' یہی عارف ہیں۔" (بارھواں ادھیائے ص نمبر 236)

خواجہ دل محمد صاحب کے ترجمے کی ایک خوبی یہ ہے کہ مطالعے کے دوران قاری پیش آنے والے مشکل مراحل کو بہت ہی سہل انداز میں پیش کیا، جس سے بات کو سمجھنے میں قاری حضرات کو سہولت ہے۔

گیتا میں عمل کی راہ (کرم مارگ) کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ دنیوی عیش و آرام اور شان و شوکت اور حکومت کی خاطر اپنے قریبی رشتے داروں اور عزیز و اقارب کو قتل کرنے کے لیے ارجن تیار نہیں تھے۔اس پر شری کرشن جی، ارجن کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے دھرم (فرض) سے راہ فرار اختیار کرنا درست نہیں ہے اور تم نے یہ فیصلہ محض کم علمی اور مقصد زندگی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا ہے۔

گیتا میں عمل کی راہ (کرم مارگ) کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ دنیوی عیش و آرام اور شان وشوکت اور حکومت کی خاطر اپنے قریبی رشتے داروں اور عزیز و اقارب کو قتل کرنے کے لیے ارجن تیار نہیں تھے۔ اس پر شری کرشن جی، ارجن کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے دھرم (فرض) سے راہ فرار اختیار کرنا درست نہیں ہے اور تم نے یہ فیصلہ محض کم علمی اور مقصد زندگی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا ہے۔ آگے مزید نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں عمل کرتے رہنا چاہیے بلکہ بے غرض ہوکر عمل کرنا اور مخلوق کی خدمت کرنا ہمارا دھرم (فرض) ہے۔ کرم (عمل) سے متعلق گیتا کی تعلیم ہے کہ انسان جو بھی کام کرے اس کے عوض کوئی اجر، بدلہ یا انعام کی توقع نہ رکھے۔

گیتا کا تیسرا ادھیائے (عمل کا فلسفہ) میں شری کرشن جی نے ارجن کو ہر حال میں اپنے دھرم (فرائض) کو ادا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ کیونکہ عمل ہی کے ذریعے انسان بلند مقام حاصل کرسکتا ہے اور دنیا میں انسان کے وجود کا مقصد بھی عمل کرنا ہے۔ تیسرے ادھیائے میں عمل سے متعلق شلوک نمبر 8 میں کرشن جی کے پیغام کو خواجہ دل محمد صاحب نے زبان کی سادگی اور سلاست کے ساتھ پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

جو ہے فرض تیرا کر اس پر عمل
کہ ترک عمل سے ہے بہتر عمل
عمل چھوڑ دینے ہوں تجھ کو تمام
تو مشکل ہے تیرے بدن کا قیام
(تیسرا ادھیائے شلوک نمبر 8 ص نمبر 105)

تیسرے ادھیائے کے شلوک نمبر 20 میں شری کرشن جی کی نصیحت ہے کہ:

عمل سے بزرگوں نے پایا کمال
جنک جیسے انسان ہوئے باکمال
اسی طرح نیکی کیے جاؤ تم
جہاں کو بھلائی دیے جاؤ تم
(تیسرا ادھیائے شلوک 20 ص نمبر 109)

ان اشعار کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے خواجہ دل محمد صاحب نے حاشیے میں اس کی مختصر تشریح بیان کی ہے۔

جناب خواجہ دل محمد صاحب نے اپنے ترجمے میں گیتا کے عرفانی پہلوؤں کو بہت آسان کرکے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بیان کی سلاست۔ بندش کی چستی۔ اسلوب کی تازگی اور دلآویزی اور مشکل پسندی سے اجتناب میں دل کی گیتا کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

شری کرشن جی کی اس جامع نصیحت کے ساتھ ہم بات کو ختم کرتے ہیں جس کو دوسرے ادھیائے (باب) میں پیش کیا گیا اور جس میں تمام انسانوں کو بے غرض ہوکر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کا پیغام دیا گیا ہے اور اس پیام کو جناب خواجہ دل محمد صاحب نے بہت ہی دلنشین انداز میں بیان کیا ہے:

تجھے کام کرنا ہے او مرد کار
نہیں اس کے پھل پر تجھے اختیار
کیے جا عمل اور نہ ڈھونڈ اس کا پھل
عمل کر عمل کر نہ ہو بے عمل
(دوسرا ادھیائے، شلوک نمبر 47، ص نمبر 92)

کتابیات وحوالہ جات

(1) خواجہ دل محمد، دل کی گیتا، خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور، 1944/1945
(2) سروانند کول پریمی، شری مد بھگوت گیتا، گوپی پرچار کیندر صوف شالی کشمیر 1992
(3) https://rekhta.org
(4) https://archive.org/details/Geeta Urdu NazmeinKhwajaDilMuhammad

■

Mohammed Ateequr Rahman
H.No.3-5-908 II & III Floor
Opp TVS Show Room. Above King and Cardinal Bakery, Himayat nagar X Road
Hyderabad- 500029 (Telangana)

شوقِ نیموی کی غزل گوئی

ثاقب فریدی

شوق نیموی 1278ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام ظہیراحسن، کنیت ابوالخیر، مادۂ تاریخ ولادت ظہیرالاسلام ہے۔ دیوان شوق کے مرتب نورالہدی نیموی نے دیوان شوق کے دوسرے صفحے پر شوق کی تاریخ وفات 1322ھ درج کی ہے۔ اس طرح شوق کی عمر 44 سال ہوتی ہے۔شوق نے بطور ایک لغت نگار بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔لغت کے علاوہ جلاءالعین، ردالسکین، محلی، جامع الآثار، لامع الانوار، مقالہ کاملہ، ازاحۃ الاغلاط، اصلاح، ایضاح، سرمۂ تحقیق، یادگار وطن اور سیر بنگال وغیرہ شوق کی تصنیفات ہیں۔ شاعری شوق کا ذیلی یا ضمنی مسئلہ نہیں تھا بلکہ شوق نے شاعری پر باضابطہ توجہ کی۔عظیم آباد اور لکھنؤ میں مشاعرے پڑھے۔شمشاد لکھنوی اور امیر اللہ تسلیم سے اصلاح سخن لی۔ان کی مختلف تصنیفات میں جگہ جگہ غزلوں کا اندراج شاعری کے تئیں ان کی رغبت کا اظہار ہی تو ہے۔ دیوان شوق میں غزلوں کے علاوہ قصائد ورباعیات اور قطعۂ تاریخ بھی ہیں۔شوق کی شاعری کلاسیکی رنگ کی ہے۔ عاشق کی کیفیات، اس کا جذبۂ عشق، معشوق کا حسن، اس کا جور و جفا، ناز و ادا غیروں سے التفات، اور ان وجوہات کی بنا پر عاشق کا دل مغموم اور آہ و گریہ جیسے شوق کی غزلوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کے مضامین بھی نظر آجاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ شوق کا دیوان بہت زیادہ ضخیم نہیں ہے۔ تقریباً سوا سو صفحات پر یہ دیوان مشتمل ہے۔ اس میں غزلوں کی تعداد 92 ہے۔تمام ردیفوں میں سب سے زیادہ غزلیں ردیف یائے تحتانی میں ہیں۔ اس کی تعداد 34 تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد ردیف الف میں غزلوں کی تعداد 20 ہے۔ ردیف نون میں 9 غزلیں اور ردیف واؤ میں 7 غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ باقی ردیفوں میں ایک دو یا تین ہی غزلیں موجود ہیں۔ د، ذ، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف کی ردیفیں غزل سے خالی ہیں اور ردیف قاف میں صرف دو ہی اشعار موجود ہیں۔شوق نے بعض غزلیں سخت زمینوں میں کہی ہیں۔اس میں ایک زمین تو میر تقی میر کی ہے جس کا مشہور مقطع یہ ہے۔

روشن ہے یہ کہ خوف ہے اس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا جو تھر تھر آفتاب

یہ غزل میر کے دیوان ششم میں درج ہے۔ میر نے اپنے معشوق کے تئیں اس غزل میں جو مضامین باندھے ہیں ان میں تنوع بھی ہے اور معانی کی جہتیں بھی۔ میر کی اس غزل کے تمام اشعار کا رشتہ براہ راست معشوق کی ذات سے ہے۔ میر نے اس زمین کو جہاں پہنچا دیا اسے برت لینا اور ان مضامین میں رخنہ ڈال کر کوئی نیا پہلو پیدا کر لینا آسان نہیں ہے۔ شوق نے جس طرح اس زمین کو برتا ہے۔ اس میں اگرچہ میر کا سا حسن نہیں لیکن بعض اشعار واقعتاً قابل تعریف ہیں:

داغ دل کے آگے کیا اے چرخ اخضر آفتاب
میری آہ پر شرر کا ہے اک اخگر آفتاب
عشق عارض نے اثر اپنا دکھایا بعد مرگ
شامیانہ بن گیا میری لحد پر آفتاب

شوق کے یہاں اس غزل میں 7 اشعار ہیں۔ پہلے شعر میں داغ دل کا رشتہ آفتاب سے ہے۔ یعنی عاشق کے داغ دل میں بے شمار چنگاریاں موجود ہیں اور آفتاب انھیں چنگاریوں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ بنیادی طور پر اس شعر کا مضمون آہ و گریہ ہے۔ جس میں داغ، آہ پر شرر اور اخضر کا رشتہ دل سے قائم ہو جاتا ہے۔ آہ پر شرر کی مناسبت سے آفتاب کو ایک اخگر تصور کر لینا بہت خوب ہے۔ دوسرے شعر میں عارض معشوق آفتاب کی طرح ہی روشن ہے۔ حیات میں تو کبھی معشوق نے عاشق کے چہرے پر اپنے عارض روشن کو شامیانہ نہیں بنایا اور عاشق اسی حسرت میں مر گیا۔ چونکہ عشق ایک روشن عارض معشوق

سے تھا لہٰذا اس مناسبت سے بعد مرگ آفتاب لحدِ عاشق پر شامیانہ بن گیا ہے۔ اس شعر میں گویا لفظ عارض کے ساتھ ' روشن ' کی صفت پوشیدہ ہے۔ اس صفت روشن کا رشتہ آفتاب سے قائم ہوا ہے۔ یہاں عارض، شامیانہ، لحد اور آفتاب جیسے الفاظ نے ہی شعر کو با معنی بنایا ہے۔ اس غزل کے علاوہ شوق نے دھوپ کی ردیف میں غزل کہی ہے۔ پاپوش، روپوش، بیہوش، بلانوش، سردوش اور فراموش وغیرہ اس غزل کے قافیے ہیں۔ یہ زمین بنیادی طور پر ناسخ کی ہے۔ ناسخ کی غزل میں گیارہ اشعار ہیں۔ اسی زمین میں شاد عظیم آبادی اور اثر نے بھی غزل کہی ہے۔ اثر کی غزل میں گیارہ اشعار ہیں جبکہ شوق کی غزل چودہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تینوں کی غزل کے اشعار بعض اوقات مضمون بندی کی سطح پر مماثل نظر آتے ہیں اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ ناسخ کی زمین میں اثر اور شوق نے نہ صرف مضمون آفرینی کی ہے بلکہ نئے پہلو بھی پیدا کیے ہیں۔

شوق

چمکی جو تری صبح بنا گوش ہوئی دھوپ
ٹانکی جو کرن صدقہ ' پاپوش ہوئی دھوپ
کچھ سایۂ گیسو ہے تو کچھ عکسِ رخ یار
ہمراہ شب تار سردوش ہوئی دھوپ
آخر کو گری عالم بالا سے زمیں پر
نظارہ ' جاناں سے جو بیہوش ہوئی دھوپ

امداد امام اثر

عکس روح روشن سے کرن پھول جو چمکے
آئینہ صفت گرد بناگوش ہوئی دھوپ
جوڑے کے جواہر کی جو شانوں پہ پڑی چوٹ
ہمراہ شب تار سردوش ہوئی دھوپ
غش کھا کے سرخاک گری صورتِ موسیٰ
نور رخ روشن سے جو بیہوش ہوئی دھوپ

(1) شوق نیموی کے شعر میں کرن ٹانکنے کا عمل بہت خوبصورت ہے۔ اس میں ایک نیا پہلو یہ ہے کہ آفتاب کی شعاؤں کی بجائے معشوق کے رخ روشن سے کرنیں پھوٹ کر معشوق کے صدقۂ پاپوش ہوئی ہیں۔ جبکہ اثر کے شعر میں رخ روشن سے کرن پھول چمکنے کی بات ہے۔ اثر کے شعر میں عکس رخ روشن سے کرن پھول کے چمکنے کا عمل اور دھوپ کا آئینے کی طرح بنا گوش کے گرد پھیل جانے کی کیفیت رخ روشن، بنا گوش اور دھوپ تینوں کی الگ الگ تصویریں قائم کرتی ہے اور یہ امیجری بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

” شوق نیموی کے شعر میں کرن ٹانکنے کا عمل بہت خوبصورت ہے.اس میں ایک نیاپہلو یہ ہے کہ آفتاب کی شعاؤں کی بجائے معشوق کے رخ روشن سے کرنیں پھوٹ کر معشوق کے صدقۂ پاپوش ہوئی ہیں.جبکہ اثر کے شعر میں رخ روشن سے کرن پھول چمکنے کی بات ہے. اثر کے شعر میں عکس رخ روشن سے کرن پھول کے چمکنے کا عمل اور دھوپ کا آئینے کی طرح بناگوش کے گرد پھیل جانے کی کیفیت رخ روشن.بنا گوش اور دھوپ تینوں کی الگ الگ تصویریں قائم کرتی ہے اور یہ امیجری بہت دلکش معلوم ہوتی ہے. “

(2) اس میں شوق اور اثر دونوں کے یہاں شعر کا دوسرا مصرع یکساں ہے۔ جبکہ مصرع اول میں شوق نے سایۂ گیسو اور عکسِ رخ یار کی تراکیب استعمال کی ہیں اور اثر نے جوڑے اور شانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جوڑے تو گیسو کی ہی بندھی ہوئی ایک شکل ہے اور اس کی رنگت سیاہ ہے جو کہ شب تاریک کے مماثل ہے لیکن جوڑے میں جواہر کی روشنی اسے دھوپ کے مماثل کر دیتی ہے۔ اس طرح جوڑے کی تاریکی اور جواہر کی روشنی دونوں مل کر جب شانوں پر پڑتی ہیں تو روشنی اور تاریکی کی ایک ساتھ تصویر بنتی ہے۔ شوق کے شعر میں سایۂ گیسو اور عکس رخ یار سے یہی تصویر ابھرتی ہے لیکن اثر کے شعر میں جوڑے کا شانوں پر چوٹ کرنا بہت خوبصورت ہے۔

(3) یہاں دونوں اشعار تھوڑے فرق کے ساتھ متحد المضمون ہیں۔ شوق کے مقابلے میں اثر کا مصرع اولیٰ تلمیح کی وجہ سے بہت دلکش ہو گیا ہے۔ یہاں موسیٰ کی مناسبت سے 'غش کھا کر گرنے' کا فقرہ بہت با معنی ہے۔ اس میں دھوپ کے بیہوش ہو کر گرنے کو موسیٰ کے غش کھا کر گرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جبکہ شوق کے مصرع اولیٰ میں ' آخر کو گری' کا فقرہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ نظارۂ جاناں اور دھوپ کے مابین نظر لڑی تھی اور دھوپ بالآخر تاب نہ لاکر بیہوش ہوئی اور عالم بالا سے زمین پر گر پڑی۔ شوق اور اثر دونوں کے یہاں دوسرے مصرعے میں فقط نظارۂ جاناں اور نور رخ روشن کی ترکیب کا فرق ہے۔

شوق

اللہ رے کیا حشر میں پر جوش ہوئی دھوپ
چمکے جو مرے داغ تو روپوش ہوئی دھوپ
جب دفن ہوا عاشق خورشید رخ یار
کس پیار سے تربت کی ہم آغوش ہوئی دھوپ
جلوہ جو ترے چاند سے رخسار کا چمکا
مل جل کے قیامت کی صفا پوش ہوئی دھوپ

ناسخ

تاریک ہوا دن مرے رونے کے اثر سے
جس طرح چھپا دیتی ہے ساون کی جھڑی دھوپ
ہے تیرے تصور سے مری قبر بھی روشن
اے مہر جہاں تاب مرے ساتھ گڑی دھوپ
کیا پردے سے باہر نکل آیا ہے وہ خورشید
خلقت جلی جاتی ہے بڑی آج پڑی دھوپ

(1) شوق کے شعر میں داغ چمکنے کی وجہ سے دھوپ روپوش ہوئی ہے اور ناسخ کے یہاں رونے کی وجہ سے دن سیاہ ہوا اور دھوپ سیاہ پوش ہوئی۔ داغ دل کا چمکنا اور مسلسل رونا دونوں داخلی کیفیت کا اظہار ہے۔ ناسخ نے دھوپ کے روپوش ہونے کی تصویر بہت خوب بنائی ہے اور اس تصویر کا انحصار شعر کے دوسرے مصرعے پر ہے۔ بارش سے قبل بادل کا گھر آنا، دھوپ روپوش ہو جاتا ہے۔ رونے کے بعد بھی طبیعت پر افسردگی چھا جاتی ہے اور دن اداس لگنے لگتا ہے۔ اس طرح دن کی اداسی دن کی تاریکی بھی ہے۔ لہٰذا شعر محض مبالغے پر محمول نہیں کیا جائے گا بلکہ رونے اور بارش کی مناسبت سے دن کا تاریک ہو جانا قرین قیاس ہے۔ شوق کے پہلے مصرعے میں دھوپ کا پر جوش ہونا دراصل داغ دل کا چمکنا ہے۔ گویا داغ دل سے جو روشنی اور تپش باہر نکلی وہ پر جوش دھوپ کے مثل تھی۔ یہاں تک کہ آفتاب سے نکلنے والی دھوپ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

(2) شوق کے شعر میں عاشق خورشید رخ یار کی ترکیب بہت خوب ہے اور خورشید رخ یار کی مناسبت سے تربت پہ دھوپ کی ہم آغوشی با معنی ہو جاتی ہے۔ جبکہ ناسخ کے یہاں مہر جہاں تاب کی ترکیب ذرا مبہم ہے۔ اس میں آفتاب اور معشوق دونوں کا احتمال ہے۔ ناسخ کے شعر میں تصور معشوق بھی دھوپ سے کم روشن نہیں ہے۔ گویا عاشق کے ساتھ دھوپ بھی دفن ہوئی اور پھر 'گڑی دھوپ' کا

قافیہ نہایت برجستہ اور دلچسپ ہے۔

(3) شوق نے اپنے معشوق کے لیے چاند کا لفظ استعمال کیا ہے جبکہ ناسخ نے خورشید کا لفظ۔ دونوں جگہ حسن معشوق کی تابناکی ہے۔ شوق کے یہاں رخسار معشوق اور دھوپ کا مل جل کر چمکنا کسی قیامت سے کم نہیں ہے اور ناسخ کے شعر میں خلقت کا جل جانا بھی دھوپ کی اسی تیزی اور شدت کا اظہار ہے۔

ٹلتا ہی نہیں ہجر کا دن کیا ہے اُڑی دھوپ
خورشید قیامت نے مرے گھر میں جڑی دھوپ

ناسخ

آگے ترے خورشید قیامت کو گئے بھول
وہ محو ہوئے ہم کہ فراموش ہوئی دھوپ

اثر

لایا یہ سیہ نامۂ اعمال مرا رنگ
خورشید قیامت کی بھی روپوش ہوئی دھوپ

شوق

ان تینوں اشعار میں مضمون اگر چہ علاحدہ ہے لیکن اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ خورشید قیامت کی ترکیب تینوں جگہ مختلف معانی کی حامل ہے اور تینوں شعر کا حسن قابل تعریف ہے۔ دھوپ کی زمین کے علاوہ اثر نے ایک غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

کس طرح لاؤں شب فرقت میں جوئے شیر صبح
کوہکن سے پوچھ آؤ ہمدموں تدبیر صبح

اس غزل میں اثر نے پے در پے پانچ مطلع کہے ہیں۔ اثر نے بہت خوبصورتی اور سلیقہ مندی کے ساتھ تمام قافیوں کو نبھایا ہے۔ تعزیر صبح، توقیر صبح، شمشیر صبح، جاگیر صبح، دامن گیر صبح، دارو گیر صبح، نخچیر صبح، تقصیر صبح اور تحریر صبح جیسے قوافی استعمال کر لینا آسان نہیں ہے۔ قافیوں کا آخری حرف مع اضافت ردیف کا حصہ ہے لہٰذا اس زمین میں قافیے کی بندش اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اثر کے بعد شوق نے اسی زمین میں ایک غزل کہی ہے۔ اس میں 17 اشعار دو مطلعوں کے ساتھ ہیں۔ پہلا مطلع اس طرح ہے۔

دل سے نکلی ہے جو میری آہ پر تاثیر صبح
دیکھیے کیا رنگ لاتا ہے یہ میرا تیر صبح

اس زمین میں شوق کی غزل بھی خوب ہے اور بعض مضامین دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔ بعض جگہ اثر کی ترکیب اور قافیے اچھے لگتے ہیں اور بعض اوقات شوق کا شعر زیادہ پسند آتا ہے۔ میں نے یہاں شوق اور اثر دونوں کے متحد المضمون اشعار پیش کیے ہیں۔

شوق

ہائے وہ رخصت طلب ہونا دم تکبیر صبح
مدتوں مجھ کو نہ بھولی یار کی تقریر صبح
کاتب قدرت نے لکھا ہے یہ وصف حسن یار
ہے جو لوح آسماں پر خوشنما تحریر صبح
آفتاب داغ دل اپنا دکھا دوں گا اگر
رنگ رخ اُڑ جائے گا مٹ جائے گی تصویر صبح
کوئی دم میں وصل کی شب اے فلک کٹ جائے گی
حسرتوں کا خون کردے گی تری شمشیر صبح

اثر

ہر گھڑی رنگ سخن ان کا بدلتا ہے اثر
شام کی تقریر سے ملتی نہیں تقریر صبح
منشی گردوں نے بھیجا دفتر گوہر نگار
جب ہوئی لوح زبرجد پر عیاں تحریر صبح
رنگ اپنا فق نہ ہو کیوں کر شب وصل صنم
شام ہی سے پھر رہی ہے آنکھ میں تصویر صبح
ہے شفق خون شب وصل غریباں کی دلیل
ہر کرن مہر درخشاں کی ہے اک شمشیر صبح

اس زمین میں شوق اور اثر کی غزل موضوع کی سطح پر بھی بہت مماثل ہو گئی ہے۔ شوق نے بعض اشعار میں نئی اور جدید تشبیہیں استعمال کی ہیں اور نئے معانی بھی پیدا کیے ہیں۔

شکل آہو یہ بھی کیا وحشی کسی کا ہو گیا
گردن خورشید میں ہے حلقۂ زنجیر صبح
آفتاب روئے جاناں پر جو کی کچھ بدنگاہ
پنجۂ خورشید خود نکلا گریباں گیر صبح
اس پری وش کی صباحت پر جو دیوانی ہوئی
ہر شعاع مہر انور بن گئی زنجیر صبح

یہ اشعار خیال بندی کے ضمن میں رکھے جاسکتے ہیں۔ شوق کو باضابطہ طور پر شاہ نصیر، ناسخ اور غالب کی طرح خیال بند شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن خیال بندی بھی ان کی شاعری کا ایک وصف ہے۔ خیال بندی ایسی مضمون آفرینی ہے جسے دور دراز تخیلات اور غیر متعلق اشیاء سے تعلق ہوتا ہے۔ گردن خورشید میں حلقۂ زنجیر صبح تصور کرنا، آفتاب کی شعاؤں کو شمشیر اور پنجۂ خورشید سے تعبیر کرنا ہی خیال بندی ہے۔ اثر کی اس زمین کے علاوہ شوق نے شاد کی ایک زمین میں بھی غزل کہی ہے۔ شاد کی زمین میں شوق کی یہ غزل خالص عاشقانہ نوعیت کی ہے۔ اس میں معشوق کے حسن و جمال، سراپا، قد و قامت اور ناز و ادا سے سروکار ہے۔ جبکہ شاد عظیم آبادی کی غزل میں مضمون کا تنوع ہے۔ اس زمین میں شوق عاشقانہ شاعری کے اعتبار سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح محبوب کے حسن و جمال کی امیجری کی ہے وہ نہایت برجستہ اور قابل تحسین ہے:

کچھ کچھ کسی کی قامت موزوں کا ہے جواب
سرو چمن کو دیکھ لیا سر سے پاؤں تک
پابوسی حنائے کف پا کے شوق میں
آئی ہے ان کی زلف رسا سر سے پاؤں تک
یہ بھی تھی اک ادا کہ وہ آئے کسی کے پاس
اوڑھے ہوئے ردائے حیا سر سے پاؤں تک

شوق کی یہ غزل سادہ بیانی کی نہایت خوبصورت مثال ہے۔ اس میں لفظوں کی چاشنی بھی ہے اور تراکیب کا حسن بھی، ناز و ادا کے مرقعے بھی ہیں اور حسن و جمال کی تصویر کشی بھی۔

شوق کی غزل میں عاشق کا کردار عموماً عشق میں خود سپردگی کا جذبہ رکھتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے مزاج میں انانیت، کجکلاہی اور بانکپن کی صفت بھی نظر آتی ہے۔

تمھارے ہی تصور کا یہ گھر ہے
سمجھ کر دل مرا برباد کرنا
آفتاب داغ دل اپنا دکھا دوں گا اگر
رنگ رخ اڑ جائے گا مٹ جائے گی تصویر صبح
جو پامال اس کو کرتے ہو کرو لیکن سمجھ رکھو
تمھارے ہی تو ارماں آج کل اس دل میں رہتے ہیں

شوق کی غزل میں عاشق کے اس رویے کی حیثیت ثانوی ہے اور عموی طور پر اس کے رویوں سے عاشقانہ بانکپن اور کجکلاہی کا اظہار کم کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں جذبۂ عشق کی گھلاوٹ، اس کی نشتریت اور دلسوزی کی کیفیت غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں رونے اور آہ و گریہ کرنے کے مضامین کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ رونا اور آہ و گریہ کرنا ہماری کلاسیکی غزل میں کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ شوق ان مضامین کو کس انداز سے برتا ہے:

روئے دل شکستہ کو ہم پھوٹ پھوٹ کر
شیشہ جو کوئی راہ میں ٹوٹا پڑا ملا

شوق

نہ جانے یاد کر رہتا ہے کس کے دل کے صدمے کو
کہیں ٹکڑا جو سودا کو نظر آتا ہے شیشے کا

سودا

شوق نیموی کا یہ شعر سودا کے شعر سے مضمون بندی کی سطح پر مطابقت رکھتا ہے۔ شوق کے یہاں دل شکستہ کے لیے پھوٹ پھوٹ کی تکرار شعر کے حسن میں اضافہ کر رہی

ہے۔ جبکہ سودا کے شعر میں یہ تکرار نہیں ہے۔ سودا کے شعر میں ایک طرح کا ابہام بھی ہے۔ 'نہ جانے' کا فقرہ اسی ابہام کی طرف اشارہ ہے۔ اس ابہام کی وجہ سے سودا کا شعر بہت بامعنی ہوگیا ہے۔ دونوں جگہ دل شکستہ کی رعایت شیشے کے ٹکڑے سے قائم ہوئی ہے۔ یہ رعایت کلاسیکی شاعری میں خاص کر میر کے یہاں بہت خوبصورت انداز میں استعمال کی گئی ہے۔ خود سودا کے یہاں بھی رعایت کئی جگہ موجود ہے:

آتی ہے اس گلی سے پریشاں صدائے آہ
شاید کسی کا شیشۂ دل چور ہوگیا

سودا

شاید کسی کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ
میری بغل میں شیشۂ دل چور ہوگیا

میر

سودا کے مقابلے میر نے شیشۂ دل کی ترکیب کا رشتہ خارج کے بجائے اندرون ذات سے قائم کیا ہے۔ جبکہ سودا کے دونوں اشعار میں شیشے کا رشتہ اندرون ذات سے سروکار نہیں رکھتا۔ اب شوق کے شعر میں عشق کی گھلاوٹ خارج پر کچھ اس طور سے اثر انداز ہوتی ہے کہ اسے اپنے داخل کا مظہر بنالیتی ہے۔ راستے میں ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کو دیکھ کر اپنی دل کی شکستگی یاد کرنا اپنی اسی داخلی کیفیات کا اظہار ہے۔ شوق کی شاعری عاشقانہ معاملات اور عشق کی گھلاوٹ کا اظہار ہے۔ اس میں گریہ وزاری کی مختلف صورتیں مل جاتی ہیں۔

ہائے کیا وقت ہے تھمتے نہیں آنسو اپنے
اور وہ کہتے ہیں حال دل مضطر کہیے
سینے میں ہوک اٹھتی ہے پہلو ہے داغ داغ
دل دے کے آپ کو مجھے اچھا صلا ملا
دن کٹا آج آہ و نالہ میں
رہے آنکھوں سے اشک جاری رات
عمر بھر روئے مگر رونا نہ اپنا کم ہوا
نوح کا طوفان گویا تہ نشیں آنکھوں میں ہے
تجھ سے اے آہ بہلتی ہے طبیعت میری
تو کہاں چھوڑ چلی ہے شب تنہائی میں

آنسو کا مسلسل بہنا اور سینے میں ہوک کا اٹھنا عشق میں ناکامی کے بعد شدت غم کا اظہار ہے۔ اس میں معشوق سے شکایت کا عنصر بھی شامل ہے۔ 'دل دے کے آپ کو مجھے اچھا صلہ ملا' والے مصرع میں شکایت برائے شکایت نہیں بلکہ اس میں ندامت کا بھی ایک عنصر ہے لیکن یہ ندامت ناکامی عشق کی ہے جذبۂ عشق کی نہیں۔ رات بھر

آہ کے تئیں اتنا پر اعتماد رویہ عاشق کے کردار کو بھی پرقوت بناتا ہے اور اس کے عشق میں جو گھلاوٹ ہے وہ بھی کچھ کم ہوتی ہے۔ عاشق اس ماحول سے نکل کر ایک نئی فضا میں سانس لیتا ہے۔ عاشق کا یہ رویہ گریہ کرنے، غم و اندوہ میں اوقات بسر کرنے اور مستقل دل کو گھلانے کے بعد زندگی کی طرف مراجعت بھی ہے۔ شوق کی غزل میں جہاں معشوق کے جور و ستم کا تذکرہ ہے وہاں عاشق کا دل مغموم نظر نہیں آتا۔ معشوق ستم شیوہ کی جفا عاشق کے لیے باعث حزن و ملال ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ معشوق کے ان ظالمانہ رویوں سے لطف اندوزی اس کی طبیعت میں سرشاری پیدا کرتی ہے۔ وہ معشوق کی ستم شعاری کو نازوادا پر محمول کرتا ہے۔

رونے کا عمل، اس کا بھاری پن اس کرب کا نچوڑ ہے جسے رات دل معشوق پر مسلط کرتی ہے۔ طوفان نوح سے زندگی بھر رونے کے تسلسل کی رعایت قائم کرنا مبالغہ آرائی بھی ہے اور تلمیح بھی۔ آخری شعر میں خصوصاً شوق نے آہ سے طبیعت بہلنے کا جو مضمون باندھا ہے۔ آہ ایک مجرد شے ہے۔ اسے باضابطہ مخاطب کرنا تجرید کی تجسیم ہے۔ اس طور سے شوق کے شعر میں آہ و فغاں سے طبیعت کو بہلانا بہت بامعنی ہو جاتا ہے۔ آہ و گریہ کا ختم ہو جانا زندگی کا پھر اسی پرانے ٹھہراؤ پر آجانا بھی ہے۔ آہ و نالہ کے دل معشوق پر اثر انداز ہونے میں تاخیر نہیں لگتی۔ اردو غزل میں آہ کے تعلق سے جس نوع کے مضامین باندھے گئے ہیں ان میں آہ رسا کے اتنے خوبصورت اور اثر انداز مرقعے کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اردو غزل کا معشوق آہ و نالہ کے اثر سے بھی عموماً بے نیاز نظر آتا ہے۔ عاشق کی آہ اتنی پرقوت نظر نہیں آتی جس سے معشوق کی بے التفاتی میں کمی آسکے۔ شوق نے اپنی غزل میں عاشق کی آہ کو بہت پرقوت استعمال کیا ہے بعض جگہ آہ رسا کی ترکیب استعمال کی ہے۔

نہ کر آہ کا قصد گھبرا کے اے دل
کچھ اچھا نہیں دل دکھانا کسی کا
اپنی آہوں نے دکھایا یہ اثر
آج کچھ بیتاب انھیں پاتے ہیں ہم
چین سے محفل اغیار میں وہ بیٹھے ہیں
جی میں آتا ہے کہ ہم آہ رسا کر دیکھیں

اثر سے تیرے باز آئے ہم اے آہ
وہ پہروں سے دبائے ہیں جگر کو

آہ رسا کی وجہ سے معشوق کا دل تھامے ہوئے آنا۔ آہ کی وجہ سے معشوق کا دل دکھ جانا، آہ کی وجہ سے معشوق کا بیتاب ہوجانا، آہ رسا کا دل معشوق میں گھر کرنا اور آہ کی وجہ سے پہروں جگر کو دبا کر بیٹھنا آہ کے اثر انداز اور پرقوت ہونے کی دلیل ہے۔ معشوق کو محفل اغیار میں دیکھ آہ رسا کی خواہش کرنا اپنی آہ رسا پر خود اعتمادی کا علامیہ ہے۔ آخری شعر میں معشوق کا اثرِ آہ سے پہروں جگر کو داب کر بیٹھنا بہت دلچسپ ہے۔ آہ کے تئیں اتنا پر اعتماد رویہ عاشق کے کردار کو بھی پرقوت بناتا ہے اور اس کے عشق میں جو گھلاوٹ ہے وہ بھی کچھ کم ہوتی ہے۔ عاشق اس ماحول سے نکل کر ایک نئی فضا میں سانس لیتا ہے۔ عاشق کا یہ رویہ گریہ کرنے، غم و اندوہ میں اوقات بسر کرنے اور مستقل دل کو گھلانے کے بعد زندگی کی طرف مراجعت بھی ہے۔ شوق کی غزل میں جہاں معشوق کے جور و ستم کا تذکرہ ہے وہاں عاشق کا دل مغموم نظر نہیں آتا۔ معشوق ستم شیوہ کی جفا عاشق کے لیے باعث حزن و ملال ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ معشوق کے ان ظالمانہ رویوں سے لطف اندوزی اس کی طبیعت میں سرشاری پیدا کرتی ہے۔ وہ معشوق کی ستم شعاری کو نازوادا پر محمول کرتا ہے۔ اس کی شوخیوں اور غمزوں کے قصیدے پڑھتا ہے:

وہ کیا تسکینِ خاطر کی کوئی صورت نکالیں گے
وہ جب شوخی سے تڑپاتے ہیں اپنے بے قراروں کو
تمھیں میرا دل بیتاب تڑپاتے ہو پہلو میں
تمھیں پھر مجھ سے کہتے ہو کہ سرگرمِ فغاں کیوں ہو
ادا و ناز و غمزہ سب ہیں آفت
کرے کس کس بلا کا سامنا دل
بال کھولے ہوئے او ناز سے چلنے والے
دل ہزاروں کے ہیں قابو سے نکلنے والے

ان اشعار کے مضامین نئے اور اچھوتے نہیں ہیں لیکن شوق نے انہی مضامین میں کچھ نئے یا پھر کم کم استعمال ہونے والے الفاظ استعمال کیے، کچھ نئی رعایتیں قائم کی، لفظوں کی بندش میں ایک طرح کا نیاپن پیدا کیا ہے۔ شوق کی اسی فنکارانہ چابکدستی نے پامال مضامین میں بھی دلچسپی پیدا کی ہے۔ شوق کے اس آخری شعر کے بالمقابل میر کا ایک شعر ہے:

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال جو گیا
سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

میر کے شعر کا مضمون معشوق کی زلف کی تعریف

ہے۔ سنبل کا مفت میں پامال ہوجانا زلفِ معشوق کا گرویدہ ہوجانا ہے۔ اس شدت کے ساتھ گرویدہ ہونے کی وجہ زلفِ معشوق کی سیاہی، درازی، خوشبو سب کچھ ہے لہٰذا اگر یہاں سنبل کے علاوہ کسی اور عاشق وغیرہ کے پامال ہونے کی بات ہوتی تو شعر میں اس نوع کی تاثیر پیدا نہ ہوتی جو کہ ہے۔ میر کے اس شعر کی شدت محض اس وجہ سے ہے کیونکہ سنبل بھی صفات زلفِ معشوق سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ شوق کے شعر میں بھی معشوق کے بال کھولنے کا تذکرہ ہے۔ میر نے معشوق کے انداز خرام کے لیے ایک روش کا استعمال کیا ہے۔ جبکہ شوق کے شعر میں 'اوناز سے چلنے والے' کا فقرہ کم دلچسپ نہیں۔ دوسرے مصرع میں شوق کے یہاں سنبل کی جگہ قابو کی رعایت قائم کی گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ دل کے بے قابو ہونے کی کیفیت اور دلِ عاشق کے قابو میں نہ رہنے کی حالت کے مابین ایک طرح کا رشتہ قائم ہوگیا ہے۔ یہی رشتہ غیر محسوس طریقے سے ہمارے ذوق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

شوق نے معشوق کے ناز وادا کے ساتھ ساتھ اس کے حسن کے مرقعے، جسم کی رنگت، قد و قامت، اس کا سنگار اور یہاں تک کہ اس کی انگڑائی کی بھی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ شوق کی غزل معشوق کی سراپا نگاری میں اس قدر ثروت مند ہے کہ بہت کم شاعروں کے یہاں معشوق کے حسن کے مرقعوں کا اتنا تنوع نظر آتا ہے:

گری بجلی غضب کی پرتو رخسار روشن سے
جو وہ پردہ نشیں گل روزنِ دیوار سے جھانکا
پھیلی ہوئی ہے آج قیامت کی روشنی
تم جھانکتے ہو یا پسِ روزن ہے آفتاب
دن کو کوٹھے پر نہ جاؤ ورنہ فرطِ شرم سے
گر پڑے گا منہ کے بل روئے زمیں پر آفتاب
گلوں کا جوش بہارِ چمن نہ پھر یاد آئے
جو دیکھ لے کہیں بلبل ترے بدن کا رنگ

شوق کے ان اشعار کی قرأت کے بعد بے ساختہ میر، سودا اور دوسرے کلاسیکی شعرا کی غزل کے معشوق کا حسن یاد آتا ہے۔ معشوق کا روزنِ دیوار سے جھانکنا، پسِ روزن رخِ معشوق کو آفتاب خیال کرنا اور معشوق کے بدن کے رنگ کو گل و بہار چمن سے برتر قرار دینا کلاسیکی غزل کی بازگشت ہے:

حشر سے تو جو ڈراتا ہے ذرا یوں واعظ
کہ قیامت بھی ہے اس شوخ کی قامت کی طرح
خرام ناز سے پامال کر دو چل کے گلشن میں
بہت سرو وصنوبر اپنی قامت پر اکڑتے ہیں

آخری شعر میں معشوق کی قامت کی رعایت سے

شوق کے یہاں مسی سے نیلم کا رشتہ اور پان سے لعل بدخشاں کا رشتہ بہت خوبصورت ہے۔ معشوق کے لبوں پر چمکتے ہوئے تبسم کو کندن کے ڈاک سے تشبیہ دینا نیرنگی بھی ہے اور ایک دلکش پیرایۂ اظہار بھی۔ معشوق کی مژگان و ابرو کے تعلق سے شوقؔ نے جو شعر کہا ہے اس میں ابرو کے لیے کمان اور مژگاں کے لیے تیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابرو کے ساتھ بانکی کی صفت لاجواب ہے۔ شعر کا سارا حسن اسی صفت کی وجہ سے ہے۔

سرو وصنوبر کا اپنی قامت پر اکڑنا قابلِ لحاظ ہے۔ سرو وصنوبر چونکہ طوالت میں بالکل سیدھے کھڑے رہتے ہیں اس لیے ان کا سیدھا پن ان کی اکڑ بھی ہے۔ اور پھر معشوق کے خرامِ ناز میں جو بلا کی اکڑ ہے سرو وصنوبر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ الغرض ایک اکڑ کو توڑنے کے لیے دوسری اکڑ کا التزام ہی دراصل شعر کا حسن ہے۔ شوق نے جس طرح معشوق کے خرامِ ناز سے سرو وصنوبر کی اکڑ توڑنے کا مضمون باندھا ہے وہ بہت خوبصورت ہے:

اللہ رے نازکی کہ وہ زلفوں سے کہتے ہیں
تم تھام لو کمر کو ہمیں قصد خرام ہے

اس شعر میں خرام کمر کی نزاکت پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ زلفوں کا کمر کو تھامنا بھی خوب ہے:

نازکی کہتی ہے للہ سنبھالو اس کو
ہار پھولوں کے جو وہ زیبِ کمر کرتے ہیں
بل کھاتی ہے رہ رہ کے کمر آج کسی کی
سایہ مگر اس پر بھی پڑا زلفِ رسا کا

آخری شعر میں سایے کی مناسبت سے بل کھانے کا عمل بہت بامعنی ہے۔ دراز زلف تو کمر تک آتی ہی ہے لیکن اس شعر میں زلف کی رعایت سے سائے اور بل کھانے کا لفظ دلچسپ ہے۔ انسان جب سحر زدہ ہوجائے تو جھومنے اور بل کھانے کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ زلف کے تعلق سے بھی شوق کی غزل میں مضامین موجود ہے:

مثلِ سنبل ایک الجھن میں پڑا رہتا ہوں میں
جب سے میرا دل اسیرِ کاکلِ ژولیدہ ہے
چڑھا ہے زہر جن جن پر تمہارے مارِ گیسو کا
نہیں کچھ بھی سمجھتے وہ کالے ناگ کے بس کو

سنبل چوں کہ چوٹی کی مانند گندھی ہوئی گھاس ہے لہٰذا اسے الجھن تعبیر کرنا بہت خوب ہے۔ کاکلِ معشوق کے آگے کی جانب لٹکے ہوئے بال ہیں لہٰذا ان کے دام میں پھنس کر دل کا اسیر ہونا زیادہ قرینِ قیاس بھی ہے۔

آخری شعر میں گیسو کے لیے مار اور کالے ناگ کا استعارہ بہت بامعنی ہے:

معشوق کے لب

لبوں پر مل کے مسّی کیا کروگے مات نیلم کو
نظر آنے لگا کندن کا ڈاک اپنی نگاہوں پر
کروگے پان کھا کر خون کیا لعلِ بدخشاں کا
کسی کے لعلِ لب پر رنگ چمکا جب تبسم کا

مژگاں، ابرو اور آنکھیں

ہزاروں قتل ہوے جب بل آئے ابرو پر
ستم کے تیر وہ بانکی کمان والے ہیں

معشوق کے زیورات

ہوئے آویزۂ گوشِ بتاں یاقوت کے بندے
خدا کی شان ہے چمکی عجب تقدیر پتھر کی
نہ کیوں اے غیرتِ گل بجلیاں غم کی گریں مجھ پر
کہ میں ترسا کروں اور سرگوشیاں کرے جھمکا
سنہرا گوکھرو اس شوخ نے کنٹھے میں ٹانکا ہے
نہیں دیکھی ہو جس نے دیکھ لے شمشیر سونے کی
اے غیرتِ انجم ہیں یہ کس شان کے موتی
ہیں عرش کے تارے کہ ترے کان کے موتی
ہم سمجھے کہ پہلو میں ہے یہ خوشۂ پرویں
چمکے جو شبِ وصل ترے کان کے موتی
جو کی زیبِ گلو اس شوخ نے زنجیر چاندی کی
ہوئی کندن سے بھی بڑھ کر کہیں توقیر چاندی کی

شوق کے یہاں مسی سے نیلم کا رشتہ اور پان سے لعل بدخشاں کا رشتہ بہت خوبصورت ہے۔ معشوق کے لبوں پر چمکتے ہوئے تبسم کو کندن کے ڈاک سے تشبیہ دینا نیرنگی بھی ہے اور ایک دلکش پیرایۂ اظہار بھی۔ معشوق کی مژگان و ابرو کے تعلق سے شوق نے جو شعر کہا ہے اس میں ابرو کے لیے کمان اور مژگاں کے لیے تیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابرو کے ساتھ بانکی کی صفت لاجواب ہے۔ شعر کا سارا حسن اسی صفت کی وجہ سے ہے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بانکی کی صفت میں معشوق کے مزاج کی کجکلاہی بھی شامل ہے۔ ابرو کی شکل تو بانکی ہوتی ہی ہے اس طرح 'بانکی کمان والے' کا فقرہ بہت بامعنی ہوجاتا ہے۔ معشوق کے جھمکوں کا سرگوشیاں کرنا، سنہرا گوکھرو کنٹھے میں ٹانکنا اور معشوق کے کان کے موتیوں کو خوشۂ پرویں سے تعبیر کرنا بہت اچھوتی مثالیں ہیں۔

■

Saqib Fareedi
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia, New Delhi- 110025
Mob.:9911234158

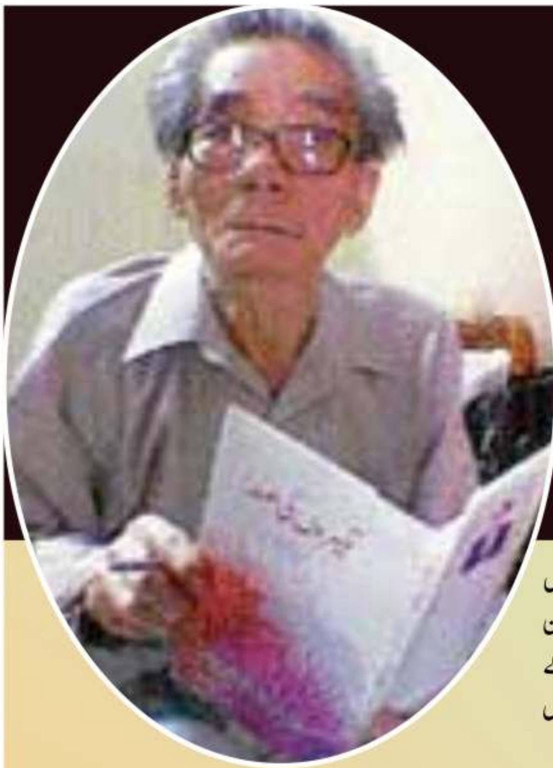

محمد عمران

اردو کا چینی نژاد شاعر
شیدا چینی

زبان پر کسی مذہب، فرقے، یا ذات و برادری کی اجارہ داری نہیں ہوتی بلکہ جس علاقے میں وہ پیدا ہوتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اس خطے کے تمام لوگوں کا اس میں حصّہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب، فرقے، یا رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

شیدا چینی کا تعلق ملک چین سے تھا۔ چینی زبان و تہذیب سے نکل کر اگر کوئی شخص اُردو زبان وادب کی آبیاری کرنے لگے اور شعر و سخن کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرلے تو یقیناً حیرت انگیز بات ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نزہت وہاب نے اپنی کتاب 'اُردو کے غیر ملکی فن کار' میں بجا طور پر لکھا ہے۔ ''صوبہ جھارکھنڈ ہی نہیں پورے ملک بلکہ پوری دنیا کے ادب کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ چینی نژاد شخص جو اردو کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہے جس کی مادری زبان چینی ہے مگر جس نے نہ صرف یہ کہ اُردو زبان میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی بلکہ باضابطہ شاعری بھی کی اور اُردو کی ترقی پسند شاعروں میں اپنا مقام حاصل کیا۔''

ایسا نہیں ہے کہ شیدا چینی اکیلے ایسے غیر ملکی نژاد شاعر ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کی ہو۔ بلکہ متعدد انگریز اور یورپین شعرا نے بھی اُردو شعر و سخن کی دنیا میں اپنا نام روشن کیا ہے اور اپنی کاوشوں سے اردو کے ذخیرۂ ادب میں اضافہ بھی کیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شیدا چینی اربوں کی آبادی والے ملک چین سے تعلق رکھنے والے واحد شخص ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب میں اپنا نام روشن کیا ہے۔ جیسا کہ مشہور شاعر و محقق جناب اسلم بدر نے اپنی کتاب 'ساغر جم جام سفال' میں بجا طور پر لکھا ہے ''جمشید پور کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ہندوستان کا ایک اکیلا چینی نژاد اردو شاعر یہیں رہتا ہے۔'' اور بقول شیدا چینی انھیں اس بات پر فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اردو زبان سیکھی ہے اور غزل کی محبت میں گرفتار ہیں۔ شیدا چینی کا پورا نام "Yung Van Liu" تھا۔ قلمی نام شیدا چینی تھا اور اسی نام سے مشہور بھی تھے۔ شیدا چینی کا خاندان عالمی جنگ کے بعد چین سے ہندوستان (کلکتہ) آیا اور پھر 1936 میں جمشید پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیدا کی پیدائش 10 جون 1931 کو کلکتہ میں ہوئی، لیکن کم سنی میں ہی اپنے والد کے ساتھ جمشید پور چلے آئے اور جمشید پور ہی ان کا مستقل مسکن بن گیا۔

ابتدائی تعلیم اُردو مڈل اسکول سے حاصل کی، میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے خاندانی پیشہ دندان سازی میں لگ گئے۔ ساتھ ساتھ شاعری میں مشق سخن بھی کرنے لگے۔ انھیں اردو سے کس قدر پیار تھا اس کا اندازہ خود ان کے ایک انٹرویو سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران شیدا چینی نے اردو سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''...اس میں کوئی شک نہیں کہ میری پہلی محبت شاعری ہے۔ میں اردو غزلوں، نظموں کے درمیان سانس لیتا ہوں اور یہی میرے وجود کا ثبوت بھی ہے۔ میڈیکل پریکٹس تو میرے لیے روزگار کا ایک ذریعہ ہے...''

شعر و شاعری میں انھوں نے جھارکھنڈ کے شہر جمشید پور سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر بی زیڈ مائل کی شاگردی اختیار کی اور بہت جلد ان کا شمار مائل کے چہیتے شاگردوں میں ہونے لگا۔ مائل کا تعلق چونکہ ترقی پسند تحریک سے تھا لہٰذا ان کے شاگرد شیدا چینی بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ شیدا کو شاعری میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی، 1958 میں منعقد کلکتہ کے کل ہند مشاعرے میں بحیثیت شاعر ان کی پہلی شرکت تھی۔ جس میں انھیں کافی داد ملی تھی۔ اس کے بعد مشاعروں میں شرکت کا ان کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1958 کو کلکتہ کے آل انڈیا مشاعرہ جس میں عندلیب شادانی، آل احمد سرور اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جیسے نامور دانشواران ادب شریک تھے شیدا نے ایک غزل پڑھی جسے سن کر مذکورہ دانشوروں نے داد و تحسین سے خوب خوب نوازا، اس مشاعرے میں پڑھی گئی شیدا کی غزل کے چند اشعار نذر قارئین کرتا ہوں جس سے شیدا کی غزلوں کی سحر انگیزی اور معنی خیزی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

کھل بھی جاؤ کہ لوگ کہتے ہیں
بے سبب برہمی نہیں ہوتی
حوصلہ چاہیے محبت میں
بزدلی عاشقی نہیں ہوتی
لذت گفتگو نہیں ملتی
بات جب آپ کی نہیں ہوتی
زندگی آشنا نہ ہو جب تک
شاعری شاعری نہیں ہوتی

1980 میں شہر رانچی میں منعقد کل ہند مشاعرے میں اگرچہ ملک گیر سطح کے بڑے بڑے شعراء نے شرکت کی تھی لیکن اس مشاعرے میں بھی شیدا کا استقبال اور ان کی شاعری پر داد کی خوب برسات ہوئی۔ ایک چینی نژاد شاعر کے اسٹیج پر آتے ہی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔ ایک چینی کی زبان سے فصیح و بلیغ اُردو سن کر اور اشعار کے انداز پیش کش سے لوگ حیرت زدہ تھے، جیسا کہ خود شیدا چینی کے بقول غزل کی محبت میں گرفتار تھے۔ لہٰذا وہ بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر تھے۔ شیدا کی غزلیں معنی آفریں، گہرائی و گیرائی کے ساتھ الفاظ کی بندش کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کی شاعری کا معیار کافی بلند ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار نذرِ قارئین ہیں:

رقصاں تھے جبر و غارت قاتل تمام رات
شعلہ نماں تھے لاشۂ بسمل تمام رات
لہروں کی چیخ تھی نہ کوئی ناؤ آس پاس
کیسا وہ شور تھا لب ساحل تمام رات
کرتے کہاں قیام مسافر کے پایہ عزم
شیدا ملی نہیں کوئی منزل تمام رات

انسان اپنی زندگی کے طویل مرحلے میں خوشی وغم، رنج والم اور مسرت وشادمانی کے حالات وکیفیات سے دوچار رہتا ہے۔ شیدا مشکل حالات کا خوگر بننے کی ہدایت بھی کرتے ہیں اور حصول شادمانی کے لیے مشکلات ومصائب کے جھیلنے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خوشیوں کے ساتھ رنج کی عادت بھی ڈالیے
چاہت گلاب کی ہے تو کانٹے بھی پالیے
شیدا بدلتے رخ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ
اک ایک لفظ کو نئے سانچے میں ڈھالیے

شیدا اگرچہ غزلوں کے شاعر تھے لیکن انھوں نے دوسرے اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نعت کو سب سے مشکل ترین صنف مانا جاتا ہے بلکہ بعض محققین نے نعت گوئی کی صنف کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ شیدا نے اردو کے دیگر شعرا کی طرح صنف نعت پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی ایک نعت کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

ثنا خواں ہے گلستاں ہو کہ ہو صحرا محمدؐ کا
غرض کہ ایک اک ذرہ ہے گرویدہ محمدؐ کا
نگاہوں میں ہے اس کی ہیچ عالم کی جہاں بانی
سمایا سر میں جس انسان کے سودا محمدؐ کا
دل گیتی ہوا روشن جو نور شمع قرآں سے
رہے گا حشر تک احساں یہ پائندہ محمدؐ کا
نگاہوں کے اندھیرے دور کرواے جہاں والوں
فروزاں ہر طرف عالم میں ہے جلوہ محمدؐ کا
رہِ حق سے بھٹکتے دیکھ کر آج اہل ایماں کو
خدا شاہد بہت دلگیر ہے شیدا محمدؐ کا

زبانوں کا تعلق اگرچہ کسی مذہب سے نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص جغرافیائی اور تہذیبی خطے میں بسنے والے لوگ چاہے وہ کسی بھی مذہب، رنگ، نسل و ذات سے تعلق رکھتے ہوں ان کی مشترکہ وراثت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مخصوص مذہب کوئی مخصوص زبان اختیار کرلے لیکن خود زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے آج اُردو زبان کو ایک مخصوص مذہب سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس بات کا شدید احساس شیدا چینی کو بھی تھا لہٰذا اپنے ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے اُردو زبان کے متعلق ان کے خیالات کے بارے میں سوال کیا گیا تو ان کا کہنا تھا:

''اُردو ایک شیریں زبان ہے جو عوام کے دلوں سے برآمد ہوئی لیکن یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ اس زبان کو ایک مخصوص فرقے سے جوڑ دیا گیا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی زبان عوام کے درمیان اس کے استعمال سے پنپتی ہے، چاہے وہ گجراتی ہو، مراٹھی، پنجابی یا کوئی اور زبان ہو جن زبانوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کا مخصوص علاقوں سے تعلق رہا ہے۔ اور عوامی سطح پر بلا لحاظ مذہب و ملت یہ زبانیں استعمال کی جاتی ہیں۔ جب کسی زبان کو ایک مخصوص فرقے سے وابستہ کردیا جاتا ہے تو اس کی روح زائل ہو جاتی ہے۔ منشی پریم چند اور رگھو ر سہائے فراق گورکھپوری کے کارناموں کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ یہ دونوں مسلمان نہیں تھے لیکن اُردو زبان میں ان کے شاہکاروں کو کوئی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اس زبان نے ایک عظیم رول ادا کیا ہے۔''

شیدا کا ایک شعری مجموعہ جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے 'لکیروں کی صدا' کے عنوان سے 2009 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس شعری مجموعے میں عرض شیدائی کے تحت منظر کلیم رقمطراز ہیں:

''دو تجربے ایسے ہیں جس نے شیدا چینی کی زندگی اور شاعری کو خاصا متاثر کیا اول ملک پر چین کی جارحیت اور دوسرا جمشید پور کا فرقے وارانہ فساد۔

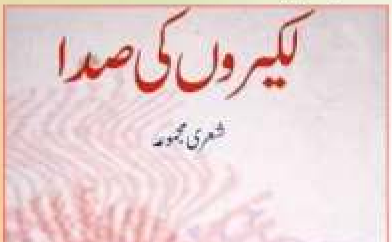

کیونکہ ہندوستان پر چین کے حملے کے بعد وہ حکومت کی نگاہ میں مشکوک ہو گئے، اور ان پر پابندی عائد ہو گئی۔ حصار بندی کا یہ زمانہ ایک دندان ساز کے لیے قابل برداشت ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک فنکار کے لئے ذہنی اور نفسیاتی اذیت سے کم نہ تھا۔ دوسرا تجربہ جمشید پور کا فرقے وارانہ فساد تھا جس نے شاعر کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔''

یہی وجہ ہے کہ نسلاً چینی ہونے کے باوجود شیدا نے 'مزدور آواز' کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر 1962 کے بھارت چین جنگ میں چین کے کردار کی سخت مخالفت کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس جنگ کے دوران ہونے والے اکثر مشاعروں میں چین کی غلط پالیسیوں کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف آواز بلند کی بلکہ چین مخالف شاعری کے ذریعہ خود کو محب ہندوستان ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اسی طرح ان کی ایک مشہور غزل ہے جس کے بارے میں رائے ہے کہ اس غزل کو 1979 میں جمشید پور میں ہونے والے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ جمشید پور کے اسی فساد میں اُردو کے مشہور فکشن نگار زکی انور کو شہید کردیا گیا تھا۔ اس فساد میں کافی جان و مال کا نقصان ہوا تھا۔ فساد کے بعد کافی دنوں تک شہر کی فضا بوجھل اور سوگوار تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک فنکار کا دل کافی حساس ہوتا ہے اور نہ صرف وہ اپنی ذاتی زندگی تک محدود ہوتا ہے بلکہ آس پاس کے ماحول سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنے فن پارے میں کرتا ہے۔ لہٰذا شیدا چینی کی اس غزل کو جمشید پور کے فساد کے پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے:

دنیائے پر بہار کا موسم اداس ہے
تیرے بغیر پیار کا موسم اداس ہے
شعلہ کچھ اور دل کی تڑپ کا جگائیے
شب ہائے انتظار کا موسم اداس ہے
کچھ ہم کو راس آ گئی پابندیٔ فضا
کچھ ان کے اختیار کا موسم اداس ہے
کیا گردش جہاں کی ہے تلخی بڑھی ہوئی
کیوں نشہ و خمار کا موسم اداس ہے
ترغیب اپنی آبلہ پائی کو دیجیے
صحرائے خارزار کا موسم اداس ہے

شیدا چینی کو اردو زبان وادب میں اُن کی خدمات کے صلے میں کئی اعزازات سے نوازا گیا، جن میں انجمن ترقی اُردو ہند کی جانب سے خصوصی ایوارڈ، فراق گورکھپوری ایوارڈ، ہندی ساہتیہ سمیلن کا تلسی سمان شامل ہے۔ بلاشبہ اردو دنیا میں کئی اہم غیرملکی شعراء وادبا، ہوئے جنھوں نے اردو زبان وادب کے ذخیرے کو اپنی تحقیقات اور نگارشات سے مالا مال کرکے اردو زبان وادب کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا لیکن شیدا چینی کو بعض لحاظ سے انفرادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ شیدا چینی کی وفات 7 مارچ 2015 کو جمشید پور میں ہوئی۔ بلاشبہ اُردو شعروشاعری کی دنیا غیرملکی شعرا کی صف میں اور خاص طور پر چین کے تعلق سے شیدا چینی ایک درنایاب تھے جس کا دیدار دنیا کو بہت کم نصیب ہوتا ہے۔

■

Dr. Mohd Imran
Makka Masjid Gali, Nizam Nagar, Hindpiri
Ranchi - 834001 (Jharkhand)

ناندیڑ میں اردو صحافت

ضیاءالحسن

آزادی سے قبل شہر ناندیڑ ضلع کا مستقر ہونے کے باوجود ایک چھوٹا شہر تھا۔ ضلع مستقر پر صرف ایک ہائی اسکول اور تعلقہ جات پر پرائمری اور مڈل اسکول ہوا کرتے تھے۔ خواندگی کی شرح بہت کم تھی۔ شہر پر دیہاتی زندگی کی چھاپ تھی۔ فانی بدایونی نے اُس وقت کے ناندیڑ (1938) کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے۔

جس طرف دیکھیے اک عالم ہو کی تصویر
جس طرف جایئے وحشت سے فضائیں معمور
زندگانی ہے یہاں گرچہ نہایت دشوار
حکم ارباب قضا سے ہوں بغایت مجبور

(سرگزشت ناندیڑ۔ کلیات فانی)

عوام میں نہ تو اتنا سیاسی شعور تھا اور نہ وہ سیاست میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ مطالعے یا اخبار بینی کا ذوق بہت کم تھا۔ ان حالات میں ناندیڑ جیسے شہر تو کیا اطراف واکناف کے اضلاع سے بھی کسی اخبار کا جاری ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ البتہ چند تعلیم یافتہ گھرانوں میں اردو اخبارات ورسائل پابندی سے آیا کرتے تھے۔ ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لیے اردو اخبارات کے قارئین میں ہر فرقے کے لوگ شامل تھے حیدرآباد سے شائع ہونے والا روزنامہ رہبر دکن عوام میں مقبول تھا۔

راقم الحروف کے ایک عزیز اور 1932 کے گریجویٹ ابوالخیر صہبا (اصل نام: سید ابراہیم حسینی) جو اس وقت مدرسہ فوقانیہ، ناندیڑ کے طالب علم تھے، اپنے پسندیدہ شعرا کا کلام مختلف اخبارات سے مکمل حوالوں کے ساتھ اپنی بیاض میں نقل کیا ہے۔ مثلاً رہبر دکن، حیدرآباد (1932) ایڈیٹر سید احمد محی الدین صاحب، اخبار خلافت، بمبئی (جلد اول 1923) ایڈیٹر علی بہادر خاں، عبدالغنی بی۔ اے (علیگ)، اخبار مدینہ، بجنور 30 رمضان 1340ھ وغیرہ۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دور آصف جاہی میں بھی ناندیڑ میں حیدرآباد کے علاوہ ملک کے دوسرے مقامات سے اخبارات آتے تھے۔

راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق ناندیڑ کا پہلا اردو اخبار 'ہنگامہ' ہے جسے اُس وقت کے نوجوان اور بے باک صحافی محمود عشقی نے جون 1954 میں جاری کیا تھا۔ (اصل نام: مرزا محمود بیگ، سابقہ قلمی نام: ساغر اقبال، (14 نومبر 1932 تا 30 جنوری 2005) مرحوم نے ایک نجی گفتگو میں مجھے بتایا تھا کہ اُس وقت ناندیڑ سے کوئی مراٹھی اخبار بھی شائع نہیں ہوتا تھا۔ ہفت روزہ 'ہنگامہ' اسم بامسمّیٰ ثابت ہوا۔ اس کی پہلی ہی اشاعت پر مخالفین نے گیارہ قانونی نوٹسیں بھیجیں لیکن ایڈیٹر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہنگامہ کچھ عرصے تک ہنگامہ مچانے کے بعد خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد محمود عشقی نے دوسرے ناموں سے (چٹان 'لام الف وغیرہ) اخبارات نکالے جو یکے بعد دیگرے بند ہوتے گئے۔ شاید اس کی وجہ مالی مشکلات' ایڈیٹر کی ملازمت سے وابستگی بھی ہوسکتی ہے۔ 1952 میں محمود عشقی نے حمید اختر (عبدالحمید خان) اور مرخ شاذلی کے اشتراک سے ایک قلمی رسالہ 'معیار' اور 1971 میں مقبول سلیم کے تعاون سے 'لعل میگزین' جاری کیا تھا۔ اُن کی پہلی تخلیق روزنامہ میزان، حیدرآباد 1947 میں شائع ہوئی تھی۔ ناندیڑ کے کئی اردو اخبارات ان کی تحریک پر جاری ہوئے تھے۔

محمود عشقی نے 1951 میں چادر گھاٹ کالج، حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ اُس وقت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کالج کے پرنسپل تھے۔ عشقی صاحب کالج میگزین' فکر نو' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ 1952 تا 1988 وہ بحیثیت کلرک عثمان شاہی ملز، ناندیڑ میں ملازم رہے۔ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا سفر کیا تھا۔ ان کے مزاج میں شوخی تھی جو اُن کی تحریروں اور کلام سے بھی جھلکتی ہے۔

سب کو نیزوں پہ اچھالو یارو
کوئی اخبار نکالو یارو

ان کا ادبی حلقہ بہت وسیع تھا۔ سکندر علی وجد کے بہ سلسلۂ ملازمت ناندیڑ میں قیام کے دوران عشقی صاحب شہر کے واحد شخص تھے جنھیں حضرتِ وجد سے قربت حاصل تھی۔ مقامی اخبارات ایک عرصے تک ان کے رشحاتِ قلم سے فیض یاب ہوتے رہے۔ محمود عشقی اگر سنجیدگی سے پیشۂ صحافت کو اپناتے تو وہ یقیناً ایک کامیاب صحافی ثابت ہوسکتے تھے۔ کیوں کہ شاعری کے علاوہ نثر نگاری پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ افسوس کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار کی کوئی کاپی محفوظ نہیں رہ سکی۔

اس کے بعد ایک مقامی شاعر عبدالقیوم قیس نے ہفتہ وار 'سحر' جاری کیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے مرزا احمد علی بیگ چغتائی (1922 تا 1985) نے حاصل کرلیا اور 15 اگست 1960 سے اپنی وفات تک پابندی سے شائع کرتے رہے۔ 26 فروری 1982 سے ہفتہ وار 'سحر' روزنامے میں تبدیل ہوگیا۔ یہ ناندیڑ کا پہلا اردو روزنامہ ہے مگر نجانے کیوں RNI کی فہرست میں اس کا نام شامل نہیں۔ توفیق مرزا آج کل اس اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ مرزا احمد علی بیگ چغتائی نے مدرسہ فوقانیہ، ناندیڑ سے شعبۂ فنون میں میٹریکولیشن کیا تھا۔ 1956 میں محکمۂ مال کی ملازمت ترک کرکے وہ صحافت کی جانب مائل ہوئے۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انھوں نے روزنامہ سیاست، حیدرآباد کے نامہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ اُن کی تالیف کردہ کتاب 'تاریخ ناندیڑ دکن' 1961 میں ادارہ 'ادبیات اردو'، حیدرآباد نے شائع کی تھی۔ مرحوم تعمیر ملت کے رکن اور جمعیت العلماء ہند شاخ ناندیڑ کے معتمد بھی رہے۔ ہند پاک جنگ کے دوران 8 ستمبر تا 20 نومبر 1965 (75 دنوں تک) حکومت نے انھیں قید وبند میں رکھا تھا۔

محمد بن عبدالعزیز بلغراف جو شہر میں چاند چچا کے نام سے مشہور تھے ایک ہفت روزہ 'ناندیڑ ٹائمز' جاری کیا تھا۔ کافی عرصہ بعد اسے ایک مقامی لیڈر محمد مقبول سلیم نے حاصل کرلیا۔ سائنس اور قانون کی ڈگریاں رکھنے والے

یہ رہنما اُس وقت انڈین یونین مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صدر بلدیہ منتخب ہوئے تھے۔

ناندیڑ ٹائمز کی ادارت عبدالواحد (جنید احمد) کو سونپی گئی جو ایک نوجوان اور باصلاحیت صحافی تھے۔ لیکن چند بہاریں دکھلانے کے بعد دشت صحافت کا یہ ننھا پودا مرجھا گیا۔ جنید احمد بھی چند سال پہلے کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ 1980 میں ہفتہ وار ناندیڑ ٹائمز کا ٹائٹل ایک اور باصلاحیت خوددار صحافی اور شعلہ بیان مقرر سید بلیغ الدین ثاقب نے حاصل کیا۔ 21 نومبر 1991 سے ناندیڑ ٹائمز روزنامے کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ یہ ناندیڑ کا پہلا روزنامہ ہے جس کے اجرا پر ایک خاکہ لکھا گیا تھا جو بعد میں 'جاری ہوتا ایک اردو روزنامے کا' کے عنوان سے ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد (مئی 1992) میں شائع ہوا۔

ایک قابل شخصیت اور سابق ایم-ایل-اے پروفیسر نوراللہ خان روزنامہ ناندیڑ ٹائمز کے ذمے داروں میں سے تھے۔ محمد افضل پوسدی' محمود علی سحر' زبیر احمد' محمد شبیر پٹیل' اعجاز خان (ابن ایوب) کا قلمی تعاون اسے حاصل تھا۔ راقم الحروف بھی مجلس ادارت میں شامل تھا۔ طنزیہ و مزاحیہ کالم 'تلخ و شیریں' اور ہفتہ وار ادبی صفحے کی ترتیب وغیرہ راقم الحروف کے ذمے تھی۔ ناندیڑ ٹائمز کے اداریے' سیاسی مضامین اور تراجم وغیرہ معیاری ہوا کرتے تھے۔ ہفتہ وار مذہبی' ادبی اور تعلیمی صفحات شائع کرنے والا یہ پہلا مقامی روزنامہ تھا۔ ملی اور قومی مسائل چاہے وہ کسی نوعیت کے ہوں اخبار میں بے باکی سے پیش کیے جاتے تھے۔ ناندیڑ کے عوام کو اس اخبار سے کافی امیدیں وابستہ تھیں لیکن چند ماہ بعد یہ روزنامہ مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ بلیغ الدین نے اسے معاشی بحران سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اخبار سے جڑے بڑے بڑے ناموں میں سے کسی ایک نے بھی دست تعاون نہیں بڑھایا۔ ایڈیٹر کو مجبوراً اس کی اشاعت مسدود کرنا پڑی۔ شہر ناندیڑ سے دل لگائے رکھنے والے سید بلیغ الدین نے اپنی صحافتی زندگی کا سفر روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد کے نامہ نگار کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ ناندیڑ ٹائمز کے بند ہو جانے کے بعد انھوں نے ہفت روزہ 'رہنمائے ناندیڑ' جاری کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد منتخب الدین نامی نوجوان کی ادارت میں 'روزنامہ ناندیڑ ٹائمز' دوبارہ شائع ہونے لگا ہے۔

محمد تقی (سابقہ قلمی نام تقی راہی) ایم-اے، بی ایڈ کرنے کے بعد پیشۂ تدریس سے وابستہ ہو چکے تھے۔ لیکن ملازمت ترک کر کے پیشۂ صحافت کو اپنا لیا۔ ابتدا میں انھوں نے ایک ہفتہ وار 'ناندیڑ گزٹ' جاری کیا تھا۔ اُن کا روزنامہ 'ورق تازہ' 2006 سے ناندیڑ سے نکل رہا ہے۔ ابتداً 1994 یہی روزنامہ پربھنی سے شائع ہوتا تھا۔ 'ورق تازہ' پابندی سے شائع ہونے والا ایک مقامی روزنامہ ہے۔ ملی اور مقامی مسائل سے متعلق خبروں کو اس میں خاص طور سے جگہ دی جاتی ہے۔ اخبار میں ادبی مضامین اور شاعروں، ادیبوں کے گوشے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مذہبی، ادبی، فلمی صفحات بھی ہوتے ہیں۔ عیدین اور خاص خاص موقعوں پر اعلیٰ درجے کے کاغذ پر ورق تازہ کے دلکش اور جاذب نظر ضمیموں کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ محمد تقی کے مضامین دیگر اردو اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں صحافت کا ایک ایوارڈ مل چکا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے ورق تازہ کے ایڈیٹر کے طور پر محمد تقی کے فرزند محمد نقی کا نام چھپ رہا ہے۔ جب کہ سابق ایڈیٹر اب اعزازی مدیر بن چکے ہیں۔

ایک نوجوان الطاف ثانی نے صحافت کو سرکاری ملازمت پر ترجیح دی اور اخبار 'جگمگاہٹ' 1988 سے اپنی صحافتی زندگی کی شروعات کی۔ لیکن گیارہ ماہ بعد اس اخبار کی جگمگاہٹ ماند پڑنے لگی اور پھر یہ بند ہو گیا۔ 2008 سے وہ ایک ذولسانی (اردو/مراٹھی) اخبار 'ناندیڑ عالمی تحریک' نکال رہے ہیں۔ الطاف ثانی' مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے رکن رہ چکے ہیں۔

ایک اور نوجوان محمد صادق نے 1993 میں ہفت روزہ 'شالیمار نیوز' جاری کر کے میدان صحافت میں قدم رکھا تھا۔ آفسیٹ پر چھپنے والا شہر کا یہ پہلا اخبار تھا۔ اس لیے اس کی کتابت و طباعت عمدہ ہوا کرتی تھی۔ یہ اخبار 1998 تک نکلتا رہا۔ محمد صادق بعد میں روزنامہ 'منصف'، حیدرآباد کے نامہ نگار بن گئے۔ پھر 2001 سے انھوں نے اپنا روزنامہ 'یقین' جاری کیا جو کئی سال تک نکلتا رہا۔ بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر عین اپنے شباب کے زمانے میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ 2010 سے یہ اخبار 'کامل یقین' کے نام سے محمد صادق کے عزیز محمد عمران کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ محمد صادق ایم-اے (اردو) ہیں اور سماجی کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں۔

روزنامہ 'تہلکہ ٹائمز' محمد طاہر سوداگر کی ادارت میں 1995 سے شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اخبار 'سحر' کے رپورٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ تبھی سے وہ صحافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ پریس فورم ناندیڑ نے انھیں 'جیون گورو پرسکار' سے نوازا ہے۔ عیدین وغیرہ کے موقعوں پر 'تہلکہ ٹائمز' کے رنگین شمارے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

روزنامہ 'بول چال'، 2008 سے جاری ہے جس کے مدیر محمد صابر بابو راج ہیں۔ اس اخبار کی اپنی ایک ایمبولنس سماجی خدمات کے لیے وقف ہے۔ روزنامہ 'ناندیڑ ڈائری' شہر کا پہلا شامنامہ ہے جو محمد یوسف کی ادارت میں 1994 سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ دوسرا شامنامہ 'ناندیڑ رہبر' پیار محمد نے جاری کیا۔ پہلے یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ 2010 سے محمد یوسف (ایڈیٹر ناندیڑ ڈائری) کی اہلیہ صابرہ بیگم اپنی ادارت میں روزنامہ 'اودا ٹائمز' نکال رہی ہیں۔ یہ ایک ذولسانی (اردو/مراٹھی) اخبار ہے۔ ایک زمانے میں اقبال مدھیکر مرحوم روزنامہ 'سمیر ٹائمز' نکالا کرتے تھے۔ لیکن مختلف مسائل کا شکار ہو کر یہ بند ہو گیا۔ روزنامہ 'نغوش' کے مدیر عبدالستار عارف ہیں۔ ابتدا میں اس اخبار کا نام 'نقوش' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر اس کے املا میں تبدیلی کی گئی اب یہ انگریزی میں NAGUSHE ہے تو مراٹھی میں 'نگوشے'۔ لغات سعیدی میں 'نغوش' کے معنی مرتد ہو جانے اور دین سے پھر جانے کے ہیں۔ اس اخبار کو محمود عشقی اور پروفیسر م-خ-شاذلی جیسی ذی علم شخصیات کے علاوہ سید شاہ مصطفیٰ قادری' محمد یعقوب نواب اور محفوظ احمد خان کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ ایڈیٹر کو صحافت کا ایک ایوارڈ مل چکا ہے۔

ناندیڑ کے ایک انتہائی متمول تاجر عبدالواحد جن کا ذاتی پریس تھا اور جنھیں بفضل تعالیٰ ہر طرح کی سہولیتیں میسر تھیں ایک روزنامہ 'صبح مہاراشٹر' جاری کیا تھا۔ مگر شاید دور اندیش تاجر کو اس تجارت میں بجائے نفع کے خسارہ نظر آیا اس لیے صبح مہاراشٹر جلد ہی شام کے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔ دولت کی فراوانی کے باوجود بند ہو جانے والا ناندیڑ کا یہ پہلا اخبار ہے۔ بہت پہلے مراٹھی روزنامہ 'لوک پتر' نے اسی نام سے اردو روزنامہ جاری کیا تھا۔ جس کے صرف چند شمارے نکل پائے۔ روزنامہ 'گوداوری آبزرور' بھی آر این آئی کی لسٹ میں شامل ہے۔

روزناموں کے علاوہ ناندیڑ سے شائع ہونے والے کئی اردو ہفت روزہ اخبارات آر-این-آئی کی فہرست میں شامل ہیں۔ سردار چرن سنگھ جو ایک شاعر تھے 'میل جول' کے نام سے اردو ہفتہ وار نکالا کرتے تھے جس میں مقامی اور قومی یکجہتی سے متعلق خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ایک عرصے تک یہ اخبار نکلتا رہا۔ ناندیڑ کے تعلقہ دیگلور سے اردو شاعر اور سوشلسٹ لیڈر جوش محمد آبادی (اصل نام: غوث محی الدین) نے ہفت روزہ 'حالات' جاری کیا تھا جو ان کی وفات تک برابر نکلتا رہا۔ عبدالرحمن خوشتر ایک اچھے شاعر تھے۔ اُن کی ملازمت عثمان شاہی ملز ناندیڑ میں

تھی۔ خوشتر صاحب نے ہفت وار 'بیباکی' جاری کیا تھا۔ کافی عرصے بعد کانگریس کے ایک مقامی لیڈر (موجودہ ڈپٹی میئر) محمد شفیع قریشی جو انگریزی ادب میں ایم-اے ہیں 'بیباکی' کا ٹائٹل حاصل کرلیا۔ اس اخبار میں مقامی خبروں کے علاوہ ادبی 'نیم ادبی اور معلوماتی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

شہر کے ایک لائق اور سنجیدہ نوجوان عبدالحلیم خاں جاوید جنھوں نے دو مضامین میں ایم اے کیا ہے اور طلائی تمغہ یافتہ ہیں 1978 میں ہفت روزہ 'تاریخ' جاری کیا تھا۔ مواد، زبان، کتابت، طباعت کے اعتبار سے یہ اپنے ہم عصر مقامی اخبارات میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا۔ عبدالحلیم جاوید چونکہ پیشۂ تدریس سے وابستہ تھے شاید اس لیے وہ اس ذمے داری کو زیادہ دنوں تک نبھا نہیں سکے۔ 1982 سے یہ اخبار اُن کے ایک عزیز محمد اختر کی ادارت میں پربھنی سے شائع ہونے لگا تھا۔ ہفت روزہ 'تاریخ' نے 'مراٹھواڑہ منی کہانی نمبر' شائع کیا تھا۔ جس میں مشہور ادیب جوگندر پال کے علاوہ مراٹھواڑہ کے منتخب ادیبوں کی منی کہانیاں شامل تھیں۔ پچھلی صدی کی ساتویں دہائی میں حلیم جاوید 'جاوید زولہ زئی' کے قلمی نام سے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہے۔ ایک سوشل ورکر اور رکن بلدیہ عبدالرؤف نے ہفت روزہ 'ارتسام' جاری کیا تھا جو کئی دنوں تک شائع ہوتا رہا۔ غوث خان نے 1992 میں ہفتہ وار 'نیا قدم' نکالا تھا جو کئی سال تک نکلتا رہا لیکن ان کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔

پیشۂ تدریس سے وابستہ ایک سنجیدہ اور شریف نوجوان محمد زبیر احمد جو بی ایس سی' ایم اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں رکھتے ہیں۔ ایک ہفتہ وار 'دبستانِ ناندیڑ' 1996 میں جاری کیا تھا۔ جس میں تعلیم سے متعلق مضامین بڑے اہتمام سے شائع کیے جاتے تھے۔ ان مضامین سے ہائی اسکول کے اردو طلبہ کی رہنمائی ہوتی تھی۔ چند شماروں کی اشاعت کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ مہاجن نامی ایک مراٹھی داں نے 'ورت سکھا' کے نام سے اردو ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ اعجاز خاں کی ادارت میں ہفتہ وار 'مساوات' بھی کچھ دنوں تک نکلتا رہا ہفت روزہ 'لام الف' کے مدیر نذیر اختر بے پناہ ادبی وصحافتی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ایک پُر گو شاعر اور بہترین نثر نگار بھی تھے۔ ایک زمانے میں اُن کے یہ اشعار بہت مشہور ہوئے:

خدا کے ذکر پر تم کانپ کانپ جاتے ہو
خدا تمھاری اداکاریوں سے واقف ہے
ہزار سجدے کرو تم مگر خدائے بزرگ
تمھارے عجز کی مکاریوں سے واقف ہے

نذیر اختر تمام عمر انتہائی کم اجرت پر مقامی اخبارات کو اپنا قلمی تعاون دیتے رہے۔ یا یوں کہیے کہ زندگی بھر اُن کا استحصال ہوتا رہا۔ ان کے بعض مشاغل ان کی ترقی کی راہ میں حائل رہے۔ چنانچہ ایک باصلاحیت صحافی اور البیلا شاعر عین جوانی کے عالم میں 30 ستمبر 1997 کو اس جہان فانی سے کوچ کرگیا۔

محمد شبیر پٹیل پیشے سے وکیل ہونے کے علاوہ ایک فری لانس جرنلسٹ اور بہترین ادیب بھی ہیں۔ اُن کی بنیادی تعلیم مراٹھی زبان میں ہوئی لیکن وہ اردو زبان کی شیرینی اور شاعری کی لطافت سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے احساسات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے اسی زبان کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ان کے سیاسی مضامین حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے بصیرت افروز تبصرے ملک کے کثیرالاشاعت اردو روزناموں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد انھیں پسند کرتی ہے۔ بہاءالدین ایڈوکیٹ کے مضامین اور ترجمے اخبارات میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خالد انصاری (قمرالاسلام) مقامی اخبارات کے قلمی معاونین میں سے ہیں۔ قدیر کمال مرحوم بھی مقامی صحافت سے وابستہ رہے۔

ناندیڑ سے شائع ہونے والے اردو اخبارات تعداد میں مراٹھی اخبارات کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ لیکن کسی بھی اردو اخبار نے آج تک UNI اور PTI جیسی خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات حاصل نہیں کیں۔ ناندیڑ سرکل، ناندیڑ گونج، ناندیڑ گزٹ، رہنمائے ناندیڑ، نقوش، گوداوری آبزرور، لام الف، ارتسام، حق کی جنگ جیسے ویکلی RNI کے رجسٹرڈ ٹائٹل تو ہیں لیکن یہ اخبارات عام قاری کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہفتہ وار اخبارات دو چار اشاعتوں کے بعد بند ہوگئے۔ اکثر مقامی روزنامے شہر کے ایک حصے میں دکھائی دیتے ہیں دوسرے میں نظر نہیں آتے۔ یہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قواعد اور زبان کی غلطیاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مدیر حضرات کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ ناندیڑ کے محلّہ نعیم پورہ کے نوجوانوں کی کاوشوں کا ذکر یہاں ضروری ہے جنھوں نے تقریباً چھ دہائی قبل ایک اردو قلمی رسالہ 'نیو ایج' جاری کیا تھا جس کے شمارے دو نسلوں تک نکلتے رہے۔

پرنٹ میڈیا کے علاوہ ناندیڑ کے اردو صحافیوں اور قلمکاروں کی الیکٹرانک میڈیا سے وابستگی کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ پروفیسر یونس فہمی، پروفیسر م خ شاذلی، محمود عشقی، ڈاکٹر سید خواجہ عزیز الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی آکاشوانی اورنگ آباد کے اور اختر صادق، راقم الحروف وغیرہ آکاشوانی ناندیڑ کے Radio Talker رہ چکے ہیں۔

شہر کے ایک باصلاحیت اور محنتی نوجوان ضمیر احمد خان کو 2010 میں ای ٹی وی اردو نے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ ناندیڑ کی ایس آر ٹی ایم یونیورسٹی سے جرنلزم کی ماسٹر ڈگری حاصل کرنے والے وہ پہلے طالب علم ہیں۔ ابتدا میں اُنھوں نے مالیگاؤں (ضلع ناسک) میں اپنی خدمات پوری ذمے داری کے ساتھ انجام دیں پھر اُن کا تبادلہ ناندیڑ کردیا گیا۔ اس طرح ای ٹی وی اردو پر ضلع ناندیڑ اور اطراف واکناف کی خبروں کو کوریج ملنے لگا۔ ضمیر احمد خاں 2007 سے روزنامہ انقلاب ممبئی اور 2009 سے روزنامہ منصف، حیدرآباد کے نامہ نگار کی حیثیت سے بھی کام کررہے ہیں۔ وہ MCN اردو نیوز، ناندیڑ کے بیورو چیف ہیں۔ حال ہی میں انھیں حکومت مہاراشٹر کے 'مولانا ابوالکلام آزاد صحافتی ایوارڈ' 2012 سے نوازا جاچکا ہے۔

الیکٹرانک صحافت سے جڑے ایک اور ہونہار نوجوان ضیاء وحید (سید ضیاءالدین وحید) ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم سی جے پوسٹ گریجویٹ کورسیز کرنے کے بعد انھوں نے روزنامہ راشٹریہ سہارا اور روزنامہ اعتماد حیدرآباد میں بطور سب ایڈیٹر کام کیا۔ پھر اُن کا تقرر ای ٹی۔وی اردو حیدرآباد میں ہوگیا جہاں چھ سال تک انھوں نے بلیٹن پروڈیوسر اور اسسٹنٹ ان پُٹ انچارج کی خدمات انجام دیں۔ 17 نومبر 2013 سے ضیاء وحید نے شہر ناندیڑ میں MCN (مراٹھواڑہ کیبل نیٹ ورک) سے مقامی اردو نیوز نشریے کا آغاز کیا۔ وہ MCN اردو نیوز کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ خبریں دن میں چھ بار نشر ہوتی ہیں۔ خبروں کو وسعت دینے اور انھیں موثر بنانے کے لیے ان کی کوششیں جاری ہیں۔ اس کے علاوہ ضیاء وحید ANI کے لیے 'ناندیڑ' پربھنی اور ہنگولی اضلاع کی رپورٹنگ کی ذمے داری بھی نبھاتے ہیں۔ ان کے کئی عمدہ مضامین قومی سطح کے اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔

مختصر یہ کہ ناندیڑ میں صحافت کا سفر گزشتہ چھ دہائیوں سے جاری ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ یہاں کے صحافی، اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے اژدہام کے درمیان اپنی اپنی شناخت بنانے میں مصروف ہیں۔ لیکن اس کے لیے سخت محنت اور جد و جہد کی ضرورت ہے۔ توقع کی جانی چاہیے کہ مستقبل میں ان کا معیار اور بہتر ہوگا۔

■

Dr. Zia-ul-Hasan
Hazrat Peer Burhan Chowk, Lane 15
Nanded - 431605 (Maharashtra)
Mob.:09764127458

ریحان انصاری

تکنیکی سطح پر اردو زبان کو چیلنجز

دنیا میں ٹکنالوجیز کا ریلا جاری ہے۔ ہر دن سورج طلوع ہونے کے ساتھ ایک نئی تکنیک بھی سر ابھارتی ہے۔ میڈیا؛ جسے اب 'میڈیا انڈسٹری' بھی کہا جانے لگا ہے؛ کے ذریعے دنیا میں سب سے پہلے معلومات اور تازہ ترین (بریکنگ) خبروں کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میڈیا ان خبروں کی اشاعت کے لیے جدید ترین ٹکنالوجی کا سہارا لے رہا ہے۔ انھیں ٹکنالوجیز کی وجہ سے معلومات وخبروں کا اندازِ اشاعت بھی روزانہ بدلتا رہتا ہے۔ بسا اوقات ایک خبر کسی سائنسی فکشن فلم کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ میڈیا انڈسٹری کا دوسرا سرا یعنی قاری وناظر اب 'صارف' بن چکا ہے جسے انڈسٹری اس کی من چاہی ڈشیں پروستا ہے یعنی وہ جو چاہتا ہے اسے حسبِ طلب (کسٹمائزڈ) خبریں یا دیگر مواد پیش کرتا ہے۔ ایسے میں ہماری اپنی بھاشا یعنی اردو کس مقام پر کھڑی ہے؟ یعنی اپنے صارف کے لیے کیا کیا پروسنے کے قابل ہوئی ہے؟

لکھنے کے لیے زبان کا سیدھا سا مطلب اس کا رسم الخط ہوتا ہے، لپی ہوتی ہے۔ اب دیکھیے نا کہ اردو یا ہندی یا مراٹھی کو ہی رومن میں لکھ دیا جاتا ہے تو اسے نہ روانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ ہی لکھا جا سکتا ہے۔ اس کا تلفظ ادا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ انگریزی کو آپ اردو یا ناگری میں لکھ لیجیے تو انگریز چکرا جائے گا۔ آپ دوسری زبانوں کو بھی اسی کی مانند سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے زبان کا اصلی ٹول Tool' اس کا رسم الخط ہی ہے۔ چند ممالک انگریزی کو بین الاقوامی رابطے کی زبان تسلیم نہیں کرتے۔ انگریزی کو فی الوقت ہم دنیا کی لنگوا فرینکا Lingua franca تسلیم کریں یا نہ کریں مگر دیکھا جا رہا ہے کہ میڈیا کی جدید ترین تحقیقات اور ٹکنالوجیز سب سے پہلے اسی کے آنگن میں جلوہ افروز ہوتی ہیں اس کے بعد دوسری زبانوں اور ممالک میں داخل ہوتی ہیں۔ ایسے میں کیا ہماری پیاری زبان 'اردو' ٹکنالوجیز کے میدان میں پچھڑی ہوئی ہے؟... اس سوال کا جواب اتنا سادہ سا نہیں رہ گیا ہے کہ ہاں یا نہیں کہہ دیا جائے۔ اگر 'ہاں' کہا جائے تو اس کے اسباب کا بیان لازمی ہے اور اگر 'نا' کہا جائے تو ٹکنالوجیز کے وسیع تر افق پر اس کے قابلِ ذکر وجود کو اجاگر اور محسوس کرنا ہوگا۔ ہم وقت کا خیال کرتے ہوئے طویل تر تکنیکی تفصیل میں نہیں جائیں گے البتہ اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ "اگر ہم اردو والے چاہیں تو اردو میڈیا بھی اپنے معاصرین کے درمیان جدید ترین ٹکنالوجی کے بالکل ہم پلہ نظر آئے گا۔ اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ اردو والے اہلِ دول ومناصب اس جانب بے حد بخیل جذبات رکھتے ہیں؛ وہ ایک بات جو درمیان میں بہت مشہور ہوئی تھی اسی کی مانند کہا جا سکتا ہے کہ... اردو والو! تمھیں اپنے بچوں کی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہے کیا!''...... اردو والوں کے یہاں ایسی ایسی صلاحیتیں موجود ہیں کہ ان کی سرپرستی کرنے کے بعد جدید ٹکنالوجی بالکل عرب ملکوں ('عربی زبان' پڑھیں) کی مانند اردو کے ساتھ گھل مل جائے گی۔ بات صرف اس کے رسم الخط کے استعمال کی تو ہے۔ ظاہری طور پر یعنی فرنٹ اینڈ Front end میں بھی اور باطنی طور پر بھی یعنی پروگرامنگ اور بیک اینڈ Back end میں بھی۔ اس میں ذہین اور باصلاحیت ذہنوں اور ماہر تجزیہ کاروں کی کچھ جدا جدا ٹیموں کی ہر قسم کی سرپرستی کی جائے تو کچھ ہی عرصے میں سارا منظرنامہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ آپ کو کمپیوٹر کا انٹرفیس اور اس کا ہر کونہ اردو زبان سے مزین ملنے لگے گا۔ اور ایک معمولی سا اردو داں شخص بھی اس کا استعمال اپنے مقصد وضرورت کے مطابق کرنے لگے گا۔ اس میں تکنیکی ماہرین کے ساتھ ہی لسانی ماہرین کا تال میل لازمی ہے۔

انٹرنیٹ کا استعمال عام ہوجانے کے بعد اردو دنیا بھی گلوبل ہوچکی ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں بڑا خلا موجود ہے۔ آج ہر شعبۂ زندگی کمرشیل ہو چکا ہے۔ اسی لیے اردو پر خرچ کرنے سے متعلق بھی لوگوں کے نزدیک یہی پیش نظر رہتا ہے کہ ہمارا کیا فائدہ۔ زبان سے زیادہ لوگ اپنی جیب کا دھیان کرنے لگے ہیں... اس زاویے سے دیکھا جائے تو ہم سب اپنی زبان کے لیے قربانیاں دینے کو تیار نہیں ہیں اور دوسروں کی ٹکنالوجی پر منحصر ہونا ہماری فطرت ہے۔ اپنے جو ہر ہمیں پر نہیں کھلتے۔ ایک اور بہت بڑی اڑچن یا چیلنج یہ بھی ہے کہ اردو کا کوئی بھی سافٹ ویئر بہت ہی سرعت کے ساتھ تکنیکی قزاقی Piration یا سرقے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس زاویے میں مثبت سوچ اتنی سی ہے کہ اردو والوں کی ضرورت بہت زیادہ ہے، یعنی مارکیٹنگ کی زبان میں ڈیمانڈ زیادہ ہے اور سپلائی کم، اسی لیے وہ محنت کرنے والوں کے خلاف بڑی بے دردی و بے رحمی کے ساتھ اپنی صلاحیت اور لالچ استعمال کر جاتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اردو کے نت نئے اور حیرت خیز کام سامنے آتے ہیں مگر اسی تکنیکی سرقے سے سافٹ ویئر بنانے والوں کا دم اور بھرکس نکل جاتا ہے..... نیز اس کا منفی پہلو یہ نکلتا ہے کہ محنت کرنے والے مزید ہمت اور محنت کے لیے دوسرے غیر اردو میدانوں کی جانب نکل جاتے ہیں؛ اور اردو پھر بے چاری بھرے بازار میں اپنی عفت کو چھپانے کی سعی ناکام کرتی نظر آنے لگتی ہے۔

حسن کو شرمسار کرنا ہی
عشق کا انتقام ہوتا ہے
(مجاز)

اردو زبان کی دھوم ایک مرتبہ پھر سارے جہان میں ہونے لگی ہے۔ مشرق و مغرب میں اس کے نئے دور کا آغاز ہو چلا ہے۔ اردواخبارات، لائبریریوں، بلاگ، نیوز پورٹلس، ویب سائٹس، ایپس وغیرہ کا تانتا لگا ہوا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ گوگل اور دیگر کمپنیوں نے بھی اردو خدمات کا آغاز کر دیا۔ گوگل نے تو ایک نستعلیق فونٹ ہی بنا دیا جسے کسی بھی اردو ویب صفحے پر نیٹیو کیا جاسکتا ہے۔ اس فونٹ کا نام اس نے 'نوٹو نستعلیق' رکھا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی دھوم ایک مرتبہ پھر سارے جہان میں ہونے لگی ہے۔ مشرق و مغرب میں اس کے نئے دور کا آغاز ہو چلا ہے۔ اردو اخبارات، لائبریریوں، بلاگ، نیوز پورٹلس، ویب سائٹس، ایپس وغیرہ کا تانتا لگا ہوا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ گوگل اور دیگر کمپنیوں نے بھی اردو خدمات کا آغاز کر دیا۔ گوگل نے تو ایک نستعلیق فونٹ ہی بنا دیا جسے کسی بھی اردو ویب صفحے پر نیٹیو کیا جا سکتا ہے۔ اس فونٹ کا نام اس نے 'نوٹو نستعلیق' رکھا ہے۔ اس سے قبل 'جمیل نوری نستعلیق' اور 'نفیس نستعلیق' نامی فونٹس بھی اردو ویب صفحات کے لیے پبلک ڈومین Public Domain پر دستیاب تھے اور ہنوز ہیں۔ ان کی مدد سے بھی اردو ویب صفحات کو نستعلیق خط میں دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ اس تکنیک کا استعمال کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اوپن ٹائپ نستعلیق فونٹ کو پبلک ڈومین پر امبیڈ یا نصب کیا جائے اور وہ تمام حقوق ملکیت سے مبرا ہو۔ نستعلیق فونٹس کی تیاری میں جس قدر خون جلایا جاتا ہے، ریسرچ میں وقت اور روپیہ لگایا جاتا ہے، اور جن اَدق مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ایسی صورت میں کوئی اچھا نستعلیق فونٹ پبلک ڈومین پر پوری سخاوت کے ساتھ عام کر دینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ صرف اپنی زبان کے لیے دیوانے کر سکتے ہیں یا گوگل اور مقتدرہ جیسے ادارے۔ ایک خوش آئند بات یہ ہوئی ہے کہ فی الوقت متعدد فنکاران ایسے فونٹ بنانے میں لگے ہوئے ہیں جو اردو کی دیگر ضروریات کو بھی پورا کر سکیں۔ ان کے خلوص کی رو بھی اسی جانب ہے کہ اپنی زبان کے لیے قربانیاں اگر ہمیں ہی دینی لازمی ہے تو یہی سہی۔

رونے لگتا ہوں محبت میں تو کہتا ہے کوئی
کیا ترے اشکوں سے یہ جنگل ہرا ہو جائے گا؟
(احمد مشتاق)

ٹیلی ویژن کے واسطے پر بھی اردو یوں تو اسکرول اور اینی میشن میں دکھائی دیتی ہے البتہ جب روانی اور لائیو ڈسپلے کی بات ہوتی ہے تو وہاں نستعلیق فونٹ کی جگہ نسخ فونٹ چلنے لگتا ہے۔

ہم نے اردو کے برقی میڈیا سے متعلق تو یہ باتیں جان لی لیکن اردو کے ورقی میڈیا یعنی پرنٹ میڈیا کا معاملہ بھی کافی محدود چلتا آیا ہے۔ تکنیکی سطح پر جو فکر کا سبب ہے وہ ہے اشاعتی یعنی پبلشنگ پلیٹ فارم کی قلت اور معیار سے سمجھوتہ۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ نستعلیق میں اب تک مکمل پبلشنگ پلیٹ فارم 'ان پیج' کے علاوہ کوئی تیار ہی نہیں کیا گیا۔ اتنی وسیع اور کثیر جہت اردو دنیا کا یہ المیہ نہیں

نستعلیق فونٹس کی تیاری میں جس قدر خون جلایا جاتا ہے، ریسرچ میں وقت اور روپیہ لگایا جاتا ہے، اور جن ادق مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ایسی صورت میں کوئی اچھا نستعلیق فونٹ پبلک ڈومین پر پوری سخاوت کے ساتھ عام کردینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ صرف اپنی زبان کے لیے دیوانے کر سکتے ہیں یا گوگل اور مقتدرہ جیسے ادارے۔ ایک خوش آئند بات یہ ہوئی ہے کہ فی الوقت متعدد فنکاران ایسے فونٹ بنانے میں لگے ہوئے ہیں جو اردو کی دیگر ضروریات کو بھی پورا کرسکیں۔

تو اور کیا ہے کہ دہلی کی کمپنی کانسیپٹ سافٹ ویئر کے تیار کردہ 'ان پیج' کے مقابلہ میں نصف صدی گزرنے کے باوجود اس جانب کسی نے مخلصانہ اور کاروباری پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ان پیج کے بھی جو نئے ورژن سامنے آتے رہے ان میں فائل کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے تکنیکی مسائل کو دور تو کیا جاتا رہا، نیز اس میں ایک نئے لاہوری نستعلیق فونٹ 'فیض نستعلیق' کا اضافہ بھی کیا گیا، فونٹ میں کشیدہ فیچر کا اضافہ بھی کیا گیا، نستعلیق سمیت تمام ہی فونٹس کو یونیکوڈ نظام میں داخل کر دیا گیا، مگر صفحہ سازی، تزئین اور جدید پبلشنگ کے بہت سے امور اس میں شامل ہی نہیں کیے گئے جو دیگر زبانوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے۔ یہی سبب ہے کہ ان پیج معاصر پبلشنگ تقاضوں کو پورا کرنے میں صوری و تکنیکی محاذوں پر ناقص ہے۔ جبکہ سامنے ہی دیگر زبانوں کے فونٹس نے، کوارک ایکسپریس، اڈوبی السٹریٹر، اڈوبی انڈیزائن وغیرہ کے پلیٹ فارم پر پیش رفت کر دی اور جدید ترین تکنیکی خوبیوں کے ساتھ ورقی و برقی میڈیا میں اپنی انفرادیت کے علم گاڑ دیے۔ یہاں بھی اپنی زبان سے محبت کرنے والے چند دیوانوں نے ایسے خام مال تیار رکھے ہیں جن کو کچھ خیر خواہ حقِ محنت ہی ادا کر دینے کا ساتھ دیں تو اردو مذکورہ پلیٹ فارموں پر بلیٹ ٹرین کی رفتار سے دوڑ نکلے گی۔ ان موخر الذکر پلیٹ فارموں کے لیے مختصر ترین فائل سائز کے ساتھ اوپن ٹائپ نستعلیق فونٹس کی تخلیق، ان میں کرننگ (یعنی بین الحروف والفاظ فاصلوں کے ایڈجسٹمنٹ) کی سہولت، نقاط و علامات و

انٹرنیٹ کا استعمال عام ہوا تو الیکٹرانی میڈیا میں بھی نستعلیق کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس پلیٹ فارم پر بہت سے احباب نے نوری نستعلیق اور فیض نستعلیق کے حرفی اجزا کو توڑ مروڑ کر کئی نستعلیق نام کے فونٹ بنانے کی سعی کی جنھیں علوی، جمیل وغیرہ ناموں سے متعارف کرایا گیا۔ بعد ازاں پاکستان میں لاہوری اسکول کے تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق نے بھی اپنا جلوہ دکھایا؛ یہ دونوں فونٹ ویب پر اور مائکروسافٹ آفس کے پلیٹ فارم پر تو کارآمد ہیں، لیکن ہنوز یہ دونوں طباعتی دنیا کے لیے کامیاب استعمال کے تجربہ سے نہیں گزرے ہیں۔

اعراب کے درست مقامات کی پروگرامنگ اور اغلاط سے مبرّا متنی فارمیٹنگ کے امور پر ماہرانہ کام کرنے ہوں گے۔ تبھی ہم وہ اہداف پاسکیں گے کہ اردو بین الاقوامی معیار کے ساتھ دنیا کے کسی بھی مطبع میں بلاترّدد جدید ترین تکنیکوں سے معانقہ کرسکے۔ کرننگ دراصل فونٹ کی پراپرٹی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک کوئی ایسا نستعلیق فونٹ نہیں بن پایا جس میں آٹو کرننگ کی مکمل سہولت موجود ہو۔

انٹرنیٹ کا استعمال عام ہوا تو الیکٹرانی میڈیا میں بھی نستعلیق کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس پلیٹ فارم پر بہت سے احباب نے نوری نستعلیق اور فیض نستعلیق کے حرفی اجزا کو توڑ مروڑ کر کئی نستعلیق نام کے فونٹ بنانے کی سعی کی جنھیں علوی، جمیل وغیرہ ناموں سے متعارف کرایا گیا۔ بعد ازاں پاکستان میں لاہوری اسکول کے تاج نستعلیق اور مہر نستعلیق نے بھی اپنا جلوہ دکھایا؛ یہ دونوں فونٹ ویب پر اور مائکروسافٹ آفس کے پلیٹ فارم پر تو کارآمد ہیں، لیکن ہنوز یہ دونوں طباعتی دنیا کے لیے کامیاب استعمال کے تجربہ سے نہیں گزرے ہیں۔ الحمدللہ نستعلیق فونٹس اب انگلش فونٹس کے شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں۔ اور اب تقریباً ہر پلیٹ فارم پر استعمال ہو رہے ہیں، موبائل ایپس، ویب پیجز، پریزینٹیشنز، غرض جہاں جہاں انگلش لکھی جاسکتی ہے وہاں اردو نستعلیق بھی لکھی جاسکتی ہے۔ اور اس کا سہرا 'یونی کوڈ نستعلیق فونٹس' کے سر جاتا ہے۔

ہم نے اب تک بنائے گئے نستعلیق فونٹس کی ایک فہرست کی تلاش کرنے کی کوشش کی تو ہمارے ساتھی ماہر فونٹ ساز اور جمیل نوری نستعلیق کے خالق عارف کریم کے ذریعے یہ اہم فہرست دستیاب ہوئی: نوری نستعلیق، پاک نستعلیق، جوہر نستعلیق، نفیس نستعلیق، پاک نوری نستعلیق، نبیل نستعلیق، عماد نستعلیق، پنسل نستعلیق، نویس نستعلیق، علوی نستعلیق، جمیل نوری نستعلیق، فیض لاہوری نستعلیق، تاج نستعلیق، ایران نستعلیق، شکستہ نستعلیق، نوٹو نستعلیق، نجمی نستعلیق، عوامی نستعلیق، اردو خوشخطی نستعلیق، جمیل خوشخطی نستعلیق، نور تحریری نستعلیق، نور ڈانڈ نستعلیق، دری نستعلیق، ڈیکوٹائپ نستعلیق، اردو ٹائپ سیٹنگ، گوہر نستعلیق، مہر نستعلیق، علی نستعلیق۔ ان میں سے طباعتی دنیا کے لیے ان تیج کے پلیٹ فارم پر محض نوری نستعلیق اور فیض لاہوری نستعلیق ہی اطمینان کے ساتھ قابلِ استعمال ہیں۔

علاوہ ازیں اردو کی طباعتی دنیا میں نوری اور فیض نستعلیق فونٹس ہی 'اوریجنل' یا اصلی واساسی فونٹس ہیں۔ مہر نستعلیق کا ڈیسک ٹاپ ورژن بھی تیاری کے مراحل میں ہے اور عنقریب یہ بھی طباعتی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔

معروف سائنس نگار ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں کہ ''ایک اندازے کے مطابق انگریزی زبان میں سائنسی اور تکنیکی لغت اور فرہنگ میں موجود الفاظ کی تعداد عام انگریزی لغت کے الفاظ سے زیادہ ہے۔ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ اصطلاحوں کا ذخیرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر علاقوں میں سائنس مادری زبان میں پڑھنے کی بجائے انگریزی زبان میں سیکھی جا رہی ہے۔ اس لیے عالمی سطح پر انگریزی سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان بن گئی ہے''۔

اردو زبان کے وسیع تر تکنیکی استعمال کے لیے لازمی ہے کہ اسے مختلف اپلیکیشن یا تطبیقات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس کا کوئی معیاری مقبول عام خودکار یا آپ ترجمہ کا سافٹ ویئر بنایا جائے تھیسارس Thesaurus یعنی فرہنگِ جامع جیسے کسی اپلی کیشن کی تیاری کی جائے جس میں مترادفات کی فہرست و معانی دستیاب ہوں، تلاش آسان ہو۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آن لائن 'اردو لغت' urdulughat.info تیار کرکے ایک بہت بڑی کمی کا ازالہ کیا گیا ہے۔ یہ فی الحال دنیا کی سب سے بڑی اردو لغت ہے جس میں ایک لاکھ سے زیادہ الفاظ سموئے گئے ہیں: تلفظ اور ان کے معنی، اجزا، مترادفات، مرکبات اور روزمرہ جات، الفاظ کی تلاش، درجہ بندی اور دیگر لفظی خصوصیات کی مدد کے ساتھ املا، تلفظ، اعراب، مصدر، مشتق، تعریف اور لفظ کا استعمال ایک ہی ورق پہ میسر ہیں۔ اگر اس میں دیگر زبان والوں کے لیے الفاظ کی تلاش میں رومن کی بورڈ فراہم کر دیا جائے تو اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اسی کی مانند مختلف علوم و فنون کی فرہنگِ اصطلاحات بھی اردو دنیا میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ اس کمی کو دور کیا جاسکے۔

ہمارے ایک اور ساتھی ذیشان نصر (مہر نستعلیق کے فونٹ ساز) نے یہ اطلاع دی کہ اردو نستعلیق فونٹس اب انگلش فونٹس کے شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں وہ ساری تکنیکیں جو انگلش فونٹس کو لگ سکتی ہیں؛ وہ اردو فونٹس پر بھی اپلائی ہوسکتی ہیں۔ گوگل نے اردو اسپیچ ریکگنیشن سوفٹ ویئر بھی متعارف کروایا جس کی مدد سے آپ بول کر کمپیوٹر سے اُردو میں ٹائپنگ کروا سکتے ہیں۔ جس کا رزلٹ حیرت انگیز طور پر تقریباً پچانوے فی صد درست ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سرمد کی ٹیم نے ابھی اردو اوسی آر کا ڈیسک ٹاپ ورژن بھی جاری کیا ہے۔ جس کی مدد سے نوری نستعلیق میں ٹائپ کی گئی کتب کی تصویر کو متن میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا رزلٹ بھی کافی درست ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے شعبے ہیں جن پر کام ہو رہا ہے اور مزید ہونا بھی چاہیے۔ اردو محفل کے ایک رکن سید ذیشان نے اردو عروض کا سوفٹ ویئر متعارف کروایا جو کہ کسی بھی شعر کی تقطیع کرسکتا ہے۔

اردو زبان کے وسیع تر تکنیکی استعمال کے لیے لازمی ہے کہ اسے مختلف اپلیکیشن یا تطبیقات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس کا کوئی معیاری مقبول عام خود کار یا آپ ترجمہ کا سافٹ ویئر بنایا جائے، تھیسارس Thesaurus یعنی فرہنگِ جامع جیسے کسی اپلی کیشن کی تیاری کی جائے جس میں مترادفات کی فہرست و معانی دستیاب ہوں، تلاش آسان ہو۔

باتیں بہت سی ہیں، یہاں وقت اجازت نہیں دیتا ان کی تفصیل میں جانے کی۔ اور یہ باتیں اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک ہم اردو کو درپیش ٹکنالوجیکل چیلنجز سے نبرد آزما نہیں ہولیتے اور اردو کو ان سے ہم آہنگ نہیں کرلیتے۔ یہ سارے کام اردو والوں کو ہی کرنے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی زبان کے لیے اپنی اپنی جگہ حتی المقدور قربانیاں دینے کے لیے خود کو آمادہ و تیار کرلیں۔ خداحافظ

■

Dr. Rehan Ansari
144/202, Roshan Apartment, Khajoorpura
Gauripada, Bhiwandi - 421302 (MS)
Mob.: 9326352622
Email.: ansarirehanyusuf@gmail.com

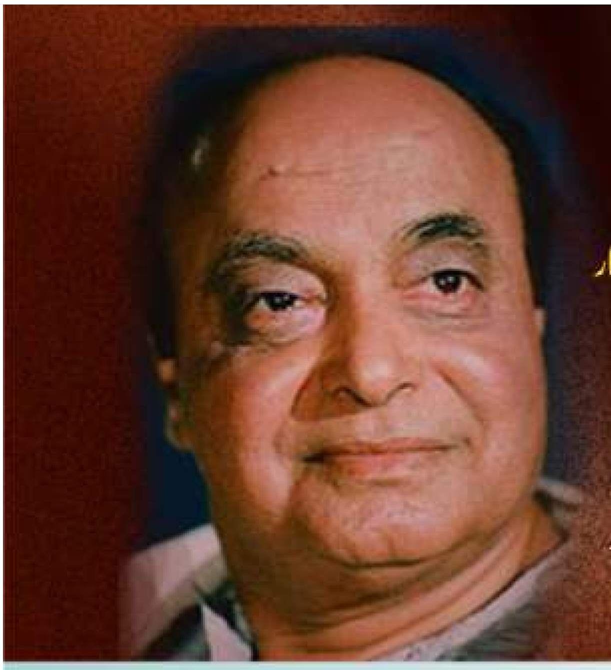

مشہورِزمانہ ناول 'اور انسان مرگیا' کے خالق فلمساز و ہدایت کار

رامانند ساگر

پیدائش و وفات پر خصوصی تحریر

انیس امروہوی

کبھی کبھی انسان کی زندگی میں عجیب وغریب واقعات ہو جاتے ہیں، جو اُس کی زندگی کے رُخ کو یکسر موڑ دیتے ہیں۔ انسان چاہتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور ہی جاتا ہے۔ زندگی میں انسان کچھ بننا چاہتا ہے اور بن کچھ اور ہی جاتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدرت جب کسی انسان سے کوئی کام لینا چاہتی ہے تو اُس کے لیے ویسے ہی اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ ہماری فلمی دنیا میں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو زندگی میں کچھ اور ہی کرنا چاہتے تھے مگر قدرت نے اُن کو اِس روشنی بھری جگمگاتی دنیا میں پہنچا دیا۔ مگر انھوں نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں اور قابلیت سے کامیابی اور شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

ایسی ہی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے فلمساز، اسکرین پلے رائٹر اور مکالمہ نگار رامانند ساگر۔

رامانند ساگر کے آباواجداد اصلاً پیشاور کے رہنے والے تھے۔ لاہور کے قریب گاؤں 'اصل گروکے' میں 29 دسمبر 1917 کو جب رامانند ساگر کا جنم ہوا تو اُن کا نام چندر مولی رکھا گیا۔ ان کے والد دینا ناتھ چوپڑا، تجارت کے سلسلے میں نقلِ وطن کر کے کشمیر آ گئے تھے۔ حالانکہ وہ ایک کامیاب تاجر تھے، مگر ادبی ذہن رکھتے تھے اور شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ وہ تاج پیشاوری کے نام سے اشعار کہتے تھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ ادبی ذوق رامانند ساگر کو اپنے والد تاج پیشاوری سے وراثت میں ملا تھا۔ رامانند ساگر ابھی بہت چھوٹے تھے کہ انھیں رشتہ کی ایک بے اولاد دادی نے گود لے لیا اور اُن کی پرورش والدین سے دُور رہ کر ہوئی، یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی بہت جذباتی تھے۔ انھوں نے صرف سولہ برس کی عمر میں پہلی کہانی 'پریتم پرتیکشا' لکھی، جو شری پرتاپ کالج میگزین میں شائع ہوئی۔ اس وقت بہت کم لوگوں کو یقین آیا کہ یہ صرف سولہ برس کے لڑکے کی لکھی کہانی ہے۔ اس کہانی میں بڑا درد تھا اور پھر انھوں نے مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔ شروع میں وہ رامانند چوپڑا کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں رامانند بیدی اور پھر رامانند ساگر کے نام سے انھوں نے لکھنا شروع کیا اور آخر تک اسی نام سے لکھتے رہے۔

رامانند ساگر کی ابتدائی زندگی بہت جدوجہد بھری تھی۔ انھوں نے ایک چپراسی کے طور پر کام شروع کیا، ٹرک کلینر بنے، صابن بیچا اور ایک سُنار کی دُکان پر بھی ملازمت کی۔ انھوں نے کبھی بھی محنت سے منہ نہیں موڑا، نہ کسی کام کو چھوٹا سمجھا، اور کسی بھی جائز کام کو کرنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی، اور اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ زندگی کی جدوجہد کے زمانے میں بھی وہ لکھتے رہے اور شائع بھی ہوتے رہے۔

رامانند ساگر کا فلموں سے سب سے پہلا تعلق تب ہوا، جب انھوں نے 1936 میں ایک خاموش فلم Raiders of the Rail Road میں Clapper Boy کے بطور کام کیا۔ اس کے بعد 1940-41 میں فلم 'کوکل' میں مرکزی کردار ملا اور فلم کرشنا میں 'ابھی منیو' کا کردار ادا کرنے کا بھی موقع ملا۔ مگر یہ سب فلمیں دورانِ تکمیل ہی ڈبوں میں بند ہو گئیں۔ زندگی کی اسی جدوجہد کے زمانے میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل اور پھر سنسکرت میں ڈگری حاصل کی اور دونوں مضامین میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔

رامانند ساگر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز لاہور کے 'ڈیلی پرتاپ' اور 'ڈیلی ملاپ' اخباروں میں نیوز ایڈیٹر کے بطور شروع کیا تھا۔ انھوں نے تقریباً 32 مختصر کہانیاں لکھیں اور اسٹیج پلے اور قسط وار طویل کہانیاں بھی لکھتے رہے۔ اُن ہی دِنوں ایک معروف رسالے 'آداب مشرق' میں اُن کا ایک قسط وار افسانہ 'ایک ٹی۔ بی پیشنٹ کی ڈائری' شائع ہو کر مقبول ہو رہا تھا۔ اس افسانے سے متاثر ہو کر مشہور ادیب کرشن چندر نے انھیں مبارکبادی کا خط لکھا اور بمبئی آ کر فلموں کے لیے لکھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مشہور فلمساز و ہدایتکار محبوب خان نے بھی رامانند ساگر کی تحریروں کو پڑھ کر انھیں فلموں کے لیے لکھنے کا مشورہ دیا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ملک فرقہ واریت کے شکنجے میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ ایسے پُرآشوب دور میں رامانند ساگر تقسیم وطن کے وقت دہلی آ گئے۔ اُس وقت اُن کے پاس صرف پانچ آنے اور چند کہانیوں اور افسانوں کا سرمایہ تھا۔ وہ ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی خونریزی اور انسان کی بربادی سے بے حد دل برداشتہ تھے۔ ایسے ہی دور میں انسان اور انسانیت کی ناقدری کے پس منظر میں انھوں نے ایک ناول 'اور انسان مرگیا' تحریر کیا، جو بے حد پسند کیا گیا۔ یہ ناول انھوں نے اپنی بیوی لیلاوتی کو معنون کیا تھا۔ اس ناول کا انگریزی ترجمہ 1988 میں شائع ہوا۔

دہلی آنے کے بعد انھوں نے کچھ دن اردو صحافت میں گزارے اور کرشن چندر وغیرہ کے مشورے پر ممبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اداکار جگن کے ساتھ ملاڈ علاقے میں اُن کے ثریا ولا میں رامانند ساگر نے رہائش اختیار کی اور پرتھوی راج کپور کے 'پرتھوی تھیٹرز' کے لیے لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے جنگ اور امن کے موضوع پر ایک ڈرامہ تحریر کیا جس کو پرتھوی راج نے خود پلے کیا۔

1949 میں انھوں نے راج کپور کے لیے فلم 'برسات' کی کہانی اور سکرین پلے تحریر کیا۔ فلم کامیاب ہوئی اور اس کے ساتھ ہی رامانند ساگر کو بطور کہانی کار شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ایس۔ ایس۔ واسن کی تقریباً پانچ فلموں کی کہانی اور سکرین پلے لکھنے کا کام سنبھالا اور وہ کچھ عرصہ کے لیے مدراس چلے گئے۔ ان میں ایک فلم دلیپ کمار، وجینتی مالا کی 'پیغام' بھی

تھی۔ 1957 میں فلم 'پیغام' کے لیے رامانند ساگر کو بہترین مکالمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ پیش کیا گیا۔ یہیں سے ان کی فلمی زندگی کا سنہری دور شروع ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فالی مستری کی فلم 'جان پہچان' کی کہانی بھی لکھی۔

1950 میں رامانند ساگر نے اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس 'ساگر آرٹس' قائم کیا اور 1953 میں فلم 'مہمان' بنائی۔ اس فلم کی نہ صرف کہانی، منظرنامہ اور مکالمے رامانند ساگر نے لکھے بلکہ پہلی بار ہدایتکاری بھی کی تھی۔ اس طرح ساگر آرٹس کے بینر سے 1950 سے 1984 تک انھوں نے تقریباً پچیس فلموں کی تخلیق کی، ان میں سے تقریباً پندرہ فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہیں۔ اداکار راجندر کمار کے ساتھ اُن کی فلموں 'آرزو'، 'ہمراہی'، 'گیت'، 'زندگی' اور 'للکار' نے پردۂ سیمیں پر سلور جوبلی منائی۔ اسی طرح اداکار دھرمندر کے ساتھ ان کی تین فلمیں 'آنکھیں'، 'للکار' اور 'چرس' بے حد کامیاب ثابت ہوئیں۔ فلم 'آنکھیں' نے جاسوسی فلموں کی تاریخ میں ایک نئے دور اور انداز کا آغاز کیا اور اس فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ فلم 'چرس'، 'پیارا دشمن'، 'بغاوت' اور 'رام بھروسے' نے بھی سلور جوبلی منائی۔ اس طرح شہرت اور مقبولیت دونوں ہی رامانند ساگر کے حصے میں آئیں اور اپنی قابلیت اور شہرت کی وجہ سے ہی رامانند ساگر کو 2001 میں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری اعزاز سے نوازا گیا۔ 1996 میں ان کو ہندی ساہتیہ سمیلن، پریاگ کی طرف سے 'ساہتیہ واچسپتی' یعنی ڈاکٹر آف لٹریچر کے اعزاز سے نوازا گیا اور 1997 میں جموں یونیورسٹی کی طرف سے رامانند ساگر کو اعزازی طور پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔

رامانند ساگر کی ایک خاص بات یہاں بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

وہ یہ کہ جب ان کی کوئی فلم نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھی تو وہ خود مختلف علاقوں میں عام آدمی کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھا کرتے تھے تاکہ فلم کے تعلق سے عام آدمی کے تاثرات اُن کو مل سکیں اور وہ آئندہ اپنی فلموں میں عوام کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھ سکیں۔ اسی طرح فلم 'آرزو' کی نمائش کے بعد رامانند ساگر بنگال کے دورے پر تھے۔ ایک ٹورنگ ٹاکیز میں فلم 'آرزو' چل رہی تھی۔ جب رامانند ساگر وہاں پہنچے تو وہاں کے منیجر نے بتایا کہ ایک شخص بلاناغہ ان کی فلم 'آرزو' دیکھنے آتا ہے اور سنیما میں بیٹھ کر روتا رہتا ہے۔ میں اس سے پیسے بھی نہیں لیتا۔ اگر آپ تھوڑی دیر رُک جائیں تو میں اس شخص سے آپ کو ملوانا چاہوں گا۔ رامانند ساگر رُک گئے اور کچھ دیر بعد ہی ایک شخص بیساکھیوں کے سہارے کھٹ کھٹ کرتا ہوا وہاں آیا۔ یہ شخص نہ صرف خوبصورت تھا، بلکہ جوان بھی تھا۔ جب منیجر نے رامانند ساگر کو اس شخص سے ملوایا تو اُس نے ساگر صاحب کے پیر چھوئے اور درد بھری آواز میں بتایا کہ آپ کی فلم سے مجھے نئی طرح سے زندگی جینے کا حوصلہ ملا ہے۔ آپ نے میری اندھیری زندگی میں روشنی پھیلائی ہے اور اب میں اپنی محبوبہ سے بھی نظریں ملانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ میں آپ کی فلم کا جیتا جاگتا کردار ہوں۔ آپ نے جو ایک معذور انسان کی زندگی کے مسائل کا حل اپنی فلم میں دیا ہے، اسی کی وجہ سے آج میں زندہ ہوں۔ اس شخص نے ایک نوٹ پر یادگار کے طور پر رامانند ساگر سے دستخط لیے اور شکریہ ادا کیا۔ رامانند ساگر نے اُسے گلے لگایا اور وہ کھٹ کھٹ کرتا ہوا بیساکھیوں کے سہارے واپس چلا گیا۔

رامانند ساگر نہ صرف ایک نیک دل انسان تھے بلکہ وہ ہمیشہ وقت کے ساتھ چلنے والوں میں سے تھے۔ جس وقت وہ فلم چرس کی شوٹنگ کے لیے فرانس گئے تو وہاں انھوں نے ٹی۔وی سیریل کی مقبولیت کو پہچانا اور پھر ہندوستان واپس آکر انھوں نے 1985 میں ہندوستانی ٹی۔وی اسکرین کو 'وکرم بیتال' جیسا سیریل پیش کیا۔ اس کے بعد 'دادا دادی کی کہانیاں' اور پھر ان کا طویل اور بے حد مقبول سیریل 'رامائن' شروع ہوا۔ یہ ایک طرح سے پہلی فلمی فیملی تھی جو چھوٹے اسکرین پر اپنی دھاک جمانے

میں کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد رامانند ساگر کے کئی ٹی۔وی سیریل 'شری کرشنا'، 'الف لیلیٰ'، 'جے گنگا میّا'، 'گروکل' اور 'آنکھیں' بڑی کامیابی کے ساتھ دکھائے جاتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سیریل جنوبی ہند کی زبانوں میں ٹیلی کاسٹ ہوں۔ اس کے لیے انھوں نے اشوک نگر میں ایک ڈبنگ اسٹوڈیو قائم کیا۔ انھوں نے بڑودہ کے پاس غیر آبادی والے علاقے میں ایک بڑی سی جگہ خرید کر اس میں چھوٹے چھوٹے Hut اور Cottage بنائے، جہاں وہ سکون سے اپنی سکرپٹ پر کام کر سکتے تھے۔ وہاں انھوں نے اپنے کئی سیریلوں کی شوٹنگ بھی کی۔ ان کے اداکاروں اور تکنیکی لوگوں کو بھی وہاں کام کرنے میں بڑا مزا آتا تھا اور وہ خود بھی سب کا خیال رکھتے تھے۔ رامانند ساگر کو اکثر فرصت کے اوقات میں بھی وہاں قیام کرنے میں بڑی راحت کا احساس ہوتا تھا۔ حال ہی میں ان کا ایک بڑا ٹی۔وی سیریل 'سائیں بابا' کامیابی کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے۔ بالمیکی اور تلسی داس کے بعد سب سے مقبول رامائن رامانند ساگر نے ہی پیش کی ہے۔

رامانند ساگر نے نہ صرف اپنی فلموں سے بلکہ اپنی نجی زندگی اور ٹی۔وی سیریل کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو ایک مثالی سماج اور بہترین کردار کی ترغیب دی ہے۔

13 دسمبر 2005 کی رات کو ایک لمبی بیماری کے بعد 87 برس کی عمر میں رامانند ساگر نے اپنے خالق حقیقی کو لبیک کہا اور پوری فلمی دنیا کو ایک بہترین کہانی کار، منظرنامہ نگار اور مکالمہ نگار سے محروم ہونا پڑا۔ انتقال سے چار ماہ قبل ہی رامانند ساگر کا آپریشن ہوا تھا اور وہ تبھی سے صاحب فراش تھے۔ ان کے وارثوں میں اہلیہ لیلاوتی کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اُن کے انتقال سے نہ صرف فلمی دنیا نے بلکہ اردو دنیا نے بھی ایک دردمند مصنف کھو دیا ہے۔

■

Anees Amrohvi
F-5, First Floor, Jawahar Park (W)
Laxmi Nagar, Delhi-110092
Ph.011-22442572,9811612373
qissey@rediffmail.com

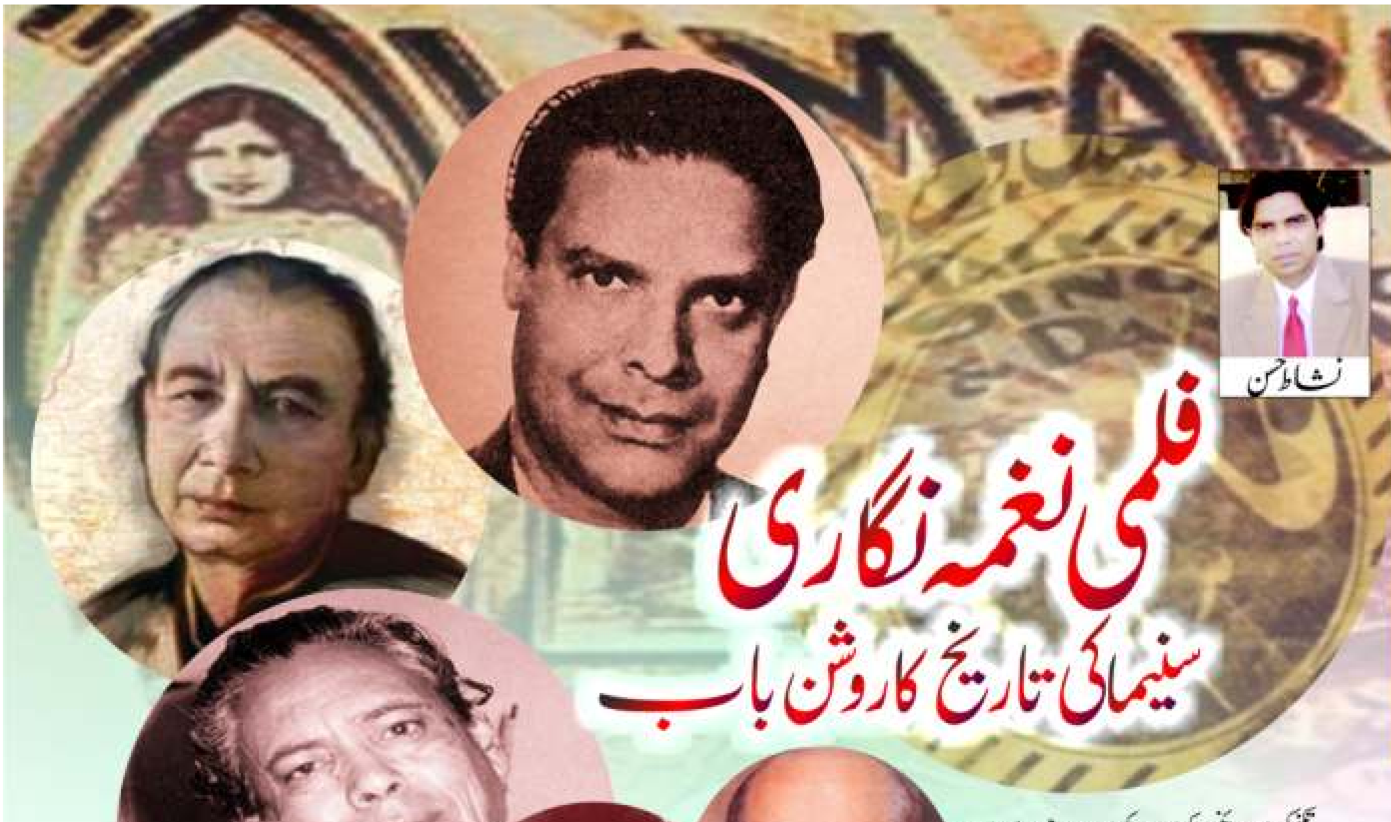

نشاط حسن

فلمی نغمہ نگاری

سنیما کی تاریخ کا روشن باب

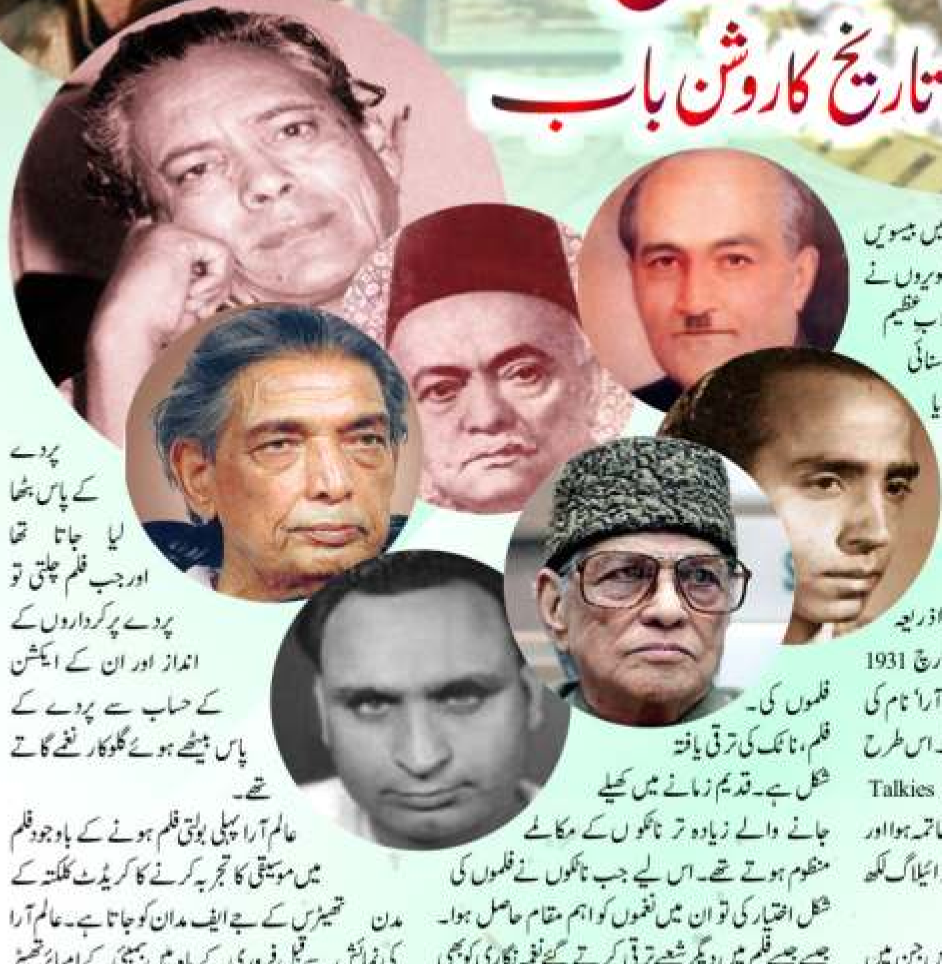

تکنیکی اور سائنسی کرامت کی صورت میں بیسویں صدی کی اوّلین دہائی میں جب چلتی پھرتی تصویروں نے گویائی حاصل کی تو سنیما کی شکل میں ایک انقلاب عظیم سامنے آیا۔ جو کہانیاں چوپالوں میں سنی اور سنائی جاتی تھیں، جنھیں کتابوں میں پڑھا جاتا تھا یا تھیٹروں میں اداکاروں کے ذریعے ان کی تمثیل دیکھی جاتی تھیں، سلیولائڈ کے فیتوں میں ڈھل کر اور جیسے زندہ ہو کر عام لوگوں تک پہنچنے لگیں اور ایک صدی کے تیز ارتقائی سفر کے بعد سنیما آج کا بہت بڑا ذریعہ ابلاغ اور تفریح کا اہم وسیلہ بن چکا ہے۔ 14 مارچ 1931 کو بمبئی کے Majestic سنیما ہال میں 'عالم آرا' نام کی پہلی بولتی ہوئی فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس طرح تھیٹر یا بائی اسکوپ کہے جانے والے ہال Talkies کہلانے لگے۔ اس کے بعد خاموش فلموں کا خاتمہ ہوا اور اسکرین پر منظر کی تشریح کرنے والے الفاظ یا ڈائیلاگ لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ رہی۔

فلم کی تشکیل میں دو اہم ستون ہوتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق مشینی یا غیر مشینی تکنیک سے ہے اور دوسرے کا خالص جمالیاتی اور جمالیاتی قدروں سے۔ پہلے شعبے میں کیمرہ، ریکارڈنگ، ایڈیٹنگ، مکسنگ، ساؤنڈ افیکٹ وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو مشینوں کی مرہون منت ہیں۔ دوسرے شعبے میں کہانی، منظرنامہ، مکالمہ، موسیقی و نغمہ نگاری وغیرہ کو بہت دخل ہے۔

فلم کی عمارت کی بنیاد کا پہلا پتھر کہانی کے ساتھ نغمہ نگاری ہے۔ نغمہ نگاری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی فلموں کی۔

فلم، ناٹک کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ قدیم زمانے میں کھیلے جانے والے زیادہ تر ناٹکوں کے مکالمے منظوم ہوتے تھے۔ اس لیے جب ناٹکوں نے فلموں کی شکل اختیار کی تو ان میں نغموں کو اہم مقام حاصل ہوا۔ جیسے جیسے فلم میں دیگر شعبے ترقی کرتے گئے نغمہ نگاری کو بھی ایک نئی راہ ملی۔ 1931 میں ریلیز ہونے والی پہلی متکلم فلم 'عالم آرا' ضرور تھی لیکن اس فلم کی ریلیز سے بہت پہلے ہی فلم اور موسیقی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ 1913 میں راجہ ہریش چندر کی نمائش کے ساتھ ہی ہندوستان میں فلم انڈسٹری کی ابتدا ہوئی۔ 1913 سے 1930 تک بے شمار خاموش فلمیں ریلیز ہوگئیں۔ ان فلموں میں مکالمے اور موسیقی تو نہیں ہوتی تھی ہاں گیت ضرور ٹھونس دیے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں فلم کی نمائش کے دوران چند موسیقاروں کو پردے کے پاس بٹھا لیا جاتا تھا اور جب فلم چلتی تو پردے پر کرداروں کے انداز اور ان کے ایکشن کے حساب سے پردے کے پاس بیٹھے ہوئے گلوکار نغمے گاتے تھے۔

عالم آرا پہلی بولتی فلم ہونے کے باوجود فلم میں موسیقی کا تجربہ کرنے کا کریڈٹ کلکتہ کے مدن تھیٹرس کے جے ایف مدان کو جاتا ہے۔ عالم آرا کی نمائش سے قبل فروری کے ماہ میں بمبئی کے امپائر تھیٹر میں مدان جی کی شارٹ فلم کی نمائش کی گئی تھی جس میں فلم کی ہیروئن منی بائی نے 'اپنے مولا کی میں جوگن بنوں گی' گایا تھا۔ اس وقت یہ نغمہ خاصا مقبول ہوا تھا۔ جے ایف مدان کی یہ مختصر فلم ہونے کی وجہ سے پہلی بولتی فلم ہونے کا اعزاز 'عالم آرا' کو ہی ملا۔ وزیر محمد خاں کا عالم آرا میں گایا ہوا نغمہ 'دے دے خدا کے نام پر اگر ہمت ہے دینے کی' ہندوستانی فلم صنعت کا پہلا فلمی نغمہ قرار دیا گیا۔ وزیر محمد خاں نے اس فلم میں فقیر کا رول ادا کیا تھا اور اس نغمے کو

بھی انھیں پر فلم بند کیا گیا تھا۔ عالم آرا کے موسیقار تھے فیروز شاہ مستری اور بی ایرانی۔ فلم کی ہیروئن زبیدہ نے فلم میں 'بدلہ دلائے یارب تو ستمگروں سے' نغمہ گایا تھا۔ کسی بھی ہیروئن پر فلمایا جانے والا یہ پہلا نغمہ تھا۔ عالم آرا میں کل سات گیت تھے۔ ان میں سے ایک گیت زبیلو بائی نے گایا تھا۔ یہی زبیلو بائی بعد میں مدر انڈیا میں نرگس کی ساس اور مغل اعظم میں مدھوبالا کی ماں بنی تھیں۔ ان کے نغمے کے بول تھے 'روٹھا آسماں گم ہوگیا ہے مہتاب'، اور یہیں سے ہندوستانی فلموں میں نغموں کی ابتدا ہوئی۔

ہندوستانی فلموں کا ابتدائی دور صرف جادوئی یا مذہبی موضوع کے ارد گرد گردش کرتا رہا۔ ایسی فلموں کے نغموں کی سطح فن کے اعتبار سے بہت اعلیٰ نہیں ہوتی تھی۔

سب سے پہلے 'نیو تھیٹرس' نے آہستہ رفتار والی سماجی فلمیں بنانی شروع کیں۔ رفتہ رفتہ رومانی فلموں کا دور شروع ہوا۔ اس دور کو ہندوستانی فلموں کے سنہری دور کا آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں آرٹس فلمیں اور دیگر بہت سی کامیاب فلمیں بنیں۔ ان فلموں کی کہانیاں نغموں پر مبنی ہوتی تھیں۔ ایک فلم میں دس اور کبھی کبھی اُس سے بھی زیادہ نغمے ہوتے تھے۔ اسی دور میں سب سے زیادہ بہترین اور معنی خیز نغمے لکھے گئے، جو کافی حد تک اس وقت کی فلموں کی مقبولیت میں معاون ثابت ہوئے۔

شکیل بدایونی سے قبل فلمی نغمہ نگاروں میں منتخب، آرزو لکھنوی، قمر جلال آبادی، جوش ملیح آبادی، تنویر نقوی، حیات امروہوی اور کیف عرفانی جیسے مشہور نغمہ نگار تھے۔ یہ وہ شاعر تھے جنھوں نے اس وقت ہندوستانی فلموں میں معیاری نغمے تخلیق کیے۔ اس کے بعد شکیل بدایونی نے موسیقار نوشاد کے ساتھ مل کر فلمی تاریخ کے سب سے مشہور، معنی خیز اور مقاصد سے بھرپور نغموں کا آغاز کیا۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب نغمہ نگار شکیل اور موسیقار نوشاد کا نام فلم کی کامیابی کا ضامن بن گیا۔ اس کی بہترین مثال فلم 'رتن' کی مقبولیت ہے۔ فلم کی آمدنی سے زیادہ نغموں کی رائلٹی بنانے والے ملی، جو اُس زمانے کا ایک ریکارڈ ہے۔

فلمی نغموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ شکیل سے قبل، شکیل اور ان کے ہمعصر نیز شکیل کے بعد نغمہ نگار۔

شکیل کے ہمعصر نغمہ نگاروں میں ساحر لدھیانوی، راجندر کشن، حسرت جے پوری، مجروح سلطانپوری، پردیپ، راجہ مہدی علی خاں، کیفی اعظمی، صبا افغانی، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، جاں نثار اختر، ایس ایچ بہاری، نقش لائل پوری اور فاروق قیصر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سبھی کے نغمے زیادہ تر مقبول ہوئے ہیں۔

شکیل بدایونی نے سب سے پہلے کاردار صاحب کی فلم 'درد' کے نغمے لکھے۔ ان کا پہلا فلمی نغمہ تھا:

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے

فلم 'درد' کے نغموں نے ہی شکیل بدایونی کو فلمی دنیا میں بام شہرت تک پہنچادیا اور اس کے بعد تو جس طرح نوشاد صاحب موسیقار اعظم بن گئے، اسی طرح شکیل نے بھی ایسی ہی غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

فلموں میں آرزو لکھنوی نے معیاری اور ادبی گیتوں کے لکھنے کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے بعد جن شعرا نے اس معیار کو فروغ دیا، ان میں شکیل بدایونی کا نام سرفہرست ہے اور اسی بات نے شکیل کو ہماری فلمی دنیا کا ممتاز اور عظیم نغمہ نگار بنادیا۔

شکیل نے ہر زمین اور بحر میں، اور ہر نقطۂ خیال پر سخن آرائی کی ہے۔ وہ جس قدر رومانی فلمی نغمہ نگار ہیں، اتنے ہی انقلابی اور سیاسی بھی، لیکن وہ انقلاب اور سیاست کی بات بھی ساغر و مینا اور گل و بلبل کے حوالے سے کرتے ہیں۔ انسانیت کا درد ان کے سینے میں ہر وقت ایک ہوک سی پیدا کیے رہتا ہے۔ یاد کیجیے فلم 'لیڈر' میں شکیل کا وہ نغمہ:

''اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں''

ایک طویل عرصے تک شکیل بدایونی نے ہماری فلموں کو اچھے، صاف ستھرے اور صحت مند نغمے فراہم کیے ہیں۔ فلم دلاری، میلہ، بابل، دیدار، اڑن کھٹولہ، آن، امر، آدمی، کوہ نور، گنگا جمنا، چودھویں کا چاند، مدر انڈیا، بیجو باورا، پالکی، دو بدن، سوہنی مہیوال، شباب، دل ناداں، دل لگی اور مغل اعظم جیسی بہترین فلموں میں لکھے ہوئے ان کے نغمے آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ شکیل بدایونی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ ملک کی سب سے بڑی فلموں میں ان کے لکھے نغمے رہے ہیں۔ 1961 میں فلم 'چودھویں کا چاند' کے نغمے پر پہلی بار شکیل کو فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا جس کے بول تھے:

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

1962 میں فلم گھرانا کے نغمے 'حسن والے تیرا جواب نہیں' اور 1963 میں فلم بیس سال بعد کے نغمے 'کہیں دیپ جلے کہیں دل' کو بھی فلم فیئر ایوارڈ حاصل ہوا۔

مشہور ریڈیو پروگرام 'بنا کا گیت مالا' میں شکیل کے نغمے ہمیشہ سرفہرست رہے۔

گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی ہندوستانی فلم انڈسٹری کے لیے کئی معاملات میں بڑی اہم رہی ہے۔ اُس دور میں فلم انڈسٹری سے اردو کے کئی بڑے ادیب اور شاعر وابستہ ہوئے تھے اور وہاں کا ماحول ادبی لحاظ سے بڑا خوشگوار ہوگیا تھا۔ کمال امروہوی، سعادت حسن منٹو، وجاہت مرزا، امان اللہ خاں جیسے ادیب بھی فلمی دنیا میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ 1940 میں ہمانشو رائے کے انتقال کے بعد دیویکا رانی بمبئی ٹاکیز کو سنبھال نہیں پائیں اور ان کے خاص لوگوں میں سے ایس مکھرجی، اشوک کمار، رائے بہادر چنی لال وغیرہ نے اپریل 1943 میں الگ ایک کمپنی 'فلمستان' کی بنیاد ڈالی۔ اس نئی کمپنی کے لیے نئی ہیروئنوں، ہیرو، ادیبوں، نغمہ نگاروں اور ہدایت کاروں کی تلاش شروع ہوگئی۔ نغمہ نگار پردیپ بھی بمبئی ٹاکیز چھوڑ گئے اور ان کی جگہ بھگوتی چرن ورما الہ آباد سے نریندر شرما کو لے کر آئے۔ ادھر ششدھر مکھرجی نے گوپال سنگھ نیپالی کو شامل کرلیا۔ سعادت حسن منٹو بھی دہلی کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی میں فلمستان سے وابستہ ہوگئے۔

کچھ عرصے کے بعد منٹو نے راجہ مہدی علی خاں کو بھی بمبئی بلالیا۔ ان دنوں منٹو کی کہانی پر فلمستان والے فلم 'آٹھ دن' بنا رہے تھے۔ اس سے قبل منٹو کی ہی کہانی پر 1944 میں 'چل چل رے نوجوان' بن کر ریلیز ہوچکی تھی جس کے سبھی نغمے پردیپ نے لکھے تھے۔ فلم 'آٹھ دن' کے نغمے قمر جلال آبادی اور گوپال سنگھ نیپالی کو لکھنے کے لیے دیے گئے۔ اس فلم کے کچھ کرداروں کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا سعادت حسن منٹو، راجہ مہدی علی خاں اور اوپندر ناتھ اشک نے وہ کردار ادا کیے۔ اسی زمانے میں فلم 'شہید' کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ اس فلم کے ہدایت کار رمیش سہگل اور موسیقار غلام حیدر تھے۔ مرکزی کردار میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے ساتھ چندر موہن تھے۔ اس فلم میں سات نغمے تھے۔ لہٰذا چار نغمے راجہ مہدی علی خاں کو لکھنے کے لیے دیے گئے۔ باقی نغمے قمر جلال آبادی اور منتخب جارچوی کے حصے میں آئے۔

راجہ مہدی علی خاں کے نغموں میں 'وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہوں' اور 'آجا بے دردی بلما کوئی رو رو پکارے' بے حد مقبول ہوئے اور 'وطن کی راہ' والے نغمے نے تو دھوم ہی مچادی۔ کشمیر سے کنیا کماری اور بنگال سے راجستھان تک اس نغمے کی گونج سنی گئی۔ اس نغمے کو سنتے ہی جوش آجاتا تھا۔ آج بھی قومی تہواروں کے موقعے پر یہ گانا ضرور سنائی دیتا ہے اور سدابہار فلمی نغموں میں اس گانے کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس ایک ہی گانے سے راجہ مہدی علی خاں کی پہچان کامیاب نغمہ نگاروں میں ہونے لگی۔

1947 میں فلمستان کی ایک دوسری فلم 'دو بھائی' بھی زیر تکمیل تھی۔ اس فلم کے بھی گیت راجہ مہدی علی خاں

نے لکھے تھے۔ گیتا رائے کی آواز میں 'مرا سندر سپنا ٹوٹ گیا' نغمہ کافی مقبول ہوا تھا۔ اس کی موسیقی ایس ڈی برمن نے ترتیب دی تھی۔ اس کے بعد 1950 تک راجہ مہدی علی خاں نے تقریباً دس فلموں میں نغمہ نگاری کی۔ 1948 میں دو دیا، ضدی 1949 میں فلم 'کمل' اور 1950 میں فلم 'بھائی بہن، مانگ، مغرور، مقدر، نردوش، سنگرام اور آنکھیں۔

1951 میں فلم 'مدہوش' ریلیز ہوئی جس میں موسیقار مدن موہن نے 'میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا' گانے کو ترتیب دے کر یادگار بنا دیا۔ اس فلم سے مدن موہن کے ساتھ راج مہدی علی خاں کی جوڑی بن گئی اور پھر کئی بہترین اور معیاری نغموں سے فلمی دنیا سرشار ہوئی۔ فلم 'مدہوش' کے گیارہ سال بعد 1961 میں فلم 'اَن پڑھ' میں ایک بار پھر مدن موہن اور راجہ مہدی علی خاں ایک ساتھ دکھائی دیے اور اس جوڑی نے فلمی دنیا کو کئی بے حد کامیاب نغمے دیے۔ 1964 میں 'وہ کون تھی'، 1966 میں 'دلہن ایک رات کی' ان سبھی فلموں کا سنگیت مدن موہن نے دیا تھا اور نغمے راجہ مہدی علی خاں نے تخلیق کیے تھے۔

فلمی نغموں میں سچویشن کے مطابق موسیقار کی دھن پر دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے نغمہ نگاری ایک نہایت مشکل کام ہے جسے راجہ مہدی علی خاں نے بڑی ہی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

ان کے بے حد کامیاب فلمی نغموں میں 'پوچھو ہمیں، ہم ان کے لیے کیا نذرانے لائے ہیں' فلم 'مٹی میں سونا' جب چھائے کبھی ساون کی گھٹا (ریشمی رومال)، آپ یوں ہی اگر ہم سے ملتے رہے (ایک مسافر ایک حسینہ) آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے (اَن پڑھ) جو ہم نے داستاں اپنی سنائی (وہ کون تھی) اگر مجھ سے محبت ہے مجھے سب اپنے غم دے دو (آپ کی پرچھائیاں) تو جہاں جہاں چلے گا میرا سایہ ساتھ ہوگا (میرا سایہ) آخری گیت محبت کا سنا لوں تو چلوں (نیلا آکاش) وغیرہ نغمے آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

1949 میں ممبئی کے فضلی برادرس اپنی فلمی کمپنی کے لیے ایس ایف حسنین کی ہدایت میں فلم 'دنیا' بنا رہے تھے۔ اس کے ایک نغمہ نگار آرزو لکھنوی بھی تھے۔ انھوں نے دو نغمے لکھے اور اچانک وہ پاکستان چلے گئے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے فضلی کو ایک بہترین نغمہ نگار کی ضرورت تھی۔ یہ خلا اسد بھوپالی کی شکل میں پُر ہوا۔

اسد بھوپالی نے فلم 'دنیا' میں دو نغمے لکھے۔ محمد رفیع کی آواز میں 'رونا ہے تو رو چپکے چپکے آنسو نہ بہا آواز نہ ہو' اور 'ارمان لیے دل ٹوٹ گیا۔ دکھ درد کا ساتھی چھوٹ گیا' ثریا کی آواز میں ریکارڈ ہوئے تھے۔ 1950 میں انھیں فلم 'آدھی رات' میں دو نغمے لکھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ 'ادھر تو آؤ سرکار۔ کسی کی جیت کسی کی ہار'، 'دل ہی تو ہے تڑ گیا۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں' ان دونوں نغموں کو لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ اسی سال انھیں فلم 'نردوش' میں موسیقار شیام سندر کی موسیقی میں نغمے لکھنے کا موقع ملا جنھیں لتا منگیشکر اور شمشاد بیگم کی دلکش آواز حاصل ہوئی۔

1951 میں بی آر چوپڑا کی فلم 'افسانہ' کے چھ نغمے اسد بھوپالی نے لکھے۔ ان نغموں نے سارے ملک میں دھوم مچا دی مگر اس سال انھیں صرف ایک فلم 'راجپوت' ملی۔ 1949 سے 1990 تک تقریباً سو فلموں میں انھوں نے چار سو گیت لکھے تھے۔ تقریباً سبھی بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ لکشمی کانت پیارے لال کی فلم 'پارس منی' کے نغمے 'وہ جب یاد آئے بہت یاد آئے' (رفیع - لتا) اور 'ہنستا ہوا نورانی چہرہ' (لتا - کمل باروٹ) نے تو اپنے وقت میں مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔

1989 میں جب سورج بڑجاتیہ نے اپنی مشہور اور مقبول فلم 'میں نے پیار کیا' موسیقار رام لکشمن کے ساتھ شروع کی تو اسد بھوپالی اس فلم کے سب سے اہم نغمہ نگار تھے۔ اس فلم کا اہم ترین نغمہ 'کبوتر جا جا جا کبوتر جا جا جا' فلم ریلیز ہوئی، مقبول ہوئی اور یہ نغمہ بھی نہ صرف مارکیٹنگ کے لحاظ سے بلکہ مقبولیت کے لحاظ سے بھی سپر ہٹ ہوا اور فلم فیئر ایوارڈ کے لیے اس نغمے کو 1990 کا بہترین نغمہ قرار دیا گیا۔

1949 میں ریلیز ہونے والی فلم برسات کے گیت

جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے
آجا میرے بالما تیرا انتظار ہے

کی کامیابی کے بعد حسرت جے پوری راتوں رات بطور نغمہ نگار اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ فلم برسات کی کامیابی کے بعد راج کپور، حسرت جے پوری اور شنکر جے کشن کی ٹیم نے کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کیا۔ ان میں آوارہ شری 420، چوری چوری، اناڑی، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، سنگم، تیری قسم، دیوانہ، اراؤنڈ دی ورلڈ، میرا نام جوکر، کل آج اور کل، جیسی فلمیں شامل ہیں۔

شنکر جے کشن کی جوڑی حسرت جے پوری کے ساتھ بھی خوب کامیاب ہوئی۔ اس جوڑی کے گیتوں میں شامل کچھ مشہور گیت یہ ہیں چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا (برسات)، ہم تجھ سے محبت کر کے صنم (آوارہ)، اچک دانہ بچک دانہ (شری 420)، آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم (چوری چوری)، جاؤں کہاں بتا رے دل (چھوٹی بہن)، احسان تیرا ہوگا (جنگلی)، تیری پیاری پیاری صورت کو (سسرال)، تم روٹھی رہو میں مناتا رہوں (آس کا پنچھی)، بہارو پھول برساؤ (سورج)، دنیا بنانے والے (تیری قسم)، کون ہے جو سپنوں میں آیا (آسمان)، رخ سے ذرا نقاب اٹھا دو میرے حضور (میرے حضور)، پردے میں رہنے دو (شکار)، جانے کہاں گئے وہ دن (میرا نام جوکر)، زندگی ایک سفر ہے سہانا (انداز)

حسرت جے پوری اور راج کپور کا ساتھ 1971 تک قائم رہا۔ فلم 'میرا نام جوکر' اور 'کل آج اور کل' کی باکس آفس پر ناکامی کے بعد راج کپور نے حسرت کی جگہ آنند بخشی کو اپنی فلموں میں لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد حسرت نے راج کپور کے لیے فلم 'رام تیری گنگا میلی' میں 'سن صاحبہ سن' گیت لکھا جو بہت مقبول ہوا۔

گلزار نے فلم انڈسٹری میں اب سے تقریباً چالیس سال قبل بحیثیت ایک نغمہ نگار کے قدم رکھا۔ فلم 'بندنی' میں موسیقار ایس۔ ڈی۔ برمن نے ان سے نغمہ لکھوایا۔ وہ نغمہ اپنے لب و لہجہ اور لفظیات کے اعتبار سے کامیاب اور مقبول ہوا۔ گلزار کے قدم فلم انڈسٹری میں جم گئے۔ یہ نغمہ بہت مشہور ہوا

مورا گورا رنگ لے لے
موہے شیام رنگ دے دے

فلم 'میرے اپنے' کا نغمہ 'کوئی ہوتا جس کو اپنا ہم کہہ لیتے یارو!' تنہائی کے شدید کرب کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح مینا کماری پر فلمایا گیا یہ گیت 'رات اکیلی آئے۔ چاند کٹورا لائے' نئی امیجری پیش کرتا ہے۔ گلزار ایک ایسے نغمہ نگار ہیں جو اپنے نغموں میں نئی لفظیات، اچھوتے خیال اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ فلمی نغموں کے شور میں گلزار کی آواز دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔

بڑی ادا سے نبھائی تم نے ہماری تھوڑی سی بے وفائی
جہاں سے تم موڑ مڑ گئے تھے وہ موڑ اب بھی وہیں پڑے ہیں
ہم اپنے پیروں میں جانے کتنے بھنور لپیٹے ہوئے کھڑے ہیں
(تھوڑی سی بے وفائی)

میرا کچھ ساماں تمھارے پاس پڑا ہے
ساون کے کچھ بھیگے دن رکھے ہیں
اور میرے اک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھوا دو۔ میرا وہ ساماں لوٹا دو
پت جھڑ میں کچھ پتوں کے گرنے کی آہٹ
کانوں میں اک بار پہن کر لوٹائی تھی
پت جھڑ کی وہ شاخ ابھی تک کانپ رہی ہے
وہ شاخ گرا دو۔ میرا وہ ساماں لوٹا دو
(اجازت)

ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو
پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو

صرف احساس ہے یہ روح سے محسوس کرو
ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو

(خاموشی) گلزار نے کلاسیکی و جدید ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے لیکن ان کی طبیعت کا میلان جدید ادب کی طرف مائل ہے۔ جدید ادب کے نمائندہ رجحانات سے انھوں نے نغمہ نگاری کے لیے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ نئی لفظیات اور نئی امیجری اسی مطالعے کے باعث ان کی نغمہ نگاری نے نئی راہ نکالی ہے۔ وہ بالکل سامنے کی بات کو آسان اور سادہ لفظیات میں ایک اچھوتے انداز میں کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔

مجروح 1945 میں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے ممبئی گئے۔ جہاں مشہور فلم ساز اور ہدایت کار اے آر کاردار ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں اپنی فلم میں نغمے لکھنے کی پیشکش کی، لیکن مجروح نے کاردار صاحب کی یہ پیشکش نامنظور کردی کیونکہ وہ فلموں میں گیت لکھنا معیوب سمجھتے تھے۔

مگر جگر صاحب نے انھیں مشورہ دیا کہ فلموں میں نغمے لکھنے میں کوئی برائی نہیں چنانچہ مجروح جگر صاحب کے مشورے پر فلموں میں نغمے لکھنے پر رضامند ہوگئے۔ مشہور موسیقار نوشاد صاحب نے انھیں ایک دھن سنائی اور ان سے اس پر نغمہ لکھنے کے لیے کہا۔ مجروح نے اس دھن پر جو نغمہ لکھا اس کا مکھڑا 'ان کے گیسو بکھرے بادل آئے جھوم کے' مجروح کے نغمہ لکھنے کے ڈھنگ سے نوشاد کافی متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی نئی فلم 'شاہ جہاں' کے لیے ان سے گیت لکھنے کے لیے کہا۔ 'شاہجہاں' بہت کامیاب ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے محبوب خاں کی 'انداز' اور ایس فاضل کی 'مہندی' جیسی فلموں میں اپنی نغمہ نگاری کی کامیابی کے بعد فلمی دنیا میں بطور نغمہ نگار اپنی شناخت قائم کرلی۔

شاہ جہاں کے بعد مجروح سلطان پوری اور موسیقار نوشاد کی جوڑی نے انداز (1949)، ساتھی (1968)، پاکیزہ (1971)، تانگے والا (1971)، دھرم کانٹا (1982) اور گڈو (1995) جیسی فلموں میں ایک ساتھ کام کیا۔

اپنے اشتراکی نظریات کی وجہ سے مجروح صاحب کو کئی بار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں جیل جانا بھی شامل ہے۔ انھیں دو سال جیل میں گزارنے پڑے۔

جیل میں رہنے کی وجہ سے مجروح کے کنبہ کی مالی حالت کافی خراب ہوگئی اور فلم ساز و اداکار راج کپور نے ان کی مدد کرنی چاہی مگر مجروح نے ان سے بھی انکار کردیا۔ اس کے بعد راج کپور نے ان سے گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ مجروح نے ان کے لیے 'ایک دن بک جائے گا ماٹی کے مول' نغمہ لکھا جس کے عوض راج کپور نے انھیں ایک ہزار روپے دیے۔

تقریباً دو سال جیل میں رہنے کے بعد مجروح جوش و خروش کے ساتھ فلمی دنیا میں واپس آئے اور 1953 میں فلم 'فٹ پاتھ' اور آر پار کے کامیاب نغموں کے ذریعے ایک بار پھر اپنا سکہ جما لیا۔ ان کی فلمی زندگی میں موسیقار ایس ڈی برمن کے ساتھ ان کی جوڑی بہت کامیاب رہی۔

پے انگ گیسٹ، نو دو گیارہ (1957)، سولہواں سال، کالا پانی، چلتی کا نام گاڑی (1958)، سجاتا (1959)، ممبئی کا بابو (1960)، بات ایک رات کی (1962)، تین دیویاں (1965)، جیول تھیف (1967) اور ابھیمان (1973) اس جوڑی کی سپر ہٹ فلموں میں شامل ہیں۔

مجروح سلطانپوری کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر 1993 میں انھیں فلمی دنیا کے سب سے بڑے اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 1964 کی فلم 'دوستی' میں اپنے نغموں کے لیے انھیں فلم کی بہترین نغمہ نگاری کا ایوارڈ ملا۔

مشہور فلم ساز اور ہدایت کار ناصر حسین کی فلموں کے لیے مجروح نے سدابہار نغمے لکھ کر ان کی فلموں کو کامیاب بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ ان فلموں میں تیسری منزل، بہاروں کے سپنے، پیار کا موسم، کارواں، یادوں کی بارات، ہم کسی سے کم نہیں، زمانے کو دکھانا ہے جیسی مشہور و مقبول فلمیں شامل ہیں۔

مجروح نے چار دہائیوں سے بھی زیادہ کی مدت میں تقریباً 300 فلموں میں نغمے لکھے۔ زندگی کے ہر فلسفے اور ہر رنگ پر چار دہائیوں سے زیادہ عرصے تک تین ہزار سے زائد نغمے لکھنے والے مشہور شاعر اور نغمہ نگار مجروح سلطان پوری کا زندگی کے تئیں نظریہ کچھ ایسا تھا

ایک دن بک جائے گا ماٹی کے مول
جگ میں رہ جائیں گے پیارے تیرے بول

1948 میں ساحر لدھیانوی نے دہلی سے ماہنامہ 'شاہراہ' کا اجرا کیا تو اس کے ساتھ ہی رسالہ 'پریت کی لڑی' کی بھی ادارت کی۔ ان رسائل کے ذریعے انھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور رہنمائی کی۔ 1949 میں ساحر جب دوسری بار ممبئی گئے تو وہاں ہندوستانی کلا مندر کی فلم 'آزادی کی راہ پر' کے لیے نغمے لکھوانے کی غرض سے فلمساز کلونت رائے نے ساحر کو بلوایا تھا۔ اس فلم کے چار نغمے ساحر نے لکھے تھے۔ پہلے نغمے کے بول تھے 'بول رہی ہے زندگی'۔ مگر ان نغموں کو زیادہ مقبولیت نہیں ملی۔

1950 میں ساحر نے مستقل طور پر دہلی کو الوداع کہہ کر ممبئی میں سکونت اختیار کرلی اور فلمی نغمہ نگاری پر پوری توجہ دی۔ 1949 کے بعد فلمی زندگی کی مصروفیات نے ساحر کو اس طرح گھیر لیا کہ تخلیقی شاعری کے لیے مناسب وقت نکالنا ان کے لیے مشکل ہوگیا۔ اس کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ فلمی نغموں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنالیا اور فلموں کے لیے انھوں نے جو نغمے اور غزلیں لکھیں، ان میں اپنے سیاسی اور سماجی تصورات کے اظہار کی بھی گنجائش نکال لی۔

1958 میں ساحر لدھیانوی نے فلمساز رمیش سہگل کی فلم 'پھر بھی صبح ہوگی' کے نغمے لکھے۔ موسیقار خیام کو اس فلم کا میوزک دیا گیا اور انھوں نے ساحر کے نغمہ 'وہ صبح کبھی تو آئے گی' کی دھن تیار کی اور مکیش نے اس نغمے کو بہت ہی خوبصورت انداز میں گایا ہے۔ اس کے بعد کئی فلموں میں ساحر کے نغموں کو خیام نے اپنی دھنوں سے سجایا جن میں 'کبھی کبھی' بھی ایک اہم فلم ہے۔ ساحر اپنے فلمی نغموں میں عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف کھل کر آواز اٹھاتے ہیں۔ فلم 'پیاسا' کا نغمہ 'یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے' اور فلم 'سادھنا' کا نغمہ 'عورت نے جنم دیا مردوں کو' اور فلم 'انصاف کا ترازو' میں ساحر کا لکھا گیت 'لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں' اس بات کے بہترین شاہد ہیں۔

ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری سے پہلے فلمی نغمہ نگاری میں ٹھیٹ ادبی قسم کی لفظیات اور ادبی نظموں کے استعمال کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن ساحر نے اپنی تمام ادبی نظموں کو فلموں میں اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا کہ وہ فلم کا حصہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے فلم 'گمراہ' میں سنیل دت نے مہندر کپور کی آواز میں ساحر کی نظم پڑھی۔ 'چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں' یہ ساحر کا ہی جگر ہے جو وہ اس طرح اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتا ہے، ورنہ تو اردو شاعری محبوبہ کے ناز نخرے اٹھانے اور اس کی خوشامدوں سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح فلم 'پیاسا' میں ان کی مشہور زمانہ نظم 'چکلے' بخوبی استعمال ہوئی اور یہ دونوں نظمیں ہی فلم کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح فلم 'لیلیٰ مجنوں' کے ایک نغمے کا یہ بند ملاحظہ ہو

بہت رنجور ہے یہ، غموں سے چور ہے یہ
خدا کا خوف کھاؤ، بہت مجبور ہے یہ

اب اس فلمی نغمہ نگاری میں لفظ 'رنجور' ساحر لدھیانوی جیسا نغمہ نگار ہی استعمال کرسکتا ہے۔

اپنے زمانے کے مقبول فلمساز و ہدایت کار گرو دت بھی ساحر کی نغمہ نگاری سے بے حد متاثر تھے اور وہ اپنی فلموں کے نغمے ساحر سے ہی لکھواتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی مشہور زمانہ فلم 'پیاسا' میں ساحر کی زندگی کی جھلک بھی پیش کی اور نہ صرف یہ کہ اس فلم کے نغمے بہت

مقبول ہوئے بلکہ یہ فلم گرودت کی زندگی کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ کافی عرصے بعد یش چوپڑا نے بھی اپنی فلم 'کبھی کبھی' میں ساحر کی زندگی کی عکاسی کی اور اس فلم کے نغمے بھی ساحر نے ہی تخلیق کیے تھے۔ فلم 'کبھی کبھی' یش چوپڑا کی بے حد کامیاب فلموں میں سے ایک ہے۔

ساحر لدھیانوی کو 1963 میں سب سے پہلے فلم 'تاج محل' کے نغمے 'جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

1952 میں فلمساز شاہد لطیف نے سب سے پہلے اپنی فلم 'بزدل' کے لیے دو نغمے کیفی اعظمی سے لکھوائے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ کیفی کو فلموں میں نغمہ نگاری کا کام ملنے لگا۔ انھوں نے گرودت کی فلم 'کاغذ کے پھول' اور موہن سہگل کی فلم 'اپنا ہاتھ جگن ناتھ' کے لیے نغمے لکھے۔ فلم 'کاغذ کے پھول' کے نغمے بے حد مقبول ہوئے اور اس کے رمیش سہگل کی فلم 'شعلہ و شبنم' کا نغمہ 'جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے' بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد جب چیتن آنند نے اپنی فلم 'حقیقت' کے نغمے کیفی اعظمی سے لکھوائے تو اس فلم کے سب نغمے مقبول ہوئے اور فلم بھی کامیاب رہی۔ چیتن آنند کی ہی ایک فلم 'ہیر رانجھا' تو کیفی صاحب کا ایک کارنامہ ہے، کیونکہ اس پوری فلم کے مکالمے کیفی اعظمی نے منظوم لکھے تھے۔

کیفی اعظمی کے فلمی نغموں کا انداز بھی جداگانہ ہے۔ انھوں نے فلم 'حقیقت' کا یہ نغمہ لکھا تھا

ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہوگا

وطن پرستی پر ان کا اسی فلم کا دوسرا نغمہ

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیو

آج بھی ہندوستان کے لاکھوں سپاہیوں کے خون کو گرما دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم 'پاکیزہ' 'رضیہ سلطان'، 'کہرا'، 'ہنستے زخم' اور 'ارتھ' کی نغمہ نگاری کے لیے کیفی اعظمی کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

آج بھی جاوید اختر کے قلم کا جادو ہنی مون ٹریولس پرائیویٹ لمیٹڈ' کے نغمے 'تمھارے واسطے دے دوں گی جان وے' ورد زبان بنا ہے۔

'تارا رم پم'، 'میری گولڈ' اور 'اوم شانتی اوم' کے لیے جس طرح کے مختلف موڈ کے نغمے انھوں نے لکھے اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ان کے پاس وراثت کی پونجی تو ہے ہی عوام الناس کی دکھتی رگ سے بھی وہ واقف ہیں۔ فلم کا 'کھڑا' 'ورلڈ' 'دسکو' جہاں نوجوانوں کی پہلی پسند بنا ہے وہیں 'ٹریک' 'سونا سونا لاگے' ادبی گیت ہے۔

جاوید اختر کی نغمہ نگاری سے سامعین کے دل کو جہاں

فلم سے وابستہ نغمہ نگاروں نے ہر مقبول نظریہ و خیال اور شعری و تخلیقی تجربوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے دنیائے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فرد اور سماج کو بھی بہت کچھ دیا ہے۔ نغمہ نگاری کا اثر صرف فلموں تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے نغمے کسی مخصوص طبقے یا گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فلم کے کرداروں اور سچویشن کو بنیاد بنا کر فلمی نغمہ نگاروں نے سماج اور افراد کو کچھ اس طرح روبرو کردیا ہے جیسے دو آئینوں کو آمنے سامنے کردیا جائے۔

تازہ ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوتا ہے وہیں ان میں جوش بھی بھرا ہے۔ یہی خوبی ان کی نغمہ نگاری کو ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

فلم انڈسٹری ایسے بے شمار فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے معیاری نغمہ نگاری کو اپنی فلموں کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان تمام فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے علاوہ بی آر چوپڑا، راما نند ساگر اور گرودت کا نام لوں گا، جنھوں نے تقریباً اپنی ہر فلم میں معیاری شاعری کو اہمیت دی ہے۔

گرودت نے متعدد فلمیں بنائیں لیکن میں صرف ان کی دو فلموں کے کچھ نغموں کو آپ کے سامنے رکھوں گا۔ فلم 'پیاسا' جو ایک شاعر کی زندگی سے متاثر ہے اس کے نغموں کو لکھنے کے لیے گرودت نے ساحر لدھیانوی کا انتخاب کیا تھا اور دوسری فلم ہے 'چودھویں کا چاند' جو سرزمین لکھنؤ کے ماحول اور تہذیب کی عکاسی کرتی ہے اس کے نغموں کے لیے گرودت نے شکیل بدایونی کو چنا تھا۔

فلمی دنیا کی ایک مایہ ناز ہستی بی آر چوپڑا نے متعدد کامیاب ترین فلمیں بنائیں اور اپنی زیادہ تر فلموں کے لیے ساحر لدھیانوی کی نغمہ نگاری کو ہی پسند کیا۔ ان کی فلموں میں ساحر کے شاعرانہ حسن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ساحر کو صرف چاہتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شاعری سے بھی جذباتی لگاؤ محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے جس طرح ان کی بعض نظموں کو اپنی فلموں میں نغمہ بنا کر پیش کیا وہ بہت ہمت کا کام ہے۔

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی
ہوتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی
شرما کے منھ نہ پھیر نظر کے سوال پر
لاتی ہے ایسے موڑ پہ قسمت کبھی کبھی
کھلتے نہیں ہیں روز دریچے بہار کے
آتی ہے جان من! یہ قیامت کبھی کبھی
تنہا نہ کٹ سکیں گے جوانی کے راستے
پیش آئے گی کسی کی ضرورت کبھی
پھر کھو نہ جائیں ہم کہیں دنیا کی بھیڑ میں
ملتی ہے پاس آنے کی مہلت کبھی کبھی

ساحر لدھیانوی (فلم: آنکھیں)

فلمی نغمہ نگاری کے توسط سے زندگی کی ایسی تمام تلخ و شیریں حقیقتوں کو جنھیں ہم نے بارہا دیکھا ہے، سنا ہے، محسوس کیا ہے اور نظر انداز بھی کر دیا ہے اسے ان نغمہ نگاروں نے بہت پر کیف بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور اپنے نغموں میں صرف اپنے عہد کے ظاہری اور باطنی اضطراب کو ہی نہیں سمیٹا بلکہ نئے اضطراب کو بھی جنم دیا ہے۔

فلم سے وابستہ نغمہ نگاروں نے ہر مقبول نظریہ و خیال اور شعری و تخلیقی تجربوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے دنیائے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ فرد اور سماج کو بھی بہت کچھ دیا ہے۔ نغمہ نگاری کا اثر صرف فلموں تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے نغمے کسی مخصوص طبقے یا گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فلم کے کرداروں اور سچویشن کو بنیاد بنا کر فلمی نغمہ نگاروں نے سماج اور افراد کو کچھ اس طرح روبرو کر دیا ہے جیسے دو آئینوں کو آمنے سامنے کر دیا جائے۔

14 مارچ 1931 سے شروع ہونے والا فلمی نغمہ نگاری کا سفر آج بھی مکمل آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اس درمیان میں کتنے ہی نغمہ نگار سامنے آئے اور چلے گئے۔ بعض نے چند ایک کامیاب نغمے لکھے اور بعض کچھ مخصوص مدت کے لیے مصروف و مشہور رہے اور پھر غائب ہو گئے لیکن شکیل، ساحر، مجروح، حسرت، جاں نثار اختر، اسد بھوپالی، راجہ مہدی علی خاں اور کیفی اعظمی وغیرہ کے گیت آج بھی پردۂ سماعت اور صفحۂ دل پر گہرے نقوش مرتسم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں گلزار، شہریار، حسن کمال، جاوید اختر، ندا فاضلی اور ان کے ساتھ بہت سے نئے نغمہ نگار فلموں کی تکنیک اور دیگر متعلقہ امور کی تبدیلیوں کو انگیز کرتے ہوئے اپنے قلم کا جادو دکھا رہے ہیں۔ فلمی نغمہ نگاری کی تاریخ اس طرح کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ نغمہ نگاری مکمل سنیما کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

■

Dr. Nishat Hasan
15/65, Tirlokpuri
Delhi - 110091

ونڈوز کیا ہے؟
(What is Windows)

حصہ-1 میں آپ آپریٹنگ سسٹم کے بارے میں اختصار میں پڑھ چکے ہیں۔ ونڈوز ایکس پی (Windows XP) پرسنل کمپیوٹروں کے لیے بنائے گئے ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کا اپنے وقت کا سب سے مقبول ایڈیشن تھا، جو سال 2004 میں امریکہ کی مائکروسوفٹ کمپنی کے ذریعے تیار کر کے جاری کیا گیا تھا۔ یہ 64 بٹ والا، واحد صارف اور ملٹی ٹاسکنگ آپریٹنگ سسٹم تھا، جس میں نیٹ ورک، فیکس، انٹرنیٹ، ای میل، ملٹی میڈیا کی جدید سہولیات بھی جوڑی جا سکتی تھیں۔ یہ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ تجارتی اور گھریلو دونوں ہی قسم کے کاموں کو کرنے کا اہل تھا اور اکیلے بھی پی سی یا نیٹ ورک میں یکساں طور پر کارگر تھا۔

ونڈوز وسٹا (Windows Vista) اس سیریز کا اگلا اہم آپریٹنگ سسٹم تھا، جو ونڈوز ایکس پی کو بہتر کر کے اور اس میں انٹرنیٹ اور سیکورٹی سے متعلق اضافی سہولیات جوڑ کر تیار کیا گیا تھا۔

ونڈوز 7 اس سیریز کا اگلا اہم آپریٹنگ سسٹم تھا، جو 2009 میں ونڈوز وسٹا میں نئی تکنیکی تبدیلی لا کر تیار کیا گیا ہے۔ اس وقت یہ دنیا کا سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والا آپریٹنگ سسٹم ہے۔

ونڈوز 8 مائکروسوفٹ کے ذریعے بنائے گئے آپریٹنگ سسٹم کی فیملی کا اگلا ایڈیشن ہے، جو بالکل نئے انٹرفیس کے ذریعے آیا ہے۔ ونڈوز 8، ونڈوز 7 کی ہی بنیاد پر بنا ہے۔ ونڈوز 8 میں مائکروسوفٹ ایک نئے میٹرو انٹرفیس اسٹائل کو لے کر آیا ہے، جو ٹچ (چھونے) کے لیے بنا ہے۔ اس میں ماؤس کے ساتھ ساتھ آپ اپنی انگلی سے اسکرین کو چھو کر بھی کام کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ہم ونڈوز 7/8 کو اپنی بنیاد بناتے ہوئے اس حصہ میں آپ کو پہلے ونڈوز 7 کی اور پھر ونڈوز 8 کی تفصیلی جانکاری دیں گے۔

ونڈوز کی ابتدا (Evolution of Windos)

ونڈوز آپریٹنگ سسٹم گرافکل یوزر انٹرفیس (Graphical User Interface, GUI) پر کیے گئے تحقیقی کاموں کا نتیجہ ہے۔ سال 1980 کی دہائی کے شروع میں میسرز زیروکس کارپوریشن کے ذریعے اس موضوع پر ریسرچ کی گئی تھی۔ تحقیقی کام سے یہ ثابت ہوا کہ ہاتھ میں پکڑے جانے والے کسی اشاراتی آلہ، جیسے ماؤس (Mouse) کے ذریعے تصویروں کے سہارے کمپیوٹر کے ساتھ رابطہ قائم کرنا کہیں زیادہ آسان ہے۔

اس کمپنی نے ان سہولیات کے ساتھ سب سے پہلے زیروکس اسٹار (Xerox Star) نامی کمپیوٹر بنایا۔

لیکن گرافکل یوزر انٹرفیس کو اصل مقبولیت میسرس ایپل کمپیوٹر (Apple Computer) کے ذریعے بازار میں اتارے گئے میکن توش (Macintosh) کمپیوٹر کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اس میں ایک مکمل آپریٹنگ سسٹم تھا، جو گرافکل یوزر انٹرفیس پر مبنی تھا حالانکہ یہ رفتار کے معاملے میں بہت دھیما تھا، لیکن کاروباری نقطۂ نظر سے یہ بہت کامیاب رہا۔

1980 کی دہائی کے آخری دنوں میں مائکروسوفٹ ونڈوز سب سے زیادہ مقبول آپریٹنگ سسٹم بن گیا تھا۔ یہ آئی بی ایم (IBM) کمپنی کے ذریعے آفیشیل طور پر منظور اور استعمال کیا گیا تھا۔ آج کل تقریباً سبھی آئی بی ایم اور اس کے ہم پلہ پرسنل کمپیوٹروں پر ونڈوز XP/7 دستیاب ہے۔

ونڈوز 7 اور 8 آپریٹنگ سسٹم کو اپنی موجودگی میں آنے سے پہلے ایک لمبے ترقیاتی عمل سے گزرنا پڑا ہے۔ اس کے سابق مختلف ایڈیشنوں کو آگے دی گئی جدول W-1 میں اختصار کے ساتھ بتایا گیا ہے۔

جدول-W-1: ونڈوز کا فروغ

ایڈیشن کا نام	جاری ہونے کا سال	بنیادی خصوصیات
ونڈوز 1.0	1985	جی یو آئی پر مبنی ونڈوز کا پہلا ایڈیشن، ضرورت پڑنے پر ملٹی ٹاسکنگ
ونڈوز 1.2	1987	ایک ونڈو پر دوسری ونڈو (Overlapping Windows)
ونڈوز 2.10	1987	مجازی مشینیں (Virtual Machines)
ونڈوز 3.0	1990	پروگرام مینجر/ فائل مینجر سہولت
ونڈوز 3.1	1992	ملٹی میڈیا، نیٹ ورک کی صلاحیت، مائکروسوفٹ میل
ونڈوز 3.11	1993	32 بٹ نیٹ ورکنگ، 32 بٹ فائل سسٹم
ونڈوز 95	1995	مکمل 32 بٹ آپریٹنگ سسٹم، ملٹی ٹاسکنگ، نیٹ ورک صلاحیتیں، لمبے نام، صلاحیت بڑھانے کی سہولت
ونڈوز 98	1998	انٹرنیٹ پر کام کرنے کی خصوصی سہولیات
ونڈوز 2000ME	2000	نیٹ ورک بنانے کی خصوصی سہولیات
ونڈوز XP	2004	نیٹ ورکنگ کے ساتھ دیگر خصوصی سہولیات
ونڈوز Vista	2007	نیٹ ورکنگ کے ساتھ بہتر سیکورٹی کی سہولیات
ونڈوز 7	2009	بہتر سیکورٹی، سرچ کی بہتر سہولت، بہتر انٹرفیس
ونڈوز 8	2012	نیا میٹرو انٹرفیس ٹچ کی سہولت کے ساتھ

ونڈوز 7 کی خصوصیات (Features of Windows 7)

ونڈوز 7 اور اس کا سابق ایڈیشن ونڈوز XP تمام خصوصیات سے لیس آپریٹنگ سسٹم ہیں۔ ان میں زیادہ تر مستعمل پی سی آپریٹنگ سسٹم کی تمام بہترین خصوصیات کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں بہت سی ایسی خصوصیات بھی ہیں، جو دوسرے آپریٹنگ سسٹم میں دستیاب نہیں ہیں۔ ونڈوز کے پچھلے ایڈیشن (Versions)

کی خصوصیات میں بھی اصلاح کی گئی ہے۔ یہاں ہم بعض چنندہ خصوصیات کی جانکاری دے رہے ہیں۔

(a) **ونڈوز ایرو** (Aero) - ونڈوز 7 کے نئے ہارڈ ویئر پر مبنی گرافکل یوزر انٹرفیس کو ونڈوز ایرو کہا گیا ہے۔ ایرو Authentic, Energetic, Reflective, Open (AERO) کا مخفف ہے۔ یہ نیا انٹرفیس پرانے ایڈیشنوں کے مقابلے کہیں زیادہ بہتر اور پرکشش ہے۔ اس میں زیادہ وضاحت، چھوٹی زندہ تصویریں اور شبیہیں ہیں۔ ونڈوز 7 میں نئے ایرو متبادل آئے ہیں، جیسے ایرو اسنیپ (Aero Snap)، ایرو پیک (Aero Peek)، ایرو شیک (Aero Shake) اور ایرو فلپ (Aero Flip)۔

(b) **اسٹارٹ مینو:** ونڈوز 7 میں اسٹارٹ مینو میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔ اس میں آپ کو اپنے ڈیسک ٹاپ کے نچلے بائیں کونے پر 'Start' لفظ کی بجائے ایک پرکشش دائرہ نما بٹن نظر آئے گا، جس پر ونڈوز کا آئیکن درج ہوگا۔ ونڈوز 7 میں XP کی طرح جھرنا مینو نہیں ہے۔ کسی متبادل کو کلک کرنے پر سب-مینو دائیں جانب کھلنے کی بجائے اسٹارٹ مینو میں ہی بنیادی متبادل کے تحت کھل جاتا ہے۔ اس سے مناسب پروگرام اور متبادل تلاش کرنا آسان ہوگیا ہے۔

(c) **انسٹنٹ سرچ:** فائلیں تلاش کرنا اب اور بھی آسان ہے۔ سرچ باکس اسٹارٹ مینو میں ہی موجود ہے۔ آپ کے ٹائپ کرنے کے ساتھ ساتھ ہی ونڈوز آپ کو متعلقہ فائلیں دکھا دیتی ہے۔

(d) **ونڈوز گیجٹس:** ونڈوز گیجٹس چھوٹے چھوٹے مکمل پروگرام ہیں، جو صارف کی ڈیسک ٹاپ اسکرین پر پائے جاتے ہیں، جیسے کہ کیلنڈر، موسم کی جانکاری، غیر ملکی کرنسی کی جانکاری وغیرہ۔ ونڈوز وستا میں یہ سہولت سائڈ بار پر تھی، لیکن ونڈوز 7 میں سائڈ بار نہیں ہے۔ ان گیجٹس کو آپ ڈیسک ٹاپ اسکرین پر کہیں بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔

(e) **ونڈوز انٹرنیٹ ایکسپلورر 8:** ونڈوز 7 میں کمپیوٹر وائرس کے خلاف سیکورٹی کے لیے متعدد خصوصیات ہیں۔ انٹرنیٹ ایکسپلورر 8 (IE8) وائرس اور نقصاندہ سوفٹ ویئر سے آپ کے کمپیوٹر کی حفاظت کرتا ہے۔ اس میں 'ٹیبڈ براؤسنگ' کی بھی سہولت ہے، جس کے ذریعے آپ کئی ویب سائٹ ایک ہی ونڈو میں کھول سکتے ہیں۔

(f) **ونڈوز میڈیا پلیئر 12:** نئے ونڈوز میڈیا پلیئر کی مدد سے آپ اپنے من پسند گانے اور ویڈیو کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ میڈیا لائبریری کا نیا گرافکل یوزر انٹرفیس فوٹو ڈسپلے اور میوزک لائبریری کا بآسانی لین دین کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

(g) **بیک آپ اور ری اسٹور سنٹر:** ونڈوز 7 میں بیک اَپ اور ری اسٹور ایپلی کیشن کے ذریعے آپ اپنی فائلوں کا بیک اَپ لے سکتے ہیں اور پرانے بیک اَپ حاصل کر سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، آپ اپنے پورے کمپیوٹر کا بیک اَپ ہارڈ ڈسک یا ڈی وی ڈی میں لے سکتے ہیں، جسے آپ اپنا کمپیوٹر یا ہارڈ ڈسک خراب ہونے پر دوسرے کمپیوٹر میں ڈال سکتے ہیں۔

(h) **ونڈوز فوٹوگیلری:** اس کے ذریعے آپ اپنے ڈجیٹل کیمرے یا موبائل کیمرے سے تصویریں اپنے کمپیوٹر میں ڈال سکتے ہیں اور تصویروں کے رنگ وغیرہ میں رد و بدل کر کے اسے اور بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ، آپ تصویروں کا سلائڈ شو بنا کر اسے ڈی وی ڈی میں بھی اسٹور کر سکتے ہیں۔

(i) **ونڈوز ڈی وی ڈی میکر:** ڈی وی ڈی میکر کی مدد سے صارف اپنی خواہش کے مطابق ویڈیو ڈی وی ڈی بنا سکتے ہیں۔

(j) **نئے دلچسپ کھیل:** ونڈوز 7 میں چیس ٹائٹنس، مہاجونگ ٹائٹنس اور پربل پلیس جیسے نئے کھیل ہیں۔ اس میں گیمس ایکسپلورر کے نام سے ایک فولڈر بھی ہے، جس میں سبھی کھیلوں کے شارٹ کٹ اور ان سے جڑی جانکاری بھی موجود ہے۔

(k) **ونڈوز اَپڈیٹ:** سوفٹ ویئر اور سیکورٹی اَپڈیٹ اب پہلے سے آسان ہوگئے ہیں، جنھیں آپ سیدھے کنٹرول پینل سے چلا سکتے ہیں۔ اسپیم فلٹر وغیرہ ونڈوز اَپڈیٹ کی مدد سے خود اَپڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ صارف آٹو میٹک اَپڈیٹ کو چن سکتے ہیں، جس کے ذریعے کوئی نیا آلہ جوڑنے پر اس کا ڈرائیور اپنے آپ انسٹال کر سکتے ہیں۔

(l) **ماں باپ کی طرف سے کنٹرول** (Parental Control): اس کی مدد سے آپ دوسرے صارف یا بچوں کے ذریعے ویب سائٹ، پروگرام اور کھیلوں پر پہنچ کر کنٹرول کر سکتے ہیں۔

ونڈوز 7 کی تنصیب (Installing Windows7)

عام طور پر جب بھی آپ ونڈوز 7 کے ساتھ کوئی پی سی خریدتے ہیں، تو ونڈوز اس میں تنصیب (انسٹال) کیا ہوا ملتا ہے لیکن کئی بار کوئی سسٹم فائل کسی وجہ سے خراب (Corrupt) ہو جاتی ہے، تو ہمیں ونڈوز پھر سے انسٹال کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ہم پی سی کے ساتھ آنے والی سیٹ اَپ ڈسکوں یا سی ڈی کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلے ونڈوز 95 سیٹ اَپ فلاپی ڈسکوں پر ہی دیا جاتا تھا، لیکن اب سی ڈی کا استعمال سہل ہونے کے سبب فلاپی ڈسکوں کا استعمال ختم ہوگیا ہے اور تمام طرح کے آپریٹنگ سسٹم اور دیگر قسم کے سوفٹ ویئر سی ڈی میں ہی آتے ہیں۔

سی ڈی کے ذریعے ونڈوز 7 انسٹال کرنا (Installing Windows 7 by CD)

ونڈوز 7 آج کل صرف CD/DVD پر دیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کو انسٹال کرنے کے لیے آپ کے کمپیوٹر میں CD/DVD ڈرائیو ضرور ہونی چاہیے۔ ایسا ہونے پر اس سی ڈی کو ڈرائیو میں لگائیے۔ ایسا کرتے ہی سی ڈی عموماً اپنے آپ ہی کھل جاتی ہے اور ونڈوز انسٹال کرنے والا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔

اگر ایسا نہ ہو، تو 'Computer' آئیکان کو ڈبل کلک کر کے کھول لیجیے، اور اس میں CD/DVD ڈرائیو کے آئیکان کو ڈبل کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی سی ڈی اپنے آپ کھل جاتی ہے اور ونڈوز 7 کو انسٹال کرنے والا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔

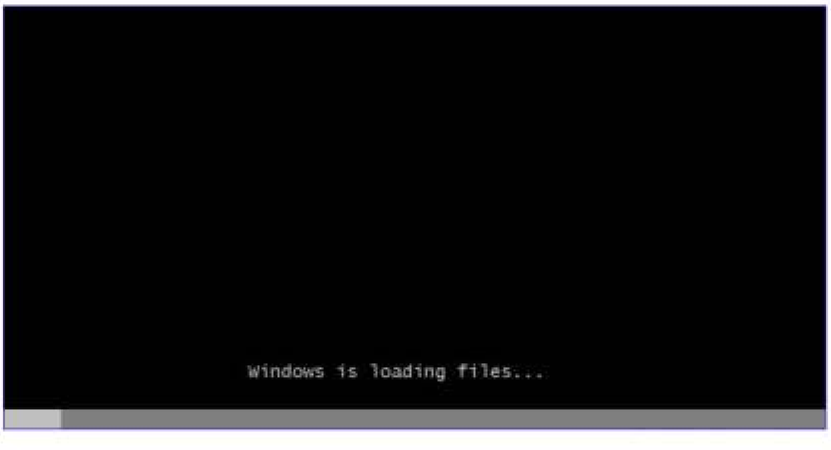

1. پروگرام شروع ہوتے ہی سب سے پہلے آپ کو اپنے کمپیوٹر کی اسکرین کالی نظر آئے گی، جس پر 'Windows is loading files' پیغام ہوگا۔اس کے بعد شروعاتی اسکرین (Boot Screen) دکھائی پڑے گی، جو فوراً سیٹ اَپ کے پہلے مرحلہ میں بدل جائے گی۔

2. اب کمپیوٹر آپ سے آپ کی زبان، وقت اور کرنسی فارمیٹ اور کی۔ بورڈ اور ان پٹ میتھڈ پوچھے گا۔ مناسب جانکاری بھر کر Next بٹن پر کلک کریں۔

3. ونڈوز 7 انسٹال کرنے کے لیے 'Install now' بٹن پر کلک کیجیے۔

4. اس کے بعد آپ کو 'Windows 7 End User License (EULA)' Agreement کو منظوری دینی ہوگی۔ اس کے لیے ''I accept the license terms'' چیک باکس کو کلک کیجیے اور پھر Next بٹن دبائیے۔

5. کمپیوٹر کی ہارڈ ڈرائیو میں ونڈوز کا پرانا ایڈیشن انسٹال ہونے کے سبب آپ کو دو آپشن دیے جائیں گے 'Upgrade' اور 'Custom (advanced)'۔ نیا ونڈوز Install کرنے کے لیے '(Custom advanced)' آپشن کو کلک کریں۔

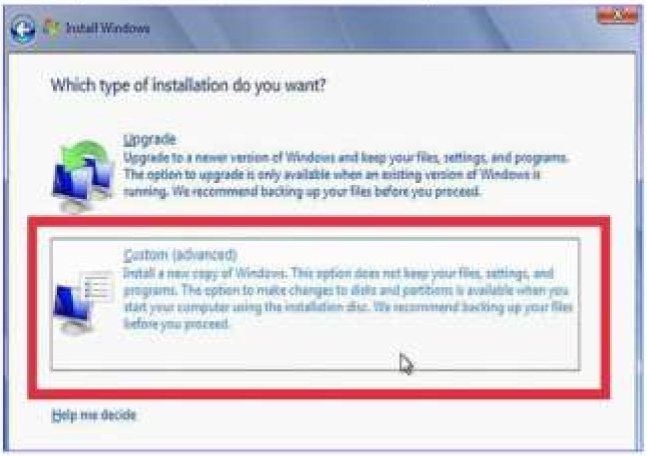

6. اس کے بعد آپ ونڈوز 7 کو انسٹال کرنے کے لیے جگہ چنیے۔ زیادہ تر، ونڈوز C: ڈرائیو میں ہی انسٹال کیا جاتا ہے۔

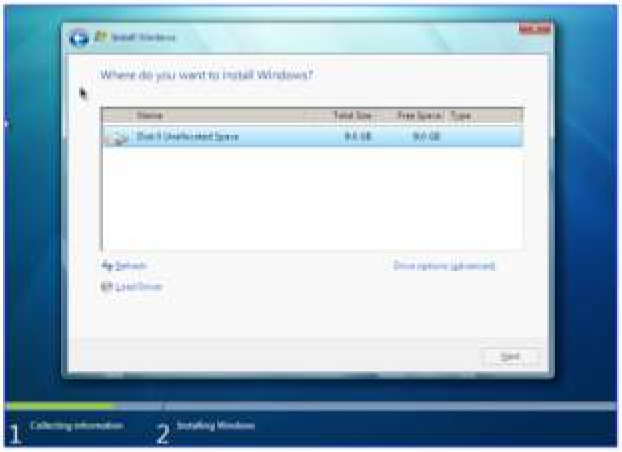

7. اس کے بعد ونڈوز 7 خود پانچ مرحلوں میں آپ کے کمپیوٹر میں انسٹال ہوجائے گا۔ اس عمل کے ختم ہونے پر آپ کا کمپیوٹر ری اسٹارٹ ہوگا۔

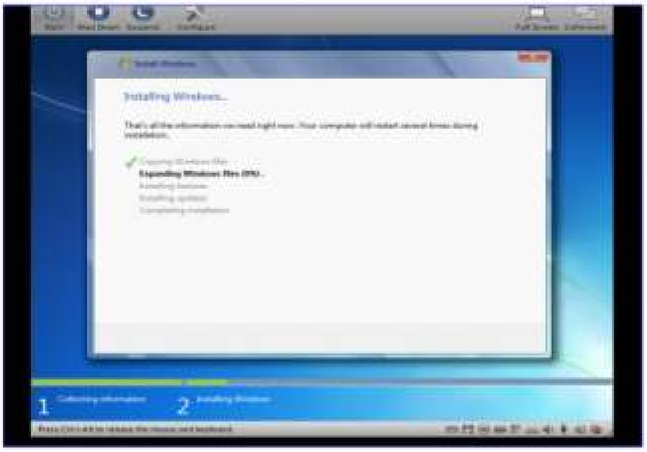

8. اس کے بعد کھلنے والی اسکرین 'Set Up Windows' کے ذریعے آپ اپنا نام، وال پیپر وغیرہ متعین کر سکتے ہیں۔ یوزر نیم' کمپیوٹر کا

9. اس کے بعد ونڈوز 7 کے لیے پاس ورڈ اور پاس ورڈ ہنٹ ڈالیں۔ پھر Next بٹن دبائیں۔

10. اس کے بعد آپ سے Product Key پوچھی جائے گی، جو آپ کو انسٹالیشن CD کے ساتھ ہی ملتی ہے۔ Product Key ٹائپ کر کے Next بٹن پر کلک کیجیے۔

11. اس کے بعد آپ کے کمپیوٹر میں کئی اسکرین اپنے آپ آئیں گی اور آپ کے کمپیوٹر میں ونڈوز انسٹال ہو جائے گا۔

12. ونڈوز انسٹال ہونے کے بعد ونڈوز ڈیسک ٹاپ اپنے آپ سامنے آجاتا ہے۔

به شکریه: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

کردار اور افسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)

مصنف: عبدالقادر سروری

صفحات: 118، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، تھوکر نمبر 8

شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

دنیائے افسانہ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی کی ایک ایسی تصنیف ہے جو فکشن شعریات کے باب میں بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے پہلے حصے میں عبدالقادر سروری نے افسانوں کی اہمیت، فنون لطیفہ اور افسانہ، حقیقت اور افسانہ، افسانوں کی پیدائش، افسانوں کی قسمیں، افسانے کا ارتقا، ناول، ناول کے عناصر، ناول کے منازل اور فکشن کے دیگر موضوعات اور متعلقات پر پرمغز گفتگو کی ہے اور فن افسانہ نگاری کے کچھ اصول و ضوابط بیان کیے ہیں جن کی روشنی میں افسانہ نگار فکشن کے اجزائے ترکیبی اور دیگر چیزوں سے واقف ہو سکتے ہیں۔

دنیائے افسانہ کا دوسرا حصہ کردار اور افسانے پر محیط ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں انھوں نے اشخاص قصہ پر گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ پلاٹ دار ادب کے اجزائے لاینفک ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رزمیہ ڈرامہ اور افسانے میں اشخاص قصہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور اس میں اشخاص قصہ کی تعداد اور حالت بہ لحاظ ضرورت فن مختلف ہوتی ہے۔ اس حصے میں انھوں نے وقتی اور مستقل اشخاص قصہ، اشخاص قصہ کی اہمیت، اشخاص قصہ کے تعلقات، حقیقت اور تصوریت، تاریخی اشخاص قصہ، منفرد اشخاص قصہ اور نمونے، اشخاص قصہ جو معاشرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ نفسیاتی اشخاص قصہ اور ترقی پذیر اور استادہ اشخاص قصہ کے ذیلی عنوان کے تحت اشخاص قصہ کی اہمیت، معنویت، مسائل اور متعلقات کے حوالے سے بہت اہم گفتگو کی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فکشن میں کس نوع کے اشخاص کا انتخاب کیا جانا چاہیے اور ان اشخاص کے انتخاب سے ہی فکشن کی معنویت روشن ہوتی ہے اور افسانہ نگار کے دائرۂ علم و آگہی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس کی فنی ہنرمندی سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ دراصل یہی اشخاص ہوتے ہیں جن پر ناول کے حسن اور قبح کا مدار ہوتا ہے۔ اور انھی اشخاص کے ذریعے فکشن فنی اور فکری مرحلے طے کرتا ہے۔

دوسرے حصے میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے کردار نگاری کے حوالے سے بہت مبسوط گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ فکشن میں کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں کردار کی ظاہری بناوٹ، لباس، نام اور دیگر متعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کردار نگاری فکشن کا نہایت مشکل جز ہے اور ہر قصہ نگار کردار نگار نہیں بن سکتا۔ وہی شخص کامیاب کردار نگار بن سکتا ہے جسے دولت علم حاصل ہونے کے ساتھ عمیق مشاہدہ اور کافی تجربہ بھی ہو۔ کردار نگاری کے حوالے سے عبدالقادر سروری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے آگہی اگر فکشن نگاروں کو ہو جائے تو ان کے کردار بہت اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں اور ایسے ہی کردار معاشرے میں زندہ رہ جاتے ہیں یا اجتماعی ذہن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اردو فکشن میں ایسے بہت سے کردار ہیں جو آج بھی زندہ جاوید ہیں۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ ان فکشن نگاروں نے ایسے کرداروں پر خاصی محنت کی ہے۔

حصہ سوم میں انھوں نے چند مشہور افسانوں کے کردار کو اپنا موضوع بنایا ہے جس میں 'سحرالبیان' کردار کے نجم النسا کو خاص طور پر منتخب کیا ہے اور اس کردار کے تمام اوصاف اور محاسن کو پیش کیا ہے۔ 'سحرالبیان' میں اصل کردار تو بدر منیر اور بے نظیر ہیں لیکن نجم النسا جیسے ذیلی کردار نے اس میں جو رنگ بھرا ہے وہ واقعتاً قابل داد ہے کیونکہ نجم النسا کے کردار میں جو مثبت صفات ہیں اس کی وجہ سے سحرالبیان میں نجم النسا کا کردار سب سے زیادہ جاذب نظر معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کردار کو ٹنی سن کے شہرہ آفاق قصہ اینک آرڈن کے کردار مریم لین سے مشابہ قرار دیا ہے۔ دونوں کرداروں میں بڑی مماثلت ہے۔ عبدالقادر سروری نے مماثلت کے باوجود مریم لین کے مقابلے میں نجم النسا کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مریم میں مجہولیت ہے جبکہ نجم النسا میں مجہولیت سے زیادہ فاعلیت ہے۔ انھوں نے نجم النسا کی قوت گفتار، ان کی شوخی، ذہانت، عقل مندی، موسیقی دانی، ایثار، ہمدردی اور رفاقت اور نجم النسا کے فلسفیانہ خیالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ہر زاویے سے یہ واضح کیا ہے کہ نجم النسا ایک اہم کردار ہے۔ ان کے بقول نجم النسا کا کردار 'سحرالبیان' کے دوسرے اشخاص قصہ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں، واقعی اور زندہ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نجم النسا کے خیالات اے پی کیورس سے ملتے جلتے ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ Eat Drink and be merry. For tomorrow we may die.

نجم النسا کے ان خیالات کی عکاسی مثنوی 'سحرالبیان' میں ان اشعار کے ذریعے کی گئی ہے:

مئے عیش کا جام اب نوش کر	غم دین و دنیا فراموش کر
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں	گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار	ولے حاصل عمر ہے وصل یار

نجم النسا کی وجہ سے مثنوی 'سحرالبیان' کا رنگ اور نکھر گیا ہے۔ گویا نجم النسا جیسے کردار نے مثنوی 'سحرالبیان' کی معنویت کو اور روشن کر دیا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے مثنوی کے علاوہ مرثیے کے بھی دو کرداروں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور مرثیہ انیس کے عون اور محمد جیسے کردار کی معنویت کو روشن کیا ہے۔ عبدالقادر سروری نے ان دونوں کرداروں کے حوالے سے بڑی اچھی گفتگو کی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے نذیر احمد، اور ان کے قصے کے ایک نسائی کردار کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عبدالقادر سروری کا کہنا ہے کہ حافظ نذیر احمد کی قابلیت ہر چیز سے زیادہ افسانہ نگاری کے لیے موزوں تھی — وہ افسانہ کی ہی وجہ سے زندہ جاوید بن گئے ہیں۔ وہ اردو افسانوں کے پیش رو اور رہنما ہیں اور اپنی ہی طرز کے معاشرتی اردو افسانوں کے موجد ہیں۔ انھوں نے توبۃ النصوح کے کردار پر خاص طور پر گفتگو کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ کردار نگاری میں نذیر احمد کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اردو افسانہ نگاروں میں سے کوئی بھی ان کے عمیق مشاہدے، فطرت انسانی کے وسیع مطالعے اور دلچسپ بیانات تک نہیں پہنچ سکا۔ نذیر احمد کے قصوں کا سب سے زیادہ اہم عنصر ان کی کردار نگاری ہے۔ انھوں نے نذیر احمد کے تخلیقی نسائی کردار نعیمہ پر خاص روشنی ڈالی ہے اور یہ لکھا ہے کہ انھوں نے نعیمہ کی شکل میں ایک ایسا

نفیس کردار پیش کیا ہے جس کی مثال اردو افسانوں میں ملنی محال ہے۔ نعیمہ ایک ضدی عورت ہے، ایک بگڑے خاندان کی فرد ہے مگر اس کے کردار میں استقلال ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عمروعیار کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ داستان کے اہم کردار ہیں۔ انھوں نے عمروعیار کے ان دونوں کرداروں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ لالچ، بزدلی، تتم تراشی، دوراندیشی، رفاقت و ہمدردی عمروعیار کے کردار کے عناصر اربعہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ عاقل اور دوراندیش بھی ہیں۔ یہ دونوں کردار آج بھی لوگوں کے ذہن میں زندہ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام کرداروں سے بہت مختلف ہیں اور یہ سارا کمال داستان نگار کا ہے کہ اس نے ایسے کردار وضع کیے جو ذہنوں میں اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔

عبدالقادر سروری کی یہ کتاب فکشن کے تعلق سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نادر ونایاب کتاب تھی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ذاتی کوششوں سے یہ اشاعت کے مرحلے سے گزری ہے۔ اس کے لیے قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔ عبدالقادر سروری اردو کے معتبر ادیب، نقاد اور محقق تھے۔ ان کی کتابوں میں جدید اردو شاعری، اردو مثنوی کا ارتقا، کشمیر میں اردو، زبان اور علم زبان بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ موخرالذکر کتاب اور بھی قابل قدر ہے کہ اس میں زبان، صوتیات، تشکیلیات اور زبان کے دیگر مسائل کے حوالے سے بہت ہی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب بھی شائع کی جائے تاکہ زبان کے مباحث اور مسائل سے آج کی نسل واقف ہو سکے۔

عبدالقادر سروری مرحوم جامعہ عثمانیہ کے اردو و فارسی کلیہ میں مددگار پروفیسر تھے۔ ان کا تعلق جموں وکشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بھی رہا ہے۔

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری، مرتب: شمس رمزی

صفحات: 129، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: زبیر خان سعیدی، ایف 33، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

زیرتبصرہ تصنیف اصلاح الاصلاح علامہ سحاب سخن ابر احسنی گنوری کے اصول شاعری پر مبنی ان اصلاحات کا مجموعہ ہے جو ایک معرکہ کے نتیجے میں منظرعام پر آئی۔ یہ معرکہ سیماب اکبرآبادی کے ان اعتراضات کے بعد شروع ہوا جو انھوں نے ماہنامہ 'شاعر' میں اصلاح سخن کے نام سے ایک باب قائم کیا تھا جس کے نتیجے میں اسے اصلاح الاصلاح کا نام دیا گیا ہے۔ شمس رمزی کا مقدمہ جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس میں اصلاح سخن جو اردو شاعری کی ایک روایت ہے اس پر اجمالاً اور جامعیت کے ساتھ تاریخی گفتگو کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک امتیاز ہے کہ وہ خالصتاً انھیں کتابوں کو طبع کرتی ہے جس سے اردو ادب کے شائقین کی علمی پیاس بجھائی جا سکتی ہے۔ 129 صفحات پر مشتمل یہ کتاب جہاں دستورالاصلاح اور اصول پر بحث کرتی ہوئی نظر آتی ہے، وہیں اس میں مشاہیر کے تاثرات، اصلاحات پر سیماب صاحب کے اعتراضات اور موازنہ کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کا انتساب بھی غیر روایتی ہے ابر احسنی گنوری اپنی اصلاحات کو ان حضرات سے منسوب کرتے ہیں جن کی قیمتی اصلاحات پر اعتراضات کا مدلل جواب دے کر علامہ اپنی روح کو تسکین دیتے تھے، ساتھ ہی وہ اپنے استاد حاجی علی احسن مارہروی کو بھی نہیں بھولتے ہیں۔

مقدمہ شمس رمزی چونکہ اس تصنیف میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اس لیے مختصراً بتاتا چلوں کہ شمس رمزی نے اپنے اس مقدمے میں اردو تاریخ شعر و ادب پر مدلل بحث کی ہے۔ شاعروں میں ولی سے لے کر عصر حاضر تک صف اول میں شمار کیے جانے کے قابل شعرا کی ایک طویل فہرست بیان کی ہے، غزل جس کے معنوی دائرہ میں ہر دور میں ایک وسعت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی وہ اپنے اس مقدمے میں کرتے نظر آئے ہیں۔ میر کی جمالیات اور غالب کے اسلوب کو بھی موضوع بحث بنایا ہے، لیکن وہ یہ بھی بتانے سے گریز نہیں کرتے کہ اردو شاعری میں اساتذہ سخن کی فہرست نہایت مختصر ہے۔ فنی اعتبار سے اصلاح کو تنقید کے زمرے میں رکھا جاتا ہے اور تنقید میں عیوب و محاسن دونوں موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے۔ جب کوئی مجھ جیسا شاگرد بھی اصلاح کی غرض سے تنقید کرتا ہے تو اس میں بھی خوبیوں اور خامیوں کو ضرور شامل کرتا ہے۔ اردو شاعری میں باقاعدہ اصلاح سخن کی روایت قائم ہے۔ داغ دہلوی نے جسے کمال تک پہنچایا تھا، ابر احسن گنوری نے اصلاح سخن کی روایت میں معرکۃ الآرا کارنامہ انجام دیا ہے انھوں نے اپنے تلامذہ کی اصلاحات کو کتابی شکل میں شائع بھی کیا ہے۔ اصلاح الاصلاح ابر احسنی گنوری کے ادبی معرکہ کی تفصیل ہے جو علامہ اور گنوری کے درمیان کم از کم تین سال تک جاری رہا۔ جیسا کہ ابتدا میں میں نے ذکر بھی کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سحاب سخن علامہ ابر احسنی گنوری سے اساتذہ کی یہ ہتک عزت برداشت نہیں ہوئی اور انھوں نے 1943 سے 1945 تک ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم' رامپور میں سیماب اکبرآبادی کی تنقید کا جواب لکھنا شروع کیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ تمام اساتذہ کی اصلاحات نہ صرف ٹھیک ہیں بلکہ معیاری ہیں۔

دراصل یہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن 1947 میں دہلی سے اور دوسرا 1949 میں مرتضیٰ برقی پریس رامپور سے شائع ہوا لیکن دونوں ایڈیشن ہنگاموں کی نذر ہو گئے۔ 66 سال کے طویل عرصے کے بعد اس کی افادیت کے پیش نظر یہ کتاب اب ہمارے سامنے ہے۔ اس تصنیف میں خاص طور سے دو نظریات سے بحث کی گئی ہے ایک اساتذہ کی اصلاحوں پر علامہ سیماب کی تنقید توجیہات کا جواز اور دوسرا علامہ سیماب اکبرآبادی کی تنقید توجیہات اور اصلاحات پر علامہ ابر احسنی گنوری کا جواب۔ شمس رمزی اپنی ذاتی رائے دیتے ہوئے بحیثیت شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی کو زیادہ اہم تسلیم کرتے ہیں اور بحیثیت استاد علامہ گنوری کو مشاہیر کے تاثرات کے ضمن میں تاج الشعرا ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کا تاثر، امام المتاخرین علامہ حضرت ناطق گلاؤٹھی کا تاثر، ابوالفصاحت علامہ جوش ملسیانی کی رائے، اور علامہ اطہر ہاپوڑی و وحشت کلکتوی کی رائے اہم ہیں۔

علاوہ ازیں اصلاح میں شاعری کے اصول و ضوابط سے ایک سیر حاصل بحث بھی قارئین کو پڑھنے کو ملے گی۔ اصلاحات کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں ان کا تعلق قاری کے مطالعہ اور شوق پر منحصر ہے۔ ایک الگ مضمون کی حیثیت سے آگرہ اسکول اور اس کی حقیقت سے روشناس کرایا گیا ہے، آخر میں اساتذہ کی اصلاحات پر سیماب اکبرآبادی کے اعتراضات کا مکمل جائزہ اور دو موازنے کی تفصیلات بھی دلچسپی کے بطور پیش کی گئی ہیں۔ کتاب کا خاتمہ ایک لائق استاد فن کی حیثیت سے شکریے اور دعاؤں پر کیا گیا ہے۔ اہل علم و ادب کو یہ تصنیف ضرور پسند آئے گی کیونکہ اس میں فرہاد کی کوہ کنی کے مانند عرق ریزی کی گئی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

جہان خیال

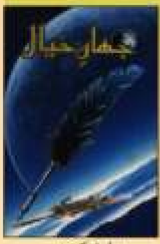

مصنف: غلام نبی خیال
صفحات: 543، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: کشمیر کلچرل کانفرنس، سری نگر
مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری
سینئر اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج ماگام، بڈگام، کشمیر

معروف ادیب اور صحافی غلام نبی خیال کی بتیسویں کتاب 'جہانِ خیال' کے نام سے ستمبر 2017 میں منظر عام پر آگئی ہے۔ 544 صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں شامل مواد کو تین حصوں میں ترتیب دے دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں 'مقالات' کے تحت چھوٹے بڑے تیس مضامین/مقالات شامل کیے گئے ہیں، جن میں بیشتر مضامین/مقالات کا تعلق کشمیر، کشمیریات، ثقافت اور یہاں کی مختلف ادبیات سے ہے، جب کہ 'دنیا کی دس عظیم کتابیں' اور 'یوری پیڈیز.....' جیسے مضامین کا تعلق عالمی ادبیات سے ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اس کتاب کے چند مضامین کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے تقریباً مختلف مقامی، قومی رسالوں اور جرائد کے ذریعے قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ اب اسے کتابی صورت دے کر ایک اہم سرمائے کو محفوظ کیا گیا ہے۔

کشمیر میں ادبیات کے سلسلے میں خیال صاحب نے کشمیری زبان کے نامور قلمکاروں، اس کی مختلف تحریکوں اور رجحانات کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعری پر بھی ایک پُرمغز مضمون رقم کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کشمیر میں اُردو زبان اور ادب کے تئیں بھی انھوں نے 'اُردو صحافت، رُباعی اور محکمہ اطلاعات کی اُردو خدمات' پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ فارسی کی طرح ایک زمانے میں کشمیر سنسکرت علم و ادب کا مرکز رہا، یہاں کتھا سرت ساگر (سوم دیو) راج ترنگنی (کلہن) اور نیل مت پُران جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ بدقسمتی سے ان تمام چیزوں کو آج کل یہاں کے لوگ بھولتے جاتے ہیں، لیکن خیال صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ابھینو گپت، کھیمیندر، کلہن، بلہن، سوم دیو، آنند وردھن جیسے سنسکرت عالموں اور فاضلوں پر ان کی شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے اُردو میں بات کر کے ہماری ایک عظیم ثقافتی وراثت کی بازیافت کی۔

جب ہم کشمیری ثقافت کی بات ایک اسکالر کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں سب سے پہلے ان انگریزوں کی تصانیف کو دیکھنا پڑتا ہے، جنھوں نے وقتاً فوقتاً یہاں آکر انگریزی زبان میں بہت ساری معرکتہ آلارا کتابیں کشمیر پر لکھیں، تو ان باتوں کے پیش نظر خیال صاحب نے سر والٹر لارنس، سی ای ٹنڈیل بسکو جیسے لوگوں پر مضامین رقم کیے۔ اسی طرح کچھ مضامین میں کشمیری تاریخ کو کھنگالا گیا۔ 'بھگوت گیتا کے اُردو تراجم' اور 'کشمیری زبان کی بائبل' بھی دو قابل مطالعہ مضامین 'جہانِ خیال' میں موجود ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کا دوسرا حصہ 'تاثرات' کے عنوان سے 8 مضامین پر مشتمل ہے۔ یہاں ضمناً میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خیال صاحب پر ابھی تک ان کے معاصرین (امین کامل، پروفیسر رحمن راہی، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ وغیرہ) کے مقابلے میں بہت کم لکھا گیا۔ صرف ایک Ph.D ہوئی ہے، جو شائع بھی ہو چکی ہے۔ 'تاثرات' میں خیال صاحب کے فکر و فن پر لکھے گئے روبینہ ناز، رفیق سرہانوی، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، رفیق احمد پانڈے، وحشی سعید کے مقالات و مضامین شامل ہیں، حالانکہ اس حصے کا نام 'فکر و فن' کے آس پاس ہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح کتاب کے آخری حصے میں خیال صاحب کی مختلف کتابوں جیسے کارواں خیال (احمد ندیم قاسمی)، خیال قلم (ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔ سیفی سرونجی) کاشری منار (ڈاکٹر احسان احمد) پراگاش، شبنم کا آتش کدہ (فاروق نازکی) غلام نبی خیال ایک مطالعہ (ڈاکٹر شفق سوپوری) فغان کشمیر (سالک دھامپوری) کشمیر کی وادی (خالد حسن) کے ساتھ ساتھ 'تصانیف خیال' کا ایک اجمالاً خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

'جہانِ خیال' نام کی اس کتاب میں کشمیر کی مجموعی ادبی صورت حال کے ساتھ ساتھ، یہاں کی ثقافت کے مختلف ادوار کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں زیر نظر کتاب سے ہم خیال صاحب کا وژن اور ان کی فکر، ان کی شخصیت کے مختلف گوشے سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ صحافی ہونے کے ناطے ادب کے ساتھ ساتھ، وہ یہاں کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، اس حوالے سے جہاں وہ کشمیر کی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں، تو مختلف ادوار کی خونچکاں داستان ہمیں ان کے جذبات کے ساتھ اس کتاب میں ملتی ہے، لیکن ساتھ ہی جب وہ 'کشمیر میں تہذیبی ہم آہنگی کے مظاہر' جیسے مضامین پر قلم اُٹھاتے ہیں، تو یہ بات بھی بے ساختہ نکل ہی جاتی ہے:

''دور بڈشاہی میں اس تہذیبی رواداری کی جو بنیادیں اُستوار ہوئی تھیں، آج سرزمین کشمیر میں اُن پر ایک ایسی عمارت تعمیر ہوئی ہے، جس کے دریچوں سے بیک وقت ناقوس واذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ یہاں کوہ ماران کے دامن میں جہاں سلطان العارفین حضرت مخدوم صاحبؒ کی زیارت مرجع خاص وعام ہے، وہاں اسی پہاڑی کے شمالی سرے پر شنکر ایشور مندر عقیدت مندوں کو صبح و شام سکون قلب اور روحانی طمانیت عطا کرتا ہے۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی خانقاہ اور مہا کالی کا مندر ایک ہی جگہ پر واقع ہیں۔ جہاں صدیوں سے مسلمان اور ہندو دونوں اس زیارت اور استھاپن پر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ دیوسر میں ترپر سندری دیوی کے استھاپن پر مسلمان بھی آتے ہیں۔ کھیر بھوانی کی متبرک جگہ پر پوجا کے لیے پھول، دودھ اور میوے فروخت کرنے کا کاروبار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی طرح شری امرناتھ جی کی مقدس گپھا پر، جب ساون کی پورن ماشی کو میلہ لگتا ہے، تو نذرانے کا ایک حصہ حال ہی تک بوٹہ کوٹ کے ملک گھرانے کو بھی جاتا تھا۔'' (ص 67)

الغرض موجودہ ملکی یا ریاستی سیاست ہمیں کیا کچھ کہے، انسانیت، اخوت، آپسی بھائی چارے کی یہ عظیم روایتیں ہماری نس نس میں موجود ہیں۔ اور ان کو فروغ دینا ہر کسی جینون قلم کار کا فرض اولین ہے، جس کی اہم مثال ہمارے پاس خیال صاحب اور ان کا فکر و فن ہے۔

گستاخی معاف

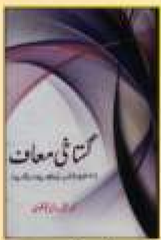

مصنف: محمد بشیر مالیرکوٹلوی
صفحات: 296، قیمت: 181 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: معین الدین عثمانی، 264، شاہو نگر، جلگاؤں 425001

'گستاخی معاف' معروف افسانہ نگار جناب محمد بشیر مالیرکوٹلوی کے گیارہ تجزیاتی مضامین کا چونکا دینے والا مجموعہ ہے، جو پوری آب و تاب کے ساتھ حال میں منظر عام پر آیا ہے۔ مذکورہ مجموعہ چونکا دینے والا اس لحاظ سے قرار دیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کے ان گیارہ شاہکار افسانوں کو جن کو دنیائے ادب نے مہر تصدیق کے ساتھ تسلیم کر لیا تھا کئی تکنیکی خامیوں کے ساتھ اجاگر کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اسے گستاخی پر اس لیے بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ بزرگوں کی غلطی پر گرفت کرنا ہی غلطی ہے۔ اس کے باوجود بھی موصوف نے بت شکنی کی جو جرأت رندانہ کی ہے ادبی دنیا میں ایک انوکھے تجربے کے طور پر درج کی جائے گی مگر ایک المیہ یہاں یہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر تکنیکی خامیاں مرحوم فنکاروں کے شہ پاروں سے متعلق ہونے کے سبب ان میں ترمیم کی گنجائش کے امکانات نہیں ہو سکتے۔ ان کی حیثیت پر کلام کرنا علمی ادبی گفتگو اور تحریر کا حصہ تو ہوسکتا ہے مگر اسے قبولیت کا درجہ ادب کا

سنجیدہ حلقہ میرے خیال سے شاید نہیں دے سکتا۔ ان گیارہ تجزیاتی مضامین میں چھ مضامین اکیلے سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر ہیں جبکہ پانچ فنکاروں پر محض ایک ایک مضمون شامل ہے۔ حیرت یہ بھی ہوتی ہے کہ پانچ مرحومین کے ساتھ ایک باحیات فنکار کی تحریر بھی شامل کرلی گئی ہے جس سے انتخاب میں توازن کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے مشمولہ چھ افسانوں میں 'بو' اور 'ٹھنڈا گوشت' مقدمے کے سبب مقبول ہوئے تھے جبکہ موذیل، پھوجا حرام دا......، بابو گوپی ناتھ اور شہید ساز نے بھی اپنا لوہا منوالیا تھا۔ منٹو کے معاصرین میں عصمت چغتائی کا لحاف بھی مقدمے کے سبب شہرت کے بام عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا بین اور راجندر سنگھ بیدی کا لاجونتی فنی بلندی کی وجہ سے قارئین کے دلوں میں گھر کر گئے تھے۔ کرشن چندر کا 'مہالکشمی کا پل' ترقی پسندی تحریک کی بیساکھی کے سہارے اوپر اٹھ گیا تھا مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مذکورہ فنکاروں کے دور کا افسانہ ترقی پسندی کے زوال اور جدیدیت کے آغاز کے زمانے کا افسانہ تھا جس پر پریم چند کی حقیقت پسندی کے اثرات نمایاں تھے۔ روحانیت کے دور کی طرح اس میں مافوق الفطرت واقعات نامی جدیدیت کی طرح فرد کی شکست وریخت کا بیانیہ تھا۔ جدیدیت کے تجربات نے افسانے کو چیستاں بنادیا تھا مگر اسے کئی طرح کے اوصاف سے متصف بھی کیا تھا جس کے سبب افسانہ ایک نئے رنگ و روپ میں قاری سے ہم کلام تھا۔ اگر ہم اس آہنگ کے تناظر میں اس دور کے افسانوں کا جائزہ لیں گے تو مایوسی ہوگی۔

سعادت حسن منٹو کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ افسانہ اس کی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ عجلت میں لکھی تحریر میں زیادہ آرائش کی گنجائش نہیں رہتی نیز کسر رہ جانے کے امکانات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ افسانہ بیان کرتے کرتے وہ ترقی پسندی کا منشور بیان کرنے لگ جاتے تھے۔ البتہ عصمت چغتائی اور بطور خاص احمد ندیم قاسمی شعوری طور پر زبان و بیان کی لذت کے ساتھ کہانی بیان کرتے تھے۔ ان کی بشری خامی اور خوبیوں کے ساتھ وہ اپنے دور کے معتبر قلم کار تھے جن کی کھینچی ہوئی لکیر پر آج کا افسانہ نگار اپنے سفر کو آگے بڑھا رہا ہے۔

محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے اپنے تجزیات کے توسط سے منٹو کا ٹھنڈا گوشت کے متعلق اس کے کردار ایشر سنگھ کی شہ رگ کے کٹنے کے معاملے پر تو موذیل اور شہید سازی میں در آئی جنسی باتوں پر خامہ فرسائی کی ہیں۔ اسی طرح بیدی کا لاجونتی میں اغوا کے سلسلے میں سوال قائم کیا ہے تو احمد ندیم قاسمی کا بین میں ماں باپ کا لڑکی کو اکیلے محاوروں کے حوالے کرنے کی بات ان کی سمجھ سے بعید ہے۔ اگر وہ چاہتے تو قاضی عبدالستار کے پیتل کا گھنٹہ پر بھی سوال کرسکتے تھے کہ افسانے کا راوی محو سفر ہے اچانک اس کی بس موسل دیہات کے قریب خراب ہوجاتی ہے۔ وہ قاضی انعام حسین کے گھر چلا جاتا ہے مگر پورے افسانے کی خواہندگی سے کہیں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ راوی کہاں سے کہاں جارہا تھا۔"

ویسے بھی یہ بات خاطرنشان رہنی چاہیے کہ افسانے کی عبارت حقیقت اور تخیل کی آمیزش کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے۔ مشاق فنکار کم سے کم جزئیات نگاری میں بہت کچھ کہنے کے ہنر سے کام لیتا ہے۔ اور کامیاب افسانہ وہی کہلاتا ہے جس میں قاری کی سوچ اور فکر کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ قاری پر پابندی عائد کرنا ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ کچھ تفصیلات اشاروں کنایوں میں بیان ہوجاتی ہے۔ دوسری بات جو اس تجزیاتی کتاب کے تعلق سے بیان کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی زبان تنقیدی زبان ہرگز نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ مصنف کسی سے محو گفتگو ہے۔ تنقید کے انداز میں جو حاکمانہ پن ہوتا ہے مطالعے کے دوران اس کی کا بار بار احساس ہوتا ہے۔

آخر میں بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے اس تجزیاتی مطالعے کے توسط سے بعض اہم اور یادگار افسانوں کی بازخوانی کا قارئین کو موقع عنایت کرکے کلاسیکی ادب کی اہمیت کو واضح کیا ہے جس کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔

بہار میں ترقی پسند اردو افسانہ

مصنف: ڈاکٹر نزہت پروین

صفحات: 208، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: نوشاد منظر، S-3/6، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک اہم تحریک ہے، جس نے تمام اصناف ادب کو متاثر کیا۔ اس تحریک نے ادب کے دائرے کو وسیع کیا اور زندگی کے مسائل کو ادب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کے افادی پہلوؤں پر زور دیا۔ اس نے ادب اور زندگی کے درمیان گہرا رشتہ قائم کیا۔ ادب کا رشتہ کسی نہ کسی طور پر زندگی سے ہوتا ہی ہے، لیکن ترقی پسند تحریک نے ایک منشور کے تحت ادب کو زندگی اور سماج کا ترجمان بنانے کی وکالت کی اور ساتھ ہی ادب میں زندگی کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر زور دیا۔ مگر باضابطہ ایک تحریک کی شکل میں ادب کا رشتہ زندگی سے قائم کرنے کی کوشش ترقی پسند تحریک نے کی۔

زیر تبصرہ کتاب 'بہار میں ترقی پسند اردو افسانہ' ڈاکٹر نزہت پروین کی کتاب میں انھوں نے بہار سے تعلق رکھنے والے ان افسانہ نگاروں کے فن پر گفتگو کی ہے جو نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے اردو میں ترقی پسند تحریک کی روایت پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اردو افسانے پر ترقی پسندی کے اثرات کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر نزہت پروین نے 'اردو میں ترقی پسند تحریک'، 'ترقی پسند اردو افسانہ' اور 'بہار میں ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ' کے عنوانات کے تحت ترقی پسند تحریک اور اردو افسانے کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا اردو ادب پر جو اثر پڑا اس سے ہر کوئی واقف ہے، ڈاکٹر نزہت پروین کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو ادب نے زبان کے شعری و نثری پیرایوں کے نئے نئے گوشے تلاش کیے اور ایسے خطوں اور منطقوں میں پہنچے جہاں اس سے قبل ادیبوں کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ ترقی پسند نظریات کی عصری معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ ترقی پسندی ذہنی سطح پر آج ملک میں پہلے سے زیادہ ہے مگر وہ اتنی منظم نہیں جتنی کہ اس زمانے میں ہونی چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ رجعت پسندی سے مقابلہ کے لیے ترقی پسندی کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر نزہت پروین نے ترقی پسند اردو افسانے پر بھی گفتگو کی ہے۔ وقار عظیم نے ترقی پسند افسانے کے متعلق لکھا تھا کہ ترقی پسند تحریک سے قبل اردو افسانے میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی نہیں ملتی، ان کا اشارہ 'انگارے' کی جانب تھا، ڈاکٹر نزہت پروین کا خیال ہے کہ انگارے کے افسانہ نگاروں نے اپنے قارئین کو ناقابل برداشت دھچکے دیے، ان کا خیال ہے کہ اس مجموعہ افسانہ نے اردو میں نفسیاتی فن کے لیے راہ ہموار کی۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'بہار کے ترقی پسند افسانہ نگار' ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے اختر اورینوی سے لے کر شبیر حسن تک کے افسانوں پر گفتگو کی ہے۔ مصنفہ نے اختر اورینوی ان افسانوں پر بھی گفتگو کی ہے جس میں علامتیں موجود ہیں، اس ضمن میں 'ایک درخت کا قتل' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ افسانے میں موجود درخت انسانیت کی علامت ہے اور اس کا کاٹنا ظلم کی کہانی بیان کرتا ہے۔ مذکورہ افسانے کے اختتام پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ جس طرح پیڑ تو کاٹا جاسکتا ہے مگر اس کی جڑوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا، ٹھیک اسی طرح انسانوں کو قتل تو کیا جاسکتا ہے مگر انسانیت کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ مذکورہ کتاب میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ بہار میں جن افسانہ نگاروں نے بہار میں ترقی پسند تحریک کو نیا خون دیا اور اسے بلندیوں تک پہنچایا اس میں سرفہرست سہیل عظیم آبادی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کی روایت کو مستحکم کیا اور اسے مزید ترقی عطا

کی۔ مصنف نے ان کے مشہور افسانہ'الاؤ' کا ذکر کیا ہے۔اس افسانے میں دیہی زندگی اور اس کے نشیب وفراز کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نزہت پروین کا خیال ہے کہ سہیل عظیم آبادی کا یہ افسانہ ترقی پسند فکر کا نمائندہ افسانہ ہے۔ مصنف نے شکیلہ اختر کو بھی اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا ہے۔ شکیلہ اختر کا شمار خواتین افسانہ نگاروں میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے، ان کے افسانہ'ڈائن' کو خاص مقبولیت ملی۔ اس افسانے میں انھوں نے ایک دلت عورت کی کہانی کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک غریب عورت کو اس کے ہی پیسے نہ دینے کی یہ تجویز نکالی جاتی ہے کہ کسی طرح اس کو ڈائن ثابت کیا جائے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر نزہت پروین نے بدیع مشہدی، انور عظیم ،کلام حیدری، احمد یوسف ،غیاث احمد گدی، وہاب اشرفی، زکی انور، ش۔ اختر، ذکیہ مشہدی، شفیع مشہدی، منظر کاظمی، شوکت حیات، احمد صغیر اور شبیر حسن پر گفتگو کی ہے۔ ذکیہ مشہدی عصر حاضر کی اہم افسانہ نگار ہیں۔ان کے چند افسانوں میں ترقی پسند فکر نظر آتی ہے۔ان افسانوں میں دلت کی زندگی، عورتوں کے مسائل اور مجموعی طور پر پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی اور ان کے احساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'مچھندر کی واپسی' ان کا افسانہ جنگ آزادی سے شروع ہو کر نکسلی تحریک پر ختم ہوتا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ذکیہ مشہدی نے ذات پات، اونچ نیچ، امیری غریبی اور نکسلی تحریک کو خوبصورتی کے ساتھ افسانے میں پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر 'بہار میں ترقی پسند اردو افسانہ' ایک اچھی کتاب ہے۔ اختصار کے باوجود کتاب کی اپنی انفرادیت ہے۔ بہار سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام ہی ترقی پسند افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت دیدہ زیب اور قیمت مناسب ہے۔

ادبی مضامین

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر علی عباس

صفحات: 178، قیمت: 200 روپے

زیر اہتمام: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ثمرین (ریسرچ اسکالر) شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر علی عباس کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جس کو موصوف نے الگ الگ زمروں میں تقسیم کیا ہے جن کے عنوانات اس طرح ہیں: فکشن، سفرنامے، یادداشتیں، شخصیتیں اور 5 تجزیات وتبصرات۔ اس طرح یہ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے جن کے ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔

فکشن کے عنوان کے تحت دو مضامین ہیں، جس میں انتظار حسین کا ' آخری آدمی' اور انیس اشفاق کا ناولٹ 'دکھیارے' پر کامل گفتگو کی گئی ہے۔ دونوں موضوعات پر جامع بحث ملتی ہے۔ انتظار حسین جو حال ہی میں اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں ان کے شاہکار افسانے' آخری آدمی' اور اس کے متعلق حادثات و واقعات کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ معروف ناقد وشاعر انیس اشفاق کے ناولٹ پر خاطر خواہ بحث ہے۔ جس طرح انتظار حسین کے مذکورہ افسانے اور دیگر تحریروں میں تہذیب واخلاقیات کا زوال نظر آتا ہے اور اس کا اظہار علامتی انداز میں سامنے کیا گیا ہے اسی طرح علی عباس کے مطابق انیس اشفاق کے یہاں بھی تہذیب کا زوال اور اخلاقیات کی پسماندگی نظر آتی ہے۔ اخلاقیات کا درس و پاس ادب کے قاری اور مصنفین کے لیے ضروری ہے ورنہ انسان کے گمراہ ہونے کا خوف ہے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں افسانہ وناولٹ تہذیب کی پاسداری کا خیال کرتے ہوئے اور اخلاقیات کو تادیر قائم رکھنے کے لیے قلمبند کیے گئے ہیں، جو بے حد عمدہ و نادر ہیں۔ ڈاکٹر علی عباس نے انتخاب بھی بہت اچھا کیا ہے اور تجزیہ بھی بخوبی کیا گیا ہے۔

دوسرے عنوانات کے تحت سفرنامے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سفرنامہ اور سفرنامہ نگار کے لیے ممدومعاون اجزا سے روشناس کراتے ہوئے یوسف حسین خاں کمبل پوش کا سفرنامہ عجائبات فرنگ جسے پہلا سفرنامہ ہونے کا شرف حاصل ہے، پر طویل گفتگو ہے اور مختلف چیزوں کو سمجھانے کی غرض سے اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے جو قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرا سفرنامہ ممتاز مفتی کا 'لبیک' ہے، جس کا مطالعہ توجہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور محنت کا رنگ مضمون میں صاف جھلکتا ہے۔

'لکھنؤ کی پانچ راتیں اور علی سردار جعفری' میں ڈاکٹر علی عباس نے علی سردار جعفری کو ترقی پسندوں کی صف میں کھڑا کیا ہے اور آگے لکھتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو ترقی پسندوں کے دائرے سے باہر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سردار جعفری کی تحریر ہی تو ترقی پسندی کی صفات میں سے ہے۔ 'یادداشتیں' کے عنوان کے تحت دوسرا ذیلی عنوان' آواز دوست' ہے۔' آواز دوست' مختلف طویل مضامین اور خاکوں پر مشتمل تصنیف ہے۔ مذکورہ تصنیف کو مکمل مداحی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر علی عباس نے مختار مسعود کو اپنا ممدوح بنا لیا ہے اور بے جا تعریف وتوصیف کے علاوہ اس مضمون میں مفید معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔

شخصیات کے زمرے میں ڈاکٹر علی عباس نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی شخصیت کو اس کے لیے وقف کیا ہے اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی مکمل شخصیت کی عکاسی کی گئی ہے جو بہت اہم ہے اور محققین کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ تجزیات وتبصرات کے ذیل میں آٹھ مختلف ادبا کی تحریر پر تجزیہ وتبصرہ ملتا ہے۔ جس میں عرفان صدیقی کے کلام 'ہوائے دشت ماریہ'، عابد سہیل کی 'حرف کائنات'، احتشام حسین کی 'لن ترانیاں'، عالم نقوی کی 'اذان'، ماہنامہ اشارہ کا نوحہ نمبر، عارف نجمی کی تحقیقی بصیرت، 'دنیائے اسلام کا عروج وزوال' اور 'ادبی کارواں' پر مقالات وتبصرات شامل ہیں، جن کا تجزیہ ڈاکٹر علی عباس نے بخوبی کیا ہے۔

ڈاکٹر علی عباس کی مرتب کردہ یہ کتاب اہل ادب وذوق میں مقبول ہوگی اور طلبا کے لیے یہ تصنیف معاون ثابت ہوگی۔ مجھے یہ توقع ہے کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ پروف کی اغلاط کو اگلے ایڈیشن میں ضرور درست کیا جائے۔ سرورق بھی بہتر ہے۔

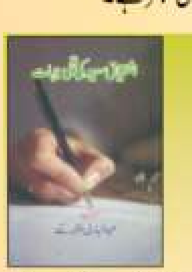

اشتیاق سعید کی فنی جہات

مرتب: عبدالباری ایم۔ کے

صفحات: 216، قیمت: 250 روپے،

ناشر: نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی

مبصر: تسنیم بانو، جی۔10 ملکہ گنج، دہلی

ادب میں افسانہ کی صنف بہت ہی مقبول رہی ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس صنف نے بہت ہی قلیل وقت میں ایسے افسانہ نگاروں کو جنم دیا ہے کہ جن کی تخلیقات کو ہم دنیا کی کسی بھی تخلیق کے سامنے فخر وافتخار کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی متعدد افسانہ نگار ایسے ہیں جو اس صنف میں اپنے رنگ وروغن بکھیر رہے ہیں انھیں میں سے ایک اہم اور معتبر شخصیت اشتیاق سعید کی بھی ہے یوں تو وہ ایک ڈرامہ نگار، صحافی اور فلمی اسکرپٹ رائٹر بھی ہیں لیکن ان کے مزاج اور قلم کا محور افسانہ نگاری ہی رہا ہے اور انھوں نے اس صنف میں مختلف گل بوٹے بھی کھلائے ہیں۔

اشتیاق سعید کی صنف افسانہ میں ان کی عطا کے اعتراف کے طور پر عبدالباری ایم کے نے اشتیاق سعید کی فنی جہات کے عنوان سے ایسا گلدستہ ترتیب دیا ہے کہ جس کے ذریعے اشتیاق سعید کی افسانہ نگاری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف 'اشتیاق سعید کی فنی جہات' مضامین کا مجموعہ ہے اس کو عبدالباری ایم۔ کے نے مرتب کیا ہے۔ اس میں کل 17 مضامین، 5 تجزیے اور چار اہم افسانے شامل ہیں اس میں سب سے زیادہ تجزیہ افسانہ 'غائب حاضر' پر ہے۔ عبدالباری کے مقدمے کے ذریعے اشتیاق سعید کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل

ہوتی ہے جس میں سعید کی سوانحی، فلمی اور ادبی خدمات کا ذکر ہے۔

زیرتبصرہ کتاب میں مقدر حمید، نورالحسنین، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر عشرت بیتاب، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، نسل عارفی، عبرت مچھلی شہری معراج احمد معراج، سلیم انصاری کے مضامین اشتیاق سعید کے فن افسانہ نگاری سے متعلق ہیں جن میں اشتیاق سعید کی افسانہ نگاری سے متعلق خامہ فرسائی اسی انداز میں کی گئی ہے کہ اشتیاق سعید کے فن کی متعدد جہتیں سامنے آتی ہیں جبکہ ڈاکٹر خورشید نعمانی نے اشتیاق سعید کے مشہور زمانہ ڈرامہ انقلاب مردہ باد پر خامہ فرسائی کی ہے، جس میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اشتیاق سعید کے خواہ افسانے ہوں یا ڈرامے وہ سیاسی اور سماجی موضوعات کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ ان کا اصل موضوع عام آدمی اور ان کے مسائل ہیں۔ اشتیاق سعید کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے تفصیلی بحث کی جائے تاکہ ان کے فن کی نئی جہتوں سے قاری کماحقہ روشناس ہو۔ ڈرامے کے حوالے سے رفیق جعفر کا مضمون بھی قابل قدر ہے۔

'اشتیاق سعید کے افسانے اور تجزیے' کے عنوان کے تحت پانچ مضامین ہیں جن میں رؤف صادق اور جاوید ندیم کا افسانہ 'مل جوتا' کے حوالے سے ہے دونوں مضامین ہمیں اشتیاق سعید کی فن افسانہ نگاری پر قدرت تامہ کا قائل کراتے نظر آتے ہیں۔ ایس ایم عباس نے 'ریوڑ' ایک مطالعہ کے عنوان سے بہت ہی خوبصورت انداز میں اشتیاق سعید کا فنی محاکمہ کیا ہے۔ اور ڈاکٹر عظیم راہی نے 'تجزیہ بعید از قیاس' نیز عبدالباری ایم کے 'تجزیہ حاضر غائب' کے عنوان سے اہم مقالہ لکھا ہے آخرالذکر مضمون میں مضمون نگار نے ''افسانہ حاضر غائب کو اپنی نوعیت کا واحد افسانہ بتایا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ اشتیاق کا یہ افسانہ افسانوی ادب میں اضافہ کا موجب ہے۔''

اس کتاب میں عبدالباری ایم کے نے مقدمہ میں اشتیاق سعید کی جامع الجہات شخصیت کا تعارف مدلل انداز میں کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ وہ نہ صرف معتبر افسانہ نگار، کامیاب ڈرامہ نگار، معتبر صحافی تھے بلکہ وہ بے مثل فلمی اسکرپٹ رائٹر بھی تھے لہٰذا ان کے فن کا اعتراف کھلے دل سے کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے ناقدین ادب سے مودبانہ گذارش بھی کی ہے کہ علاقائی عصبیت کی عینک اتار کر 'حق بہ حقدار رسید' کے ضابطے پر کام کریں۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب اشتیاق سعید کے مختلف فنی جہات کا احاطہ ہی نہیں کرتی بلکہ انھوں نے اپنی فکری بصیرت کے ذریعے جو نقوش راہ بنائے تھے ان سے بخوبی متعارف کراتی ہے سب نے جس خلوص، محنت اور لگن سے ادبی دنیا کو اشتیاق سعید کے فنی جہات سے روشناس کرایا ہے اس کے لیے انھیں مبارک باد دینا چاہیے۔ یہ کتاب تزئین و ترتیب اور طباعت کے اعتبار سے بھی بہتر ہے ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی فعل نقائص سے یکسر پاک نہیں ہو سکتا چنانچہ بعض جگہوں پر کتابت کی غلطیاں وغیرہ راہ پا گئی ہیں، جنھیں نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کتاب اشتیاق سعید کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

فکشن

خوشبوؤں کا جال

مصنف: عشرت ظہیر
صفحات: 144، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد آصف، شعبۂ اردو، گوتم بودھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا

زیر نظر عشرت ظہیر کا افسانوی مجموعہ 'خوشبوؤں کا جال' بیس افسانوں پر محیط ہے، جن میں حیات و ممات کی ان سلجھی کیفیات کی دھنک زیر و بم کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے منطق اور فلسفے کی علمی آنچ سے اپنے کرداروں کی باطنی شخصیت کو واشگاف کیا، جو قاری کے ذہن کو بوجھل نہیں کرتے بلکہ قاری کرداروں کے ہمراہ ہو لیتا ہے۔ اس کو اپنا ہمزاد سمجھ کر ذہنی ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں ناسٹلجیائی فکر کا احساس ہوتا ہے جو آج کے انسان کو مٹی اور ماں سے علاحدہ کیے ہوئے ہے، جس کی یاد اسے کرب عظیم میں مبتلا کرتی رہتی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بارکہ مٹی پر پڑنے والی پہلی بوند کی سوندھی خوشبو سے آج کا مشینی انسان محروم ہے اپنے نصف وجود کی مخروطی حنائی انگلیوں کا لمس اس کی باطنی دنیا میں ہل چل پیدا کیے رہتا ہے۔ پردیس میں بود و باش اختیار کرنے والا شخص اس طرح کی اندوہناک کیفیت سے ہر دن گزرتا ہے اور شمع کے مانند اپنی ساری انرجی ختم کر دیتا ہے۔ عشرت ظہیر کا افسانہ 'تمھیں جان کر خوشی ہوگی' موجودہ عہد کے علاقائی اور نسلی تعصب و امتیاز کے غرور و سرور کی عکاسی کرتا ہے۔ قومیت اور وطن پرستی آج پوری دنیا میں شدت کی شکل اختیار کر چکی ہے اپنی قومی اور تہذیبی شناخت کو بہتر ثابت کرنے کی ناکام مگر مسلسل کی جاری کوشش کے نتیجے میں آج پوری انسانیت تصادم و ٹکراؤ سے جوجھ رہی ہے، جس کی وجہ سے عصر حاضر بارود کا ڈھیر بن چکا ہے جسے بھسم کرنے کے لیے محض ایک چنگاری کی ضرورت ہے۔ اپنے کو نام نہاد مہذب دنیا کا باسی کہنے والے دانش ور جس طرح باقی دنیا پر گلوبلائزیشن کے نام پر کلچرل یکسانیت کو تھوپ رہے ہیں اور اپنی تہذیبی عریانیت کے ذریعے تیسری دنیا کے نوجوانوں کو ذہنی عیاشی کے ذریعے فکری سطح پر مفلوج بنانے کی سعی کی جا رہی ہے جو کہ مستقبل میں انسانیت کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔

افسانہ 'وائرس' مغرب کے اسلاموفوبیا کے خوف سے پیدا شدہ تشکیک کا بیانیہ ہے۔ افسانہ 'بگولہ' انسانوں کی بھیڑ میں تنہا آدمی کا المیاتی بیانیہ ہے۔ افسانہ 'قلب ماہیت' ایک خوف زدہ اور آسیب زدہ انسان کا المیہ ہے۔ یہ ڈرا سہما تشکیک زدہ انسان کسی کھوئی ہوئی شے کی جستجو میں ہے جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس سے کھو گئی ہے۔ اس کی دماغ سوزی کی ماہرین نفسیات نے تحلیل نفسی کے ذریعے مرض کی کھوج کرنی چاہی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ دنیا کی نظروں میں پاگل قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ تب اسے پتا چلا کہ نجات کے لیے اپنے اندر کے دکھ کو تلاشنا ہوگا جو میرے اندر ہے اور اپنے اندر ڈوب کر ہی زندگی کا سراغ مل سکتا ہے۔ وہ چنتن منن کرنے کے لیے اجنبی راستوں پر بھٹکتا رہا۔ اور راہ نجات تلاش کرتا رہا۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے گوتم بودھ کے فلسفہ نروان کو پیش کیا ہے اور اس بات پر زور دینے کی کوشش کی ہے کہ دکھ کی کھوج ہی سکھی جیون کا علاج ہے۔ اور اپنے من میں ڈوب کر زندگی کرنے کا سراغ پایا جا سکتا ہے۔

عشرت ظہیر کے افسانوی مجموعے 'خوشبوؤں کا جال' میں لفظ 'بند مٹھی' قاری کو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جو مجموعے کے تقریباً تمام افسانوں میں آیا ہے، جس کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مصنف نے افسانے 'خوشبوؤں کے جال' میں لکھا ہے۔ 'ان مٹھیوں میں خوشبوئیں ہیں'۔ 'خوشبوؤں کا تو کوئی انت ہوگا'۔ 'نہیں۔ خوشبوؤں کا کوئی انت نہیں ہوتا'۔ حسین الحق نے بند مٹھی کو ایک اصطلاح بتایا اور کہا کہ ''یہ شاید اس مٹھی کی طرف اشارہ ہے جو ریت کو قید کرنا چاہتی ہے'' دراں حالانکہ یہ بند مٹھی ہندستان کی تکثیریت میں وحدت کی علامت ہے آج یہ اتحاد انتشار میں تبدیل ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار کی یہ کوشش ہے کی کثرت میں وحدت کا تصور پھر سے بحال ہو۔ افسانہ نگار نے اس مجموعے میں ہندستانی دیومالائی عناصر، ناسٹلجیا اور بودھی فلسفہ حیات کے موضوع کو عمدگی سے برتا ہے۔ تخلیقی طرز انداز کافی منجھا ہوا ہے۔ الفاظ اور تراکیب کے برتنے میں مہارت حاصل ہے زبان روزمرہ اور عام فہم ہے۔

شاعری

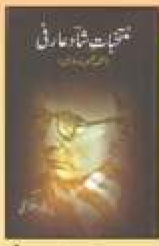

منتخبات شاد عارفی

مرتب: پروفیسر مظفر حنفی
صفحات: 336، قیمت: 350 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: سمیہ محمدی، 569/7، ذاکر نگر، نئی دہلی۔ 25

زیر تبصرہ کتاب 'منتخبات شاد عارفی (منتخب نظمیں اور غزلیں)' معروف شاعر شاد عارفی کے کلام کا ایک خوبصورت انتخاب ہے۔

'منتخبات شاد عارفی (منتخب نظمیں اور غزلیں)' کتاب میں شاد عارفی کی 52 نظموں کے ساتھ 128 غزلوں کے علاوہ دو نعتیہ کلام شامل ہیں۔ مظفر حنفی نے اس انتخاب کا آغاز شاد عارفی کے نعتیہ کلام سے کیا ہے۔ اس نظم کا عنوان 'سلام بحضور سلطان مدینہ' ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

السلام علیک یا شمس الضحیٰ　　السلام علیک یا بدر الدجیٰ
السلام علیک یا نور الہدیٰ　　السلام علیک یا فخر الامیں
السلام علیک ختم المرسلیں

شاد عارفی نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں جو سلام پیش کیا ہے، اس میں لفظوں کا نہایت خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ اس سلام کو پڑھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاد عارفی کس درجہ حضور اکرم ﷺ سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔

شاد عارفی کی ایک نظم 'دیوالی' ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال ہندو مذہب کا خاص تہوار دیوالی ہے۔ شاد عارفی نے دیوالی کے پورے واقعے کو اپنی نظم میں پیش کرنے کے ساتھ اس کا رشتہ جلوۂ طور سے جوڑا ہے:

آنکھ ملنا تھی کہ نظارہ پلٹ کر رہ گیا
طور کا جلوہ چراغوں میں سمٹ کر رہ گیا

شاد عارفی کی ایک نظم 'دیہاتی لاری' ہے۔ اس نظم میں ہندو مسلم کے نام پر ہونے والی لڑائی پر طنز کیا گیا ہے کہ کس طرح برسوں سے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے لیے جان دینے والے لوگ سیاست کا حصہ بن جاتے ہیں اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر اس نظم کو ہندو مسلم بھائی چارے کی اہمیت کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شاد عارفی کی ایک نظم 'جہیز' ہے۔ جہیز مہذب سماج پر ایسا بدنما داغ ہے جس نے سماج کی شکل ہی بگاڑ دی ہے۔ جہیز کی مضرات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہر سال سیکڑوں لڑکیاں جہیز کے لالچی لوگوں کا شکار ہو جاتی ہیں، یا تو وہ خود موت کو گلے لگا لیتی ہیں یا پھر سسرال والوں کے عتاب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ شاد عارفی نے بھی جہیز کو ایک لعنت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ کریں:

عروس کے ہاں سوال عزت بڑا کٹھن ہے، بہت اہم ہے
دلہن کے ڈولے کے آگے آگے جہیز جتنا بھی ہو وہ کم ہے
چنانچہ یہ آٹھ چائے کے سیٹ ہیں، چار قہوے کے، دو ڈنر کے
یہ دن میں میلے سے ملگجے سے ضرور برتے ہوئے ہیں گھر کے

شاد عارفی نے اپنی نظم میں یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ کس طرح جہیز کے لیے لڑکی والوں سے الگ الگ فرمائشیں کی جاتی ہیں اور ان کی فرمائش پوری نہ ہونے پر دلہن اور اس کے گھر والوں کو پریشان کرتے ہیں۔ ایک نظم 'مشورہ' ہے جس میں مرکزی کردار ایک لڑکی ہے جو سماجی بندھنوں میں قید کر دی گئی ہے، وہ اس قید سے نکلنا چاہتی ہے مگر بغاوت کرنے کی طاقت اس میں موجود نہیں ہے۔ بالآخر وہ اس بندش کا شکار ہو کر بیمار ہو جاتی ہے۔ شاد عارفی کی نظموں میں انسانی رشتوں، مختلف موسموں، تاریخی عمارتوں، سماجی مسائل اور عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ چند نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ دسہرا، بہتان، بھکارن، مہترانی، ساس، سالی، ملازمہ، مرید کی بیوی، پرانا قلعہ، بسنت، مگر عورت کا دل کتنا اور رسمی قید خانے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کا دوسرا حصہ غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شاد عارفی نے انفرادی اور اجتماعی دونوں مسائل کو اپنی شاعری کا محور و مرکز بنایا ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات روایتی بھی ہیں اور کئی معنوں میں جدید بھی۔ جہاں وہ اجتماعی زندگی کے واقعات کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں وہیں انفرادی جذبات کا اظہار بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

معاصر سیاسی صورت حال پر انھوں نے جس انداز میں طنز کیا ہے اس کی معنویت ہنوز قائم ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر انھوں نے موجودہ سیاسی نظام کے پس منظر میں کہا ہو:

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج　　کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج
یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے　　کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

مجموعی طور پر یہ ایک بہترین انتخاب ہے۔ مظفر حنفی نے اس انتخاب میں یہ کوشش کی ہے کہ شاد عارفی کی مجموعی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مظفر حنفی کے مقدمہ میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ مختصر بھی ہے۔ اگر انھوں نے شاد عارفی کی شاعری اور ان کے فن پر بھی گفتگو کی ہوتی تو یقیناً شاد عارفی کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہوتی۔

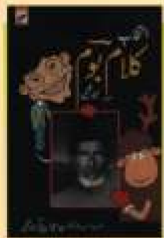

انتخاب کلام بوم میرٹھی

مرتب: ڈاکٹر سید اعجاز پاپولر میرٹھی
صفحات: 195، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: اسد رضا، F-97 سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 110025

زیر نظر کتاب طنز و مزاح کے مشہور شاعر بوم میرٹھی کے کلام کا انتخاب ہے جسے طنز و مزاح کے معروف و مقبول اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر سید اعجاز پاپولر میرٹھی نے نہایت کاوش و تحقیق کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جبکہ پہلا ایڈیشن تیس سال قبل یعنی بیسویں صدی میں منظر عام پر آیا تھا۔ چونکہ پہلا ایڈیشن بھی کافی پسند کیا گیا تھا لہٰذا ڈاکٹر پاپولر میرٹھی نے دیدہ زیب انداز میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا ہے۔ اس ایڈیشن میں انھوں نے بعض ترامیم اور اضافے بھی کیے ہیں۔ زیر بحث کتاب کا پہلا مضمون خود مرتب کے اعجاز قلم کا نتیجہ ہے اور جس کا عنوان ہے 'حرف آغاز' دوسرا مضمون ڈاکٹر خالد حسین خاں صاحب کا بعنوان 'پیش گفتار' ہے۔ تقریظ جناب انیس احمد حسینی انیس میرٹھی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ باب اول میں بوم میرٹھی مرحوم کی غزلیات ہیں جبکہ باب دوم ان کی منظومات پر مشتمل ہے۔ بوم مرحوم کے چند قطعات اور رباعیات بھی شامل کتاب ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر جناب انیس احمد انیس میرٹھی کا پر فکر مضمون بعنوان 'بوم میرٹھی کی مزاح نگاری میں: کرب کا احساس' ہے۔

'پیش گفتار' میں ڈاکٹر خالد حسین خاں صاحب نے ''کلام بوم کے انتخاب و ترتیب اور اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر سید اعجاز الدین پاپولر میرٹھی کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے ''شاید قسام ازل نے بوم میرٹھی کے بخت میں یہی لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا مقدور بھر اظہار نہ کرسکیں۔ اسی خیال کے پیش نظر پاپولر نے بوم میرٹھی کے فکر و فن اور ان کے دلکش و دلنشیں طنزیہ و مزاحیہ شاعری سے لطف اندوز ہونے، ان کے

کلام دل پذیر کے حسن و قبح اور معیار و مرتبے سے عوام خواص کو آگہی و عرفان اور شناسا کرانے کی مخلصانہ اور ایماندارانہ کاوش و کاہش کی۔" جہاں تک منشی شیر خاں بوم میرٹھی کی شاعری کا تعلق ہے تو اس کی تعریف معروف شاعر حفیظ الرحمٰن حفیظ میرٹھی نے بھی ان الفاظ میں اپنی تقریظ میں کی تھی۔ "بوم باقاعدہ تعلیم یافتہ نہ تھے مگر فن سے ضروری حد تک واقف تھے، واجبی سے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بوم کا کلام زبان و بیان کی غلطیوں سے تقریباً پاک ہے۔ سلاست و روانی ان کے کلام کی خاص خوبی ہے۔ وہ عام بول چال کے لفظوں سے شعر میں حسن پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔"

مشہور و مقبول شاعر شمیم جے پوری مرحوم نے بھی بوم میرٹھی کو فطری اثاثۂ فن سے مالا مال قرار دیا ہے۔ دراصل بوم نے جہاں طنز و مزاح اور فحاشی سے بھرپور اشعار کہے وہیں سنجیدگی کے حامل اشعار بھی ان کے کلام کی زینت ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے 'قتل تمیزن' نامی ایک طویل نظم بھی نہایت سنجیدہ انداز میں کہی جو ایک حقیقی واقعہ کی تاریخ ہے۔ اسی طرح ان کی نظم 'رفتار زمانہ' میں بھی سنجیدگی کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کے چند طنز و مزاح کے حامل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

جب مری گستاخیوں کی وہ سزا دینے لگے — وصل کی شب لات گھونسہ بھی مزا دینے لگے
تصور پاخانہ میں کھنچا جب بزم جاناں کا — تو گویا پاخانہ بن گیا پھر بزم جاناں کی
کبھی نہ تم کو غریبوں کا کچھ خیال ہوا — اسی کے ہوگئے جس کی گرہ میں مال ہوا

چند سنجیدہ اشعار بھی دیکھیے:

کب آشیاں کی زد میں مرے بجلیاں نہ تھیں — کب بجلیوں کی زد میں مرا آشیاں نہ تھا
بنیاد ڈال دی تھی تمہارے خیال کی — تعمیر جب ہوا مرا ایوان آرزو
مری خصلت سے ناخوش اپنا اور بیگانہ ہوتا ہے — جہاں میں بیٹھ جاتا ہوں وہیں ویرانہ ہوتا ہے

بوم میرٹھی نے اپنی شاعری میں انگریزی اور ہندی کے عام فہم الفاظ بھی استعمال کیے اور بے خوف ہوکر اشعار کہے۔ اس بے خوفی کی وجہ سے ہی انھیں سرکاری نوکری سے برطرف کیا گیا۔ اسی لیے بوم کی ساری زندگی مفلسی میں گزری اور وہ اپنا دیوان بھی ترتیب نہیں دے سکے۔ البتہ وہ چھوٹے چھوٹے کتابچوں میں اپنی نظمیں چھپوا کر خود فروخت کیا کرتے تھے۔ ان حالات میں جناب پاپولر میرٹھی نے کلام بوم کو یکجا اور منتخب کرکے دوبارہ شائع کرایا۔ لہٰذا ڈاکٹر سید اعجاز پاپولر کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔ توقع ہے کہ اردو دنیا بالخصوص طنز و مزاحیہ شاعری کے شائقین اس کتاب کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

ابلاغیات

الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت

مصنف: ڈاکٹر تنزیل اطہر
صفحات: 292، قیمت: 350 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جاں نثار معین سینئر ریسرچ اسکالر ڈپارٹمنٹ آف ویمنس ایجوکیشن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد

ہندوستان میں دیگر زبانوں کی طرح اردو میڈیا بھی ترقی کی طرف گامزن ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں مگر تنزیل اطہر نے ان کتابوں سے ذرا مختلف انداز میں یہ کتاب تحریر کی ہے۔ اس کے کچھ موضوعات صحافت پر لکھی گئی کتابوں سے ضرور ملتے ہیں مگر اس کتاب کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کہ اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ تینوں کے حوالے سے مربوط اور مبسوط گفتگو کی گئی ہے۔

زیر تبصرہ 'الیکٹرانک میڈیا اور اردو صحافت' ایک اہم کتاب کہی جائے گی۔ اس کی تصدیق حقانی القاسمی نے اس طرح کی ہے "ڈاکٹر تنزیل اطہر نے ریڈیو ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کو اپنی تحقیق کا محور و مرکز بنایا ہے اور ان ترسیلی ذرائع کے حوالے سے ان امکانات کی جستجو کی ہے، جن سے زبان و ثقافت کو نہ صرف زندگی مل سکتی ہے بلکہ ایک وسیع تر منطقہ لسانی و ثقافتی مظاہر کے حصے میں آسکتا ہے۔ مواصلاتی نظام نے جس طرح اپنا جال پھیلایا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مواصلاتی نظام سے ہم آہنگ ہوئے بغیر زبان یا ثقافت کا ارتقا ناممکن ہے۔ تنزیل اطہر نے اپنی تحقیق میں ریڈیائی ترسیل کے لازمی عناصر، ریڈیو کی زبان، لفظیات، دائرہ کار اور دیگر ادارتی اور تکنیکی لوازمات پر مبسوط گفتگو کی ہے اور اردو کے حوالے سے ریڈیائی نشریات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی ویژن کے ذریعے آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے اس دشت امکاں کو تلاش کیا ہے جس کی طرف کبھی مرزا غالب نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ آن لائن صحافت کی بنیادی نکات، بڑھتے اثرات اور دور حاضر میں اس کی لازمیت اور افادیت پر بھی معروضی گفتگو کی ہے۔"

تنزیل اطہر طالب علمی کے زمانے ہی سے میڈیا سے جڑے رہے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں پوری توجہ اردو کی برقی صحافت پر مرکوز رکھی ہے۔ ریڈیائی اور ٹیلی ویژن صحافت سے ہوتے ہوئے آن لائن اردو صحافت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کے کردار پر بھی نظر ڈالی۔ اس تصنیف کو چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں الیکٹرانک میڈیا کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ذیلی باب میں الیکٹرانک میڈیا کے آغاز و ارتقا پر بحث ہے۔ دوسرے ذیلی باب میں ہندوستان میں الیکٹرانک میڈیا پر گفتگو ہے۔ جس میں تحریر کی ایجاد سے لے کر عوامی ذرائع ترسیل کے سب سے جدید میڈیم انٹرنیٹ کی تاریخ سلسلے ہے۔

باب دوم ریڈیو کا نظام عمل، ریڈیائی تحریر کے بنیادی عناصر، ریڈیائی خبر نویسی، اور ریڈیو پر اردو خبریں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں پر محیط ہے۔ باب سوم ٹیلی ویژن کی صحافت کے تمام گوشوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کے پانچ ذیلی ابواب ہیں: (1) ٹیلی ویژن کے تنظیمی ڈھانچے پر بحث کی گئی ہے۔ (2) ٹیلی ویژن کی خبر سازی جس میں خبروں کی حصول یابی، ایڈیٹنگ اور ترتیب کا مطالعہ درج کیا گیا ہے۔ (3) ٹیلی ویژن کی خبر نویسی پر بحث کی گئی ہے۔ (4) ٹیلی ویژن پروڈکشن اور خبروں کی پیشکش پر گفتگو کی گئی ہے۔ (5) ٹیلی ویژن چینلوں کا مختصر تعارف بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں الیکٹرانک میڈیا کے جدید ترین میڈیم آن لائن صحافت کی معلومات دی گئی ہیں۔ یہ باب سات ذیلی ابوب پر مشتمل ہے۔ جس میں آن لائن صحافت اور اس کی اقسام، خصوصیات، نیوز ویب سائٹس کے بنیادی عناصر، نظام، خبر نویسی اور نیوز ویب سائٹس کا تجزیہ شامل ہے۔ پانچویں باب میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کے رول کی وضاحت کی گئی ہے۔ ذیلی عنوان کے تحت اردو زبان و ادب کے فروغ میں ریڈیو کا کردار، اردو زبان و ادب کے فروغ میں ٹیلی ویژن کا کردار اور آن لائن صحافت کے کردار پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کا مرکزی خیال ہے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کیسے اردو زبان و ادب کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ آخری باب الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے مسائل و امکانات پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ریڈیو کے بنیادی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ ٹیلی ویژن میں اردو کے مسائل پر مرکوز ہے۔ آخری میں آن لائن صحافت کے مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مصنف نے وسیع النظری سے ہر موضوع کا پوری طرح حق ادا کیا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں بھی ہیں۔ یہ کتاب اردو صحافت کے طلبہ اور ریسرچ اسکالر کے علاوہ صحافت سے جڑے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

طنز و مزاح

ٹنڈے کباب

مصنف: ڈاکٹر محبوب حسن
صفحات: 116، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: شاداب عالم، جہلم ہاسٹل، روم نمبر 243، جے این یو، نئی دہلی

ڈاکٹر محبوب حسن عہد حاضر کے نوجوان ادیب و تخلیق کار ہیں۔ پیش نظر کتاب 'ٹنڈے کباب' ان کی تازہ ترین تخلیقی کاوش ہے۔ انھیں ادب اطفال سے بھی والہانہ لگاؤ اور فطری وابستگی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'ٹنڈے کباب' میں اعداد و شمار کے اعتبار سے کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ جس جلسے میں طلباء کو میسر نہ ہو بوٹی، میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو، سارے جہاں سے چوپٹ ہندوستاں ہمارا، ٹنڈے کباب کی یاد میں، رومیو کی آزمائش، قصہ ایک ادبی سیمینار کا، ڈھائی گھنٹے کا علی گڑھ، مس اردو سے ایک ملاقات، ایسی آزادی سے بہتر ہے غلامی یا رب، رشوت برائے رحمت اور 'پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں' جیسے عنوانات پہلی ہی نظر میں ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ یہ مضامین شگوفہ، کتاب نما، ذہن جدید، ایوان اردو، کسوٹی جدید، خبرنامہ، انقلاب، کشمیر عظمیٰ، متاع آخرت، اردو نیٹ جاپان، راشٹریہ سہارا، انڈین ایکسپریس جیسے ادبی رسائل و اخبارات کی زینت بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب حسن نے یہ مضامین مختلف اوقات اور مختلف ذہنی کیفیات کے تحت لکھے ہیں اور اسی وقت لکھے ہیں جب کسی مخصوص تجربے یا مشاہدے نے ان کے ذہن میں تپ کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محبوب حسن اپنی تحریروں میں طنزیہ و مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی غرض سے حالات کی ستم ظریفی اور دلکش بیانیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ طنز و مزاح کی مبادیات سے خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں احتجاج کی شدت اور اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے زوال کا غم پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ غم کی یہی لہریں جب شدت اختیار کر لیتی ہیں تو طنز کے نشتر تیز سے تیز تر ہو جاتے ہیں لیکن ان کا طنزیہ اسلوب طنز برائے طنز نہ رہ کر اصلاح کے جذبے کے تحت وجود میں آتا ہے، جس کے پس پشت مختلف طرح کی تلخ سچائیاں اور زندگی کی دھوپ چھاؤں کی وہ رہ گزر ہوتی ہے جو خشکی اور واعظ کی تنگ نظری کے بجائے لفظوں کا ایسا نگینہ ہوتا ہے جو احساس کے زخموں کو پھول بنا دیتا ہے اس طرح وہ طنز سے مزاح اور مزاح سے طنز کو گوارا بنا لیتے ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں زندگی کے کڑے کوس اسی کے دوش پر بآسانی طے کیے جا سکتے ہیں:

"آج دنیا کے حسین و نازک لبوں سے مسکراہٹ غائب ہے۔ ہر شخص غم و اداسی کا پشتارہ لیے بھٹک رہا ہے۔ اس کے چہروں میں لاچاری و بے بسی کے جاں گداز کانٹے چبھے ہوئے ہیں۔ ناکامی و نامرادی کی لہروں میں ہچکولے کھاتا آج کے انسان کا مقدر بن گیا ہے۔ اپنے کندھوں پر کاغذ کی کشتیاں اٹھائے سمندر کی مانند تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آنکھوں میں جلن، سینے میں طوفان لیے ہر شخص پریشانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ اور قہقہوں کے بغیر واقعی یہ دنیا بیوہ اور انسانی زندگی یتیم ہو گئی ہے...... ایسے میں طنز و مزاح کے ذریعہ ہی پاؤں میں چبھے غم کے کانٹوں اور دل کی ویرانی کا علاج ممکن ہے۔" (اعتراف، ص 15)

کتاب میں شامل پہلے مضمون 'ٹنڈے کباب کی یاد' لاجواب طنزیہ مضمون ہے۔ 'رومیو کی آزمائش' میں محبت جیسے پاکیزہ جذبے پر لگائے گئے غیر منطقی قدغن کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ 'قصہ ایک سیمینار کا' اور 'جس جلسہ میں طلبا کو میسر نہ ہو بوٹی' میں موجودہ دور میں ادبی سیمیناروں کے گرتے ہوئے معیار پر طنز کیا گیا ہے تو 'میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو' میں سماج میں پھیلی بے روزگاری اور بدعنوانی کی لعنت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو طلبہ کے لیے ایک روحانی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، جہاں لوگ اپنی علمی پیاس بجھانے آتے ہیں لیکن افسوس کہ یہاں بعض حضرات غیر ضروری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محبوب اپنے مضمون 'ڈھائی گھنٹے کا علی گڑھ' میں اس صورت حال کو بے حد مزاحیہ انداز میں شیروانی اور صدری کی بحث کے ذریعے اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ 'مس اردو سے ملاقات' میں تمثیلی اور مکالماتی پیرایہ میں اردو اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہاں اس نکتے کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی شیرینی، مٹھاس اور جنگ آزادی میں اس کے بے مثل کارناموں کا اعتراف تو بیشتر لوگ کرتے ہیں لیکن جیسے ہی اس کے حق کی بات آتی ہے اس کے سر پر فرقہ پرستی کا الزام رکھ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن حسب حال اپنا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کتاب کے آخری مضمون 'پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں' میں انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کے قابل رحم تجربات و مشاہدات کو نہایت دیانت داری کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ان کی یہ آپ بیتی جگ بیتی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر محبوب حسن نے بیشتر جگہوں پر جمہوری قدروں کی ناکامی اور نامرادی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ موصوف نے 'ایسی آزادی سے بہتر ہے غلامی یا رب' میں عصر حاضر کے سیاسی رہنماؤں کی عیاری و مکاری کو بے باکانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا مضمون 'رشوت برائے رحمت' ملک میں پھیلی ہوئی اقتصادی بدعنوانی اور معاشی انتشار کی گھناؤنی تصویریں طنزیہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر محبوب حسن کچھ اس فنی خوبصورتی کے ساتھ اپنی بات کہہ دیتے ہیں کہ ابہام کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کا وضاحتی بیانیہ ماجرے کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے۔ وہ مختصر جملوں میں اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ سادہ اور عام فہم نثر سے آراستہ ان تحریروں میں جگہ جگہ تمثیلی، مکالماتی اور ڈرامائی حسن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی یہ تحریریں اپنے اندر مسرت و بصیرت کا بھرپور خزینہ چھپائے ہوئے ہیں، جس سے ہر سطح کا قاری استفادہ کر سکتا ہے۔ ان کی یہی خوبیاں کتاب کی Readibility میں اضافہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر محبوب حسن کی کتاب 'ٹنڈے کباب' طنز و مزاح کی سست رفتار روایت کو مستحکم کرنے میں یقینی طور پر معاون ثابت ہوگی۔ اس کتاب کی اشاعت پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ قوی امید ہے کہ زیر مطالعہ کتاب ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

مختصر تبصرے

عذاب اثر (شعری مجموعہ)

شاعر/ناشر: یعقوب راہی / قیمت: 200 روپے

شاعری انسانی جذبات کے بے ساختہ اظہار کا نام ہے اور کسی شاعر کو اپنے احساس و جذبات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کے لیے جس تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے اس کرب کو ایک تخلیق کار ہی سمجھ سکتا ہے اور اسی کرب سے اٹھنے والی ٹیس کی تاب بھی وہی لا سکتا ہے۔ 'عذاب اثر' یعقوب راہی کا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں نظمیں غزلیں نثری نظمیں تراجم (بنگالی زبان سے) اور آخری صفحے میں ان کی تصانیف ہیں۔ یوں تو یعقوب راہی کے کئی شعری مجموعے ہیں۔ لیکن زیر نظر مجموعہ کلام دوسرے مجموعوں سے ان معنی میں مختلف ہے اس مجموعے میں شاعر نے زندگی کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے شاعر خود اس کرب سے گزرا ہو:

کس کو بتاؤں روکے ہوئے آنسوؤں کا دکھ
ماتم گسار قافلہ نا رسا ہے کون

یعقوب راہی کی نظموں کا رنگ الگ ہے۔ ان کو پڑھتے ہوئے متکلم کے اصل کرب کو سمجھنے میں مدد

ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی بھی ہے اپنے پرائے سب کا غم بھی ہے اور خود سے مکالمہ بھی۔ ان کی نظموں میں دھیماپن ہے اور ایک لطیف سا احساس ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم دیکھیے:

میری آنکھوں میں/ امڑتے آنسوؤں کو/ پوچھ کر تم کس طرف چل دیے
کہ گہری نیند سے اٹھ کر/ تمہی کو/ ڈھونڈتا ہوں میں

یعقوب راہی کے اشعار میں تنہائی کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔ انھیں اپنے عزیز کے بچھڑنے کا شدید احساس ہے اور اسے بار بار آواز دیتے ہیں تلاش کرتے ہیں اپنے پاس بلاتے ہیں:

کسی پل آن کر دیکھو/ بھرے گھر کا اکیلا پن/ تمہی کو/ یاد کرتا ہے

المختصر، یعقوب راہی نے انسانی جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے لیے غزل اور نظم دونوں کی مدد لی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یعقوب راہی کا شعری مجموعہ ادبی حلقے میں پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

لفظوں میں احساس (غزلیں)

شاعر: افتخار راغب/ قیمت: 125 روپے
ناشر: ادارہ ادب اسلامی ہند دہلی

نئی نسل کے جن غیر مقیم ہندوستانی شعرا نے اپنے فکر و فن اور شعری صلاحیتوں سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں ایک اہم نام افتخار راغب کا ہے، اب تک ان کے چار سے زائد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'لفظوں میں احساس' میں غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور مناجات بھی شامل ہیں۔ مجموعے کی ابتدا میں مشاہیر کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

افتخار راغب کا شعری لب ولہجہ عام فہم ہے، وہ آسان بحر کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنے احساس کو لفظوں کے نگینے میں پرونے کا اچھا ہنر جانتے ہیں ایک عام قاری بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایک دو بار پڑھ لینے سے ذہن نشین بھی ہوسکتا ہے۔ افتخار راغب کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہجرت کے کرب کو بھی پیش کرتا ہے۔ فکر معاش نے نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو اپنے عزیز و اقارب سے دور رہنے پر مجبور کردیا ہے۔ افتخار راغب کی شاعری میں ایسے غیر مقیم ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔

کل تلک تھے ساتھ ہم اک دوسرے کے اور آج
مدتوں کا فاصلہ ہے میرے اس کے درمیان
رنج و غم ٹوٹتے ہیں دل پہ اس قدر پردیس میں
جا بجا بکھرا ہوا ہوں ٹوٹ کر پردیس میں

ظاہر ہے ہجرت کے اس کرب کو وہ لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں، جنھوں نے اس کو محسوس کیا ہو۔ افتخار راغب کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی دیکھنے کو ملتا ہے، اس میں ہجر بھی ہے، تیاگ بھی ہے، زندگی کی نیرنگیاں بھی ہیں، معاشی بدحالی اور مجبوریاں بھی ہیں۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ افتخار راغب اپنے احساس کو شعری قالب میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہیں۔

ادراک کے سائے تلے (شاعری)

شاعر: ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان
صفحات: 208، قیمت: 115 روپے/ ناشر: ایوی روز اکیڈمی علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب ادراک کے سائے تلے رضوان الرضا رضوان کا شعری مجموعہ ہے۔ ابتدا میں 'مصنف ایک نظر میں' کے عنوان سے جمیل احمد نوری نے شاعر کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بیکل اتساہی کے تاثرات بھی کتاب میں شامل ہیں۔ جہاں تک مشمولات کا سوال ہے تو اس مجموعے میں حمد وثنا، دعا اور نعت ہیں کے ساتھ ساتھ غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔

نظمیں دراصل شخصیات اور کائنات پر ہیں۔ ان میں ایک نظم ترقی پسند شاعر مجاز لکھنوی پر ہے، تو ایک نظم بیکل اتساہی پر۔ شاعری کوئی آسان فن نہیں یہ دماغ سوزی اور جگر سوزی کا فن ہے۔ اس فن کو کندن بنانے کے لیے شعور کی بھٹی میں تپنا پڑتا ہے تب جا کر کوئی فن پارہ ادبی شاہکار بنتا ہے۔ 'ادراک کے سائے تلے' رضوان صاحب کا اسی ادبی شاہکار کا نمونہ ہے ہے جسے انھوں نے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں بکھراؤ کم تسلسل زیادہ ہے۔ انھیں دل کی دنیا میں تغیر وتبدل پسند نہیں دیکھیے شعر:

گردش شام و سحر میں تو خلل بہتر ہے	دل کی دنیا میں کہاں ردو بدل بہتر ہے
کیا ضروری ہے بات اسی سے کی جائے	زندگی سے ہو تعلق وہ غزل بہتر ہے
اہل نظر کو ہوتا ہے پہچان اور پرکھ	آئینہ میں تو عکس بھی دھندلا دکھائی دے

رضوان صاحب کی غزل کا لہجہ مانوس اور دلنواز ہے۔ یہ رضوان صاحب کا اپنا ہنر ہے کہ کتابوں کا نام بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ اس فن کار کے فن کو اپنے ادراک سے کتنا سمجھتے ہیں۔ امید ہے کہ فہم و فراست کا ثبوت دیں گے۔

نوائے دل (شعری مجموعہ)

شاعرہ: رضوانہ شبنم، قیمت: 150

زیر تبصرہ کتاب نوائے دل رضوانہ شبنم صاحبہ کا شعری مجموعہ ہے، وہ پیشے سے استاذ ہیں، اور ان کا تعلق ناسک سے ہے۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ان کے خیر خواہوں کے تاثرات شامل ہیں، اس کے علاوہ شاعرہ کی آپ بیتی بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ جہاں تک شاعری کی بات ہے تو اس مجموعے میں حمد، نعت اور ان کے اسکول کے ترانے کے علاوہ غزلیں شامل ہیں۔ غزل کا ایک معنی عورتوں سے باتیں کرنا بھی ہے۔ لیکن یہاں رضوانہ شبنم عورت ہوکر غزل کے پیرائے میں اپنی نوائے دل کہہ رہی ہیں۔ محبت وہ شے جو ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے لیکن محبت کو محبت کی طرح نباہنا اصل شے ہے اور اس محبت میں اگر کوئی دیوانہ بن جاتا ہے تو یہ اس کا مقدر ہے دیکھیں شعر:

محبت ہر کسی کے دل گھر پیدا نہیں کرتی
مقدر سے ہی سے دنیا میں کوئی دیوانہ بنتا ہے

رضوانہ شبنم کے یہاں عشق و محبت کا فلسفہ کچھ الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں رومانیت کا پہلو زیادہ ہے شبنم صاحبہ نے اپنی غزلوں میں جن انسلاکات کا استعمال کیا ہے اس میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ رضوانہ شبنم نے ہجر کی کیفیت کو یوں پیش کیا ہے۔

یہ کیسا ظلم ہے مجھ پر وصال یار کو ترسوں
میں اس بے رحم دنیا میں کسی کے پیار کو ترسوں

خیر محبت نفرت قربت بے چینی پریشانی جلن تپش یہ ہر کسی کی زندگی کا موضوع سخن ہے، انہوں نے اس تڑپ کو غزل کا پیراہن عطا کیا ہے تاکہ اس تڑپتی روح کو قرار مل جائے اور شبنم صاحبہ اس میں بہت حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے عصری مسائل کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

ظلم وستم غریب پر ڈھانے لگے ہیں لوگ	انسانیت کا خون بہانے لگے ہیں لوگ
بستی کو قتل گاہ بنانے کے واسطے	پانی کی طرح خون بہانے لگے ہیں لوگ

ہم بچے ہیں پڑھنے والے (بچوں کی نظمیں)

شاعر: فراغ روہوی/ قیمت: 50 روپے

زیر تبصرہ کتاب فراغ روہوی کی ہم بچے ہیں پڑھنے والے بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جسے مغربی بنگال اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اس میں 80 صفحات ہیں اس مجموعے کی شروعات 'اللہ اکبر یعنی اللہ سب سے برتر ہے' سے ہوتی ہے۔ پھر حمد باری تعالی دعا ہمارا نبی بعد ازیں بچوں کے لیے پیاری پیاری نظمیں ہیں یہ نظمیں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں جیسے میری دادی، گڑیا، اچھا بچہ، گڑیا کی شادی، اور کمپیوٹر وغیرہ۔ فراغ روہوی صاحب نے یوں تو بچوں کے لیے یہ فن پارہ تخلیق کیا ہے لیکن اس میں بچوں

کے علاوہ جوان اور بوڑھے سب کے لیے دلچسپی کا سامان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

تاج محل سا کون محل   اس کا کوئی نہیں بدل
بات سبھی نے مانی ہے   تاج محل لا ثانی ہے

اس کے علاوہ جاڑے، گرمی، برسات، بہار، ہولی وغیرہ۔ کمال تو یہ ہے کہ ایک غزل بھی ایسی نہیں ہے جس میں بچوں کے دل کی ترجمانی نہ ہو اور ہر مصرعے میں گل اور بوٹے پرو دیے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

دل صفائی کی ہے   اپنی بھلائی کی ہے
کیوں فیل ہوتے یاروں   ہم نے پڑھائی کی ہے
جب ہم نے کی شرارت   ماں نے پٹائی کی ہے

مذکورہ غزل میں فراغ صاحب نے بچوں کے tools کو یک جا کر دیا ہے دو بھائی میں لڑنا اور قلفی ملائی سے دلچسپی لینا بچوں کی فطرت رہی ہے فراغ صاحب بچوں کی ذہنیت کو سمجھتے ہوئے ہر صفحہ پر نظم کی عکاسی تصویر کے ذریعے سے کی ہے تاکہ بچے پڑھائی میں دلچسپی لیں اس سے ان کی ذہانت اور علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا آسان نہیں ہے اس کے لیے خود کو بچہ بنانا پڑتا ہے ماضی کی طرف جانا پڑتا ہے بچوں کی نفسیات کا تندہی سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور یہ سب بچوں کے مستقبل کے لیے کیا جاتا ہے چونکہ اگر کوئی بچپن سے گزرتا ہے اور ہر بڑا ایک دن بچہ ہوتا ہے اور بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو اس کا مستقبل اسی کے سامنے ہوتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ فراغ روہوی صاحب کا یہ مجموعہ بچوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

بوندا باندی

شاعر: عطاالرحمٰن طارق/ قیمت: 60 روپے/ ناشر: ایڈشاٹ پبلی کیشنز، ممبئی

بوندا باندی عطاالرحمٰن طارق کی نظموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ اس میں مختلف عنوانات پر اچھی اور دلکش نظمیں لکھی گئی ہیں اور ہر نظم بچوں کے دلجوئی کا پورا مواد فراہم کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں کل 64 نظمیں ہیں جن میں بارش کا سنگیت، ریل چلی، اسکول جاؤ، ضد نہیں کرتے میری جان، آئی سردی، دیس اپنا بھارت، ماں یہ بتاؤ ذرا مجھے، مت کرو تم بکواس، ہیں جو کہ موضوعات کے اعتبار سے بہت اچھی نظمیں ہیں جو بچوں کو ایک سبق بھی دیتی ہیں اور ان کی تربیت بھی کرتی ہیں۔

کلیاں کھلنے دو

شاعر: سہیل عالم/ صفحات: 72، قیمت: 54 روپے/ ناشر: آئیڈیل پبلی کیشن، ہاؤس، کامٹی

یہ کتاب سہیل عالم کا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں بچوں کے لیے نظمیں لکھی گئی ہیں 76 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں مناجات، نعت پاک اور منقبت، کے علاوہ 27 اور ایسی نظمیں ہیں جو بچوں کے اخلاقی اقدار، کردار سازی اور پروقار شخصیت بنانے میں کافی معاون ہیں۔ ہمارے استاد امتحان سر پر ہے، اردو زبان، آؤ سیکھیں کمپیوٹر، اور ایک ہو تم، جیسی اچھی نظمیں ہیں۔

یہ کائنات

شاعر: انصار احمد معروفی/ صفحات: 112

زیر تبصرہ کتاب 'یہ کائنات' انصار احمد معروفی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے، اس کتاب میں شامل تمام نظمیں بچوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ انصار احمد معروفی کی اس مجموعے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ انصار احمد معروفی نے اپنے مجموعے کا آغاز حمد سے کیا ہے۔ انصار احمد معروفی کے اس مختصر سے مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کی یاد آتی ہے۔ انصار احمد معروفی نے بچوں کی فہم و فراست کا پورا خیال رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں مشکل تراکیب کا استعمال بہت کم ملتا ہے۔ نظام شمسی کے عنوان سے انہوں نے ایک خوبصورت نظم کہی ہے۔ زمین کی گردش کا ذکر ملاحظہ کیجیے:

یہ زمیں، یہ چاند یہ سورج سبھی رگھومنا ہے ان کی اصل زندگی ر روز پورا ایک چکر یہ زمیں رکرلیا کرتی ہے کر لیجیے یقیں راس کی گردش میں چھپے ہیں رات و دن راس کی ہفتوں اور مہینوں میں تو گن۔ انصار احمد معروفی نے 'ہوا کی آلودگی اور اس کا دباؤ' کے عنوان سے ماحولیات میں پھیل رہی آلودگی کا ذکر کیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

پیڑ پودے پھول پھل اور آدمی ر ہے مضر سب کے لیے آلودگی ر پیڑ پودے صاف کرتے ہیں فضا ر پیڑ پودے ہیں دوا بھی اور غذا ر صاف رکھنا ہو ہواؤں کو اگر ر آج سے کاٹو نہ ہریالے شجر۔

ایسی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ انصار احمد معروفی کے پیش نظر بچوں کی تربیت اہم مسئلہ ہے۔ چند اہم نظموں کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ 'زمین کی کشش ثقل، چاند کا کمال، سبزیاں اور پھل، جراثیم سے تحفظ، ماحولیات کا تحفظ، شبنم کی حقیقت، سورج اور ستارے، کہکشاں، زمین کی حرکت، اوس، کہرا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کے عنوانات سے بھی ان نظموں کے موضوعات اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہ بچوں کے لیے ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے۔

عقیدت کے پھول (مجموعہ منقبت)

شاعر: اسرار نسیمی، مرتب: ڈاکٹر محمد احمد خان امن/ قیمت: 100 روپے

عقیدت کے پھول اسرار نسیمی کا شعری مجموعی ہے جس میں انھوں نے حب رسول اور حب آل رسول میں عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ اس فن کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی کہ اسلام کی تاریخ اور اس کا رواج اردو شاعری میں اپنے ابتدائی زمانے سے عروج پر پایا جاتا ہے یہ فن بہت نازک بہت لطیف اور بہت مشکل ہے۔ نسیمی صاحب نے اس پر قلم اٹھایا یہ اس کے لیے تعریف اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس مجموعے میں کوئی ہیئت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عنوان قائم کیا گیا ہے بلکہ یہ ایک لمبی نظم ہے جو کہ حمد سے شروع ہوتی ہے اور رسول اور آل رسول کی مدح سرائی اور تعریف و توصیف تک جاتی ہے۔

التجا

شاعر: وکیل نجیب

زیر تبصرہ کتاب 'التجا' وکیل نجیب کا شعری مجموعہ ہے۔ اب تک ان کی ڈھائی درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ادب اطفال کے حوالے سے وکیل نجیب نے ناول، کہانیاں سفرنامے، ڈرامے اور شاعری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وکیل نجیب نے لکھا ہے کہ ان کی نظمیں 12 سے 18 برس کے بچوں کے لیے کہی ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے میں کل 47 نظمیں شامل ہیں۔ مجموعے کا آغاز حمد باری تعالی سے ہوا ہے۔ وکیل نجیب کے اس مجموعے میں شامل نظموں کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ التجا، اللہ کی قدرت، معصوم تمنا، بادل، گھاس، پتنگ، تتلی، عید، میرا گھر، رات، تعلیم اور احساسات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وکیل نجیب کی نظم 'اردو' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کیسی پیاری زبان ہے اردو ر سارے عالم کی جان ہے اردو ر سب کو علم و ادب سکھاتی ہے ر سب پہ ہی مہربان ہے اردو ر سب زبانیں ہیں اس کے زیر نگیں ر گویا اک آسمان ہے اردو

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وکیل نجیب کا مذکورہ شعری مجموعہ اپنے موضوع اور اسالیب کے لحاظ سے اہم ہے۔

زاہد ندیم
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

■

عالمی اردو نامہ

معاصر دنیا میں اردو

ڈھاکہ: شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ دو روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس بعنوان 'معاصر دنیا میں اردو' کا انعقاد ہوا۔ بین الاقوامی

اردو کانفرنس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک سے اردو کے ادیبوں نے شرکت کی۔ افتتاحی تقریب کی صدارت صدر شعبۂ اردو پروفیسر ڈاکٹر ظفر احمد بھویاں، کنوینر انٹرنیشنل اردو کانفرنس کمیٹی نے کی، جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر اختر الزماں مہمان خصوصی کے طور پر آرٹس فیکلٹی کی کارگزار ڈین پروفیسر ڈاکٹر شاہ جہاں میاں موجود تھے۔ عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح تلاوت قرآن کلام پاک سے کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں معزز مہمانان نے سحر افروز گفتگو کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

کانفرنس کے دوسرے سیشن کی صدارت شعبۂ اردو ڈھاکہ پروفیسر ڈاکٹر محمود السلام نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل (شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی) نے 'دور حاضر میں اردو ادب کے بنگلہ مترجم' عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صفدر امام قادری (شعبۂ اردو کامرس، آرٹس، سائنس کالج پٹنہ) نے 'اردو کی کاروباری جہتیں: ہندوستانی تناظر اور عالمی انسلاک' پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد رشید احمد (ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی) نے 'بنگلہ دیش کے چند مشہور علمائے کرام کی اردو خدمات' پر روشنی ڈالی۔ ہندوستان سے آئیں محترمہ حفیظ مظفر، سری نگر نے 'عصر حاضر میں اقبال کے تصور خودی کی اہمیت' پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد (شعبۂ اردو، راج شاہی یونیورسٹی ڈھاکہ بنگلہ دیش) نے 'عالمی تناظر میں بنگلہ دیش میں اردو کے مسائل اور امکانات' پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی اور پہلے اور دوسرے سیشن کی نظامت اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو ڈھاکہ حفصہ اختر اور اسسٹنٹ پروفیسر غلام علی مولا نے حسن وخوبی کے ساتھ کی۔ کانفرنس کے تیسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود السلام نے 'بنگلہ دیش میں اردو کی صورت حال'، ڈاکٹر زاہد الحق نے 'بہار میں اردو کے مسائل'، پروفیسر ڈاکٹر حسین احمد کمالی نے 'موجودہ دور میں عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کی صورت حال'، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی نے 'بنگلہ دیش میں اردو مختصر افسانہ'، ڈاکٹر محمد شاہد الاسلام نے 'ہند- پاک میں اردو کی صورت حال' اور حفصہ اختر نے 'ترکی کے اردو دوست خلیل طوقار کی شاعری کا فنی تجزیہ' جیسے عنوانات پر مقالے پیش کیے۔ ان کے علاوہ پروفیسر ظفر احمد بھویاں، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر غلام مولانا، حسین البنا، محمد شفیع الحسن نے بھی مقالے پیش کیے۔ اختتامی اجلاس میں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر نسرین احمد (پرو وائس چانسلر اکیڈمک، ڈھاکہ یونیورسٹی) نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے شعبۂ اردو کے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی محنت اور کوششوں سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اس بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد کامیابی کے ساتھ ممکن ہو سکا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2017

بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام محفل اردو 2017

دبئی: بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام تین حصوں پر مشتمل تقریب 'محفل اردو 2017' متحدہ عرب امارات میں اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد تقریب تھی۔ انڈین ہائی اسکول، ڈیرہ دبئی کا شیخ راشد آڈیٹوریم ہال وقت سے پہلے ہی اہل ذوق حضرات کی کثیر تعداد سے کھچا کھچ بھر چکا تھا، اس شام کی میزبانی ترنم احمد اور عزیر عتیق نے کی۔ بزم اردو کے جنرل سکریٹری ریحان خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے، اس کی ترویج کا آغاز پھر سے اپنے گھروں سے کرنا ہوگا۔ انھوں نے اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ اردو زبان کے حوالے سے کوئی مشاعرے یا غزل گائیکی کے انعقاد کا ارادہ رکھتا ہو، 'بزم اردو دبئی' ہر ممکنہ تعاون کرے گی۔ استاد غلام علی کی فروغ اردو ادب کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کے حوالے سے 'بزم اردو 2017' کے حصہ اول

میں غیر رسمی انداز گفتگو کے لیے بعنوان 'روبرو' میں معروف ٹی وی اینکر ڈاکٹر شگفتہ یاسمین اور استاد غلام علی کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا، حاضرین محفل نے تالیوں کی گونج میں غلام علی سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا۔

تقریب کے دوسرے حصے میں جوشِ اردو ایوارڈ 2017 کے لیے اردو زبان کے فروغ کے لیے ناقابل فراموش خدمات پیش کرنے والے مشتاق احمد یوسفی کا انتخاب کیا گیا تھا جن کا شمار ایک رجحان ساز اور صاحب اسلوب مزاح نگار میں ہوتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی شدید علالت کے باعث تقریب میں شرکت سے قاصر رہے مگر ایوارڈ نوازنے کے حوالے سے ٹی وی اسکرین پر ویڈیو کلپ چلایا گیا جس میں بزمِ اردو دبئی کی جانب سے ظہور اسلام جاوید اور تابش زیدی مشتاق احمد یوسفی کی خدمت میں کراچی میں ان کی دولت کدہ پر جوشِ ایوارڈ 2017 پیش کر رہے تھے۔ ایوارڈ کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور بزم اردو دبئی کا پہلا علم دار اردو ایوارڈ بہ دست سہیل زرعونی اور شکیل خان کے استاد غلام علی کو پیش کیا گیا، جبکہ ذیشان حیدر بھی ہمراہ تھے۔ پاسبان اردو ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر اتم کمار کی قسمت جگمگا اٹھی۔ مجلّے کی رونمائی عمل میں لائی گئی جس کے لیے تمام مہمانان خصوصی کے علاوہ شکیل احمد خان صدر بزمِ اردو، ریحان خان جنرل سکریٹری بزم اردو سمیت ندیم احمد، معراج احمد نظامی، سید تابش زیدی، شمی قریشی، محمد عزیز عتیق، عائشہ جنتی، شاداب الفت، عبدالصبور، سید اطہر عباس، سعود مدنی، احیاء بھوج پوری، سرور نیپالی، سید سروش آصف اور بھی اسٹیج کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔

تقریب کے آخری حصہ میں 1850 کا زمانہ، لال قلعہ کا ایک منظر، نہ دیوان خاص، نہ دیوان عام، ایک جانب سبزہ، صاف چبوترہ، مغلیہ شان وشوکت سے عاری، بہادر شاہ ظفر کی سادگی کا مظہر، اسٹیج پر نظر آیا۔ ظلِ سبحانی پردے کے پیچھے اپنے عہد کے نامور شعرا کرام کے ہمراہ اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ مشاعرے کی تاریخ میں پہلی بار نظامت کا سہرا جس شاعر کے سر سج رہا تھا، وہ خوش نصیب مرزا اسداللہ غالب تھے اور یوں ایک دلچسپ لال قلعہ کا آخری مشاعرہ (تمثیلی مشاعرہ) اپنے اصل رنگ لیے شروع ہوا۔ اس مشاعرے کے رائٹر اور ہدایت کار ڈاکٹر ایم سعید عالم جو مرزا غالب کا کردار بھی بہ خوبی ادا کر رہے تھے، مومن، آغا جان، بہادر شاہ ظفر، ذوق، غلام رسول شوق، بال مکند حضور، سخنور رکن، آذر ورد، داغ دہلوی اور سشلا کا کردار ادا کرنے والی فنکاروں کے اصل نام بالترتیب کچھ یوں ہیں: ساحر خان، عیش، وشنو شرما، ایمن انصاری، منیش سنگھ، حنان سنگھ، آرن، پرتاپ، ساحل جان اور یشراج تھے۔ شرکا نے دلچسپی سے تمثیلی مشاعرہ سنا اور ہر کلام کے ہر مصرعے پر داد لٹاتے رہے فنکاروں کی پرفارمنس کو بھی خوب سراہا گیا۔ مشاعرہ اختتام کو پہنچا تو ظلِ سبحانی کی تقلید میں سبھی نے ہاتھ جانب آسمان بلند کیے اور دعائیہ کلمات پیش کیے۔

بزمِ اردو کی اس تاریخی محفل میں شمولیت کے لیے ہندوستان سے کئی ادبی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا جن میں خالد عازمی، مشتاق احمد نوری، طارق فیضی، معظم بیگ، محشر آفریدی، سیف نقوی، رضی الرحمٰن قدوائی شامل تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 اکتوبر 2017

بحرین میں طرحی نشست کا انعقاد

بحرین: خلیج عرب میں واقع بحرین نے جس طرح اردو زبان کے لیے اپنی زمین کو ہموار کیا وہ اپنے آپ میں مثال ہے، یہاں ہر دل عزیز تنظیم 'مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو زبان' نے پچھلے پانچ سالوں میں اردو کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور اپنی خدمات کا دائرہ وسیع تر کرتے ہوئے تنظیم نے بہت سی مثبت پیش رفت بھی کی ہیں۔ پچھلے پانچ برسوں سے یہ مجلس اردو زبان کے کسی اہم شاعر کو منتخب کر کے اپنا ایک سال اس شاعر کے نام معنون کرتی ہے۔ اسی کے تحت مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے زیر اہتمام طرحی نشست کا انعقاد کیا گیا۔

نشست میں استقبالیہ کلمات بانی مجلس اور سرپرستِ اعلیٰ جناب شکیل احمد صبرحدی نے پیش کیا اور شعرائے کرام کے ساتھ ساتھ مہمانوں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ اس کے علاوہ بیرون ممالک سے اپنی غزلیں ارسال کر کے نشست میں شرکت کرنے والے شعرا کا خیر مقدم کیا اور مبارک باد پیش کی۔ اس کے بعد شیراز مہدی نے خوش اسلوبی کے ساتھ نظامت کے فرائض انجام دیے۔ صدارت کی کرسی پر استاد محترم شعیب نگرامی جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے شعرا کو داد و تحسین پیش کی۔ نشست میں خورشید علیگ، احمد عادل، رخسار ناظم آبادی، شیرازی مہدی، طاہر عظیم، ریاض شاہد، عدنان تنہا، فیضی اعظمی، سعید سعدی، اسد اقبال، کپل بترا، سمیع اللہ حامد، عمران فراق نے عمدہ طرحی غزلیں پیش کیں۔ شعرا کی بہترین شاعری کو سامعین نے بہت دلچسپی سے سنا اور ایک ایک شعر پر خوب داد دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2017

■

بحرین میں طرحی نشست کا منظر

تاریخ ادب اردو کی تکمیل کونسل کی بنیادی ذمے داری: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تاریخ ادب اردو، انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف میٹنگ کا انعقاد

نئی دهلی: اردو ادب، تاریخ ادب اردو مونوگراف اور دیگر ادبی مسائل و متعلقات کے حوالے سے لٹریچر پینل بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پینل کے تحت انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف جیسے موضوعات کو ایک مقررہ مدت میں پورا کرلینا بہت بڑی بات ہے۔ اس پینل کے تحت سال میں دو مرتبہ کارکردگی کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ اس میٹنگ میں بھی کئی اہم فیصلے لیے گئے۔ بالخصوص نئے مونوگراف کو منظوری دی گئی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ تاریخ ادب اردو، انسائیکلوپیڈیا اور مونوگراف پینل کی میٹنگ میں یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ تاریخ ادب اردو کی تکمیل کونسل کی بنیادی ذمے داری ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر انصار اللہ کے انتقال پر تعزیتی نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اظہار تعزیت کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل کے حوالے سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ ان کی سب سے بڑی خدمت تاریخ ادب اردو پر مشتمل 9 جلدیں ہیں جو اردو قارئین کے لیے ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی۔ انھوں نے اس پینل کے تحت کیے گئے کاموں کی تعریف کی اور کہا کہ کام کرنے کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہا تو کونسل ادب کے حوالے سے ایک بڑا ذخیرہ اردو قارئین کی خدمت میں پیش کرسکتی ہے۔

میٹنگ میں پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر شہناز نبی، محترمہ منوری بیگم کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب امتیاز احمد (ریسرچ اسسٹنٹ)، ساجد الحق (ٹیکنکل اسسٹنٹ)، ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 اکتوبر 2017

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو، عربی و فارسی فاصلاتی تعلیم کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دهلی: قومی اردو کونسل، اردو زبان کے فروغ کے لیے کئی جہتوں پر کام کر رہی ہے۔ انھیں میں سے ایک اہم

کام فاصلاتی تعلیم بھی ہے۔ موجودہ حکومت جہاں اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن مدد دینے کو تیار ہے وہیں کونسل کو یہ مینڈیٹ بھی ملا ہے کہ کلاسیکی زبانوں کے عربی و فارسی فروغ کا التزام کیا جائے۔ تینوں زبانوں کے فروغ کے لیے ملکی سطح پر جو مراکز کام کر رہے ہیں ان کے اعداد و شمار سے کونسل کی فعالیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس وقت اردو یک سالہ ڈپلومہ کے 324 اضلاع میں 811 مراکز ہیں۔ یک سالہ عربی سرٹیفکیٹ ڈپلومہ کے 368 مراکز ہیں۔ دو سالہ فنکشنل عربی ڈپلومہ کے 327 مراکز ہیں۔ یک سالہ فارسی ڈپلومہ کے 24 مراکز ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ فاصلاتی تعلیم کی سالانہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ رواں مالی سال کے بجٹ کے پیش نظر لگ بھگ 60 نئے مراکز کھولنے کی تجویز کو پینل کے موجودہ ممبران نے منظوری دی ہے۔ واضح ہو کہ اس پینل میں ملک کے طول و عرض سے ممبران تشریف لاتے ہیں اور انتہائی غور و خوض کے بعد پوری شفافیت کے ساتھ نئے سینٹرس کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس میں ترجیحی طور پر ان علاقوں کو شامل کیا جاتا ہے جہاں ایسے مراکز قائم نہیں ہیں۔ آج کی میٹنگ کی صدارت محترمہ منوری بیگم نے کی۔ انھوں نے کونسل بالخصوص فاصلاتی تعلیم کے حوالے سے کونسل کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر قاسم خورشید نے بھی کونسل کی شرائط سے ہٹ کر کسی بھی طرح کے سمجھوتے سے انکار کیا۔ کشمیر سے تشریف لائیں پروفیسر نیلوفر خان نے فاصلاتی تعلیم کے حوالے سے کئی اہم مشورے دیے۔ ممبران نے اس موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کی کہ اساتذہ کی تنخواہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے 50 فیصد بڑھائی جائے تاکہ اساتذہ پوری دل جمعی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے سکیں۔

میٹنگ میں محترمہ منوری بیگم، پروفیسر نیلوفر خان، پروفیسر اسرائیل رضا، پروفیسر وجے دیو سنگھ، ڈاکٹر علی امام، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر فاروق انصاری، محمد خورشید صدیقی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) جناب سرور سعید (ریسرچ اسسٹنٹ)، ڈاکٹر جاوید اقبال (ٹیکنکل اسسٹنٹ) جناب انوار الحق، ڈاکٹر فیاض عالم اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 نومبر 2017

کتابیں سماج کا ہی نہیں بلکہ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا بھی آئینہ ہیں: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل تھوک خریداری اسکیم کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دهلی: کتابیں سماج کا ہی نہیں بلکہ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا بھی آئینہ ہیں۔ اس لیے عہد حاضر میں کتابوں کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں۔ اس حوالے سے کونسل تھوک خریداری اسکیم کے تحت ہر سال اردو کی معیاری کتابیں خریدتی ہے جس کا مقصد اردو کے قلم کارو ں کی حوصلہ افزائی ہے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ تھوک خریداری اسکیم کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتابوں کی طباعت میں کافی اخراجات آتے ہیں اور بڑھتی مہنگائی میں کتابوں کی اشاعت ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس لیے کونسل ایسے لکھنے والوں کی مالی اعانت کرتی ہے تاکہ پوری دلجمعی کے ساتھ قلمکار حضرات اپنی خدمات اردو کے فروغ کے لیے پیش کرتے رہیں۔ آج کی میٹنگ میں جن موضوعات پر مشتمل کتابوں کی خریداری ہوئی ہے ان میں سوانح، ادب اطفال، تخلیقی ادب، شاعری، لغات، سائنس و سماج علوم، جنرل نالج، تنقید، مذہب، عربی و فارسی کتابوں کے علاوہ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد شامل ہیں۔

میٹنگ کی صدارت جناب چندر بھان خیال نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کتابوں کی خریداری میں کونسل دو باتوں کو سامنے رکھتی ہے ایک تو معیاری ہوں اور دوسرے ان علاقوں کے لکھنے والے ہوں جہاں ابھی اردو کے چراغ روشن کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس موقعے پر دیگر ممبران نے بھی اس حوالے سے مفید گفتگو کی۔

میٹنگ میں پروفیسر انوارالدین، چودھری ابن النصیر، پروفیسر علیم اشرف خاں، ڈاکٹر نعمان خان، ڈاکٹر محمود فیاض، حاجی محمد اقبال خان، محترمہ صادقہ نواب سحر کے علاوہ کونسل کے پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال،

محترمہ شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم، ساجدہ خاتون، فرح دیبا، محمد اقبال اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 اکتوبر 2017

مالی تعاون اسکیم کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل اردو کے فروغ کے لیے مختلف سطحوں پر جو خدمات انجام دے رہی ہے اور جس تیزی سے ترقی کی سمت قدم بڑھا رہی ہے اس سے اردو کا ہر شیدائی واقف ہے۔ کونسل کے حسن کارکردگی سے حکومت ہند بھی مطمئن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل کے سالانہ بجٹ میں ہر سال اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس ادارے کو دنیا کا سب سے بڑا اردو ادارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس ادارے کی کارکردگی کی تحسین صرف اندرونِ ملک میں نہیں بیرونی ممالک تک کی جاتی ہے۔

کونسل کی مالی تعاون اسکیم کا مقصد اردو کے فروغ کے لیے ہندوستان کے ہر کونے تک پہنچنا ہے۔ کونسل ہر سال مختلف اسکیموں کے تحت ادیبوں اور مختلف رضا کار تنظیموں اور دیگر اداروں کو مالی تعاون فراہم کرتی ہے۔ اس حوالے سے سمینار، توسیعی خطبات، مشاعرے، سمپوزیم، پروجیکٹ اور لیکچر سیریز وغیرہ کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ کونسل چاہتی ہے کہ اس کا فیض ہر اس علاقے تک پہنچے جہاں اب تک رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ مالی تعاون اسکیم کی میٹنگ میں کہیں۔

اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پینل کے ذریعے اردو کا ایک بڑا علاقہ فیضیاب ہورہا ہے۔ اس کوشش کو ہمیں جاری رکھنا ہے۔ آج کی میٹنگ میں مالی اعانت کے حوالے سے جو بھی درخواستیں موصول ہوئیں اس پر پوری ایمانداری اور شفافیت کے ساتھ فیصلے لیے گئے۔

میٹنگ میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر قدسیہ انجم، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر مشتاق احمد، جناب حسن ضیا کے علاوہ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم، سید مجیب احمد، ڈاکٹر توقیر راہی، جاوید احمد انصاری اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 اکتوبر 2017

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

ترقی پسند اردو افسانہ کا آغاز وارتقا

راجوری/ بی جی کالج راجوری میں 2 روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کیا گیا۔ 'ترقی پسند اردو افسانہ کا آغاز و ارتقا' موضوع پر منعقدہ اس کانفرنس کا اہتمام کالج کے شعبہ اردو نے کیا ہے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل تھے۔ ضلع ترقیاتی کمشنر راجوری ڈاکٹر شاہد اقبال چودھری، قطر سے ڈاکٹر شہاب الدین، پروفیسر قدوس جاوید بھی موجود تھے۔ موضوع کی مناسبت سے مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ایم کے وقار اور ڈاکٹر عبدالحق نعیمی نے تفصیل سے موضوع پر روشنی ڈالی۔

کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جاوید احمد قاضی نے عصر حاضر میں اردو شاعری اور افسانہ کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈگری کالج سینڈھر کے پرنسپل پروفیسر شبیر حسین شاہ، ڈگری کالج تھنہ منڈی کے پرنسپل پروفیسر شکیل رینا، پروفیسر ایم بی ماگرے، پروفیسر رشید چودھری، محمد شفیع ذاکر اور دیگر فیکلٹی ممبران اور طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'اڑان' جموں وکشمیر 10 ستمبر 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

ہندوستان کی تعمیر میں اقلیتوں کی شرکت

نئی دھلی: حکومت اقلیتوں کو یکساں مواقع مہیا کرانے کی پابند ہے، اسی کے تحت تعلیم کے شعبے میں کام ہوا ہے

مگر ابھی بھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سماج کے سبھی طبقوں کے لوگوں کو معیاری تعلیم مہیا کرانے کے مقصد کے تحت آئندہ سال ملک کے اقلیتی اکثریتی علاقوں میں 100 سینٹرل اور نوودیہ ودیالیہ کھولے جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے کیا۔ وہ کانسٹی ٹیوشن کلب میں غریب نواز ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ کونسل کے زیر اہتمام علما و دانشوروں کے قومی اجلاس 'نئے ہندوستان کی تعمیر میں اقلیتوں کی شرکت' سے خطاب کر رہے تھے۔ اس اجلاس کی صدارت صدر انجمن خدام خواجہ سید زادگان، درگاہ اجمیر شریف الحاج سید معین حسین چشتی نے کی۔ اس موقعے پر مختار عباس نقوی نے کہا کہ اقلیتی کمیونٹی کی تعلیم کے لیے کافی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقلیتی وزارت نے پچھلے دنوں تعلیم کو لے کر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کی سفارشات آگئی ہیں اور اب انھیں نافذ کیا جارہا ہے۔ اس موقعے پر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، جودھپور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جب جب موقع ملا ہے انھوں نے اس ملک کی عظمت میں چار چاند لگائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کا مسلمان اس ملک کی ترقی میں اپنی حصہ داری چاہتا ہے بھیک نہیں۔ اس سے قبل کانفرنس کا آغاز قاری فضیل کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جبکہ مفتی شمیم رضا صابری نے نعت پاک پڑھی۔ نظامت کے فرائض قاری محمد میاں مظہری نے انجام دیے، اس موقعے پر این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم ، سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، مولانا سید واحد حسین چشتی، مولانا زاہد رضا قادری، مولانا عثمان غنی قادری، مولانا شہاب الدین رضوی، مفتی ضمیر الدین صابر، مولانا تخی خاں راٹھور، مولانا محمد اسلم رضوی، مولانا ایس حسن قادری سمیت دیگر معزز شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اکتوبر 2017

دنیا کے لیے ہندوستان معیاری تعلیم کا 'ہب' بن رہا ہے

نئی دھلی: ہندوستان معیاری تعلیم کا 'ہب' بن رہا ہے، اسی لیے دنیا کے سبھی ممالک کے نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے یہاں بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ تعلیم ہی

کسی ملک اور معاشرے کی ترقی کا ضامن ہے، ہندستان میں اقلیتوں سمیت سبھی طبقوں کی تعلیمی کفالت کے تئیں مضبوطی سے کام ہورہا ہے۔ سرکار کا ہدف تعلیمی امپاورمنٹ کو فروغ دینے کے ساتھ مدارس کو جدید تعلیم سے آراستہ کر کے ملک کے ہر طبقے کے بچے تک تعلیم پہنچانا ہے۔ یہ باتیں مرکزی وزیر اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے کہیں۔ وہ ملیشیا کے نمائندہ وفد سے ملاقات کے بعد صحافیوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ملیشیا میں تعلیم کے شعبے میں کام کر رہی تنظیم 'پنٹا' کے 7 رکنی وفد نے قومی خطہ راجدھانی واقع انتودیہ بھون میں مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور سے ملاقات کی۔ اس موقعے پر مختار عباس نقوی نے اراکین وفد کو بتایا کہ مودی سرکار کی پچھلے تین سال کی مدت کے دوران تعلیم حاصل کرنے ہندستان آنے والے غیر ملکی طلبا کی تعداد میں بڑے پیمانہ پر اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرکار نے بڑی تعداد میں مدارس کو '3 ٹی'، ٹیچر، ٹفن، ٹوائلٹ سے جوڑ کر انھیں مین اسٹریم اور جدید تعلیمی نظام میں شامل کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر مہم چلائی ہے۔ مختار عباس نقوی نے کہا کہ اسی طرح سماج کے سبھی کمزور طبقوں کے لیے '3 ای'، ایجوکیشن، امپلائمنٹ، امپاورمنٹ کا تعلیمی منصوبہ شروع کیا تاکہ وہ تعلیم کے شعبے میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ روزگار پاسکیں۔ اس موقعے پر پنٹا کے نمائندہ وفد کی مسٹر نقوی سے ملاقات کے دوران اقلیتی سماج کی تعلیمی خود کفالت کے مختلف پروگراموں پر غور وخوض کیا گیا۔

دوران ملاقات اراکین وفد نے بتایا کہ ہندوستان کی طرح ملیشیا میں بھی سبھی مذاہب کے لوگ مل جل کر تعلیم و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وفد نے مرکزی سرکار کے ذریعے مدارس کو مین اسٹریم اور جدید تعلیم نظام میں شامل کرنے کی کوششوں کی بھی تعریف کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اکتوبر 2017

اے ایم یو کے بانی کا دوصد سالہ یوم پیدائش

علی گڑھ: مصلح قوم و بانی درسگاہ سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ یوم پیدائش نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال گراؤنڈ میں منعقد عظیم الشان جلسے

سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی سابق صدر جمہوریۂ ہند پرنب مکھرجی نے کہا کہ سرسید احمد خاں ایک عظیم مفکر اور جدید سائنسی تعلیم کے مبلغ تھے اور انھوں نے اپنی دور بینی سے ہندوستان کے سامراجیت سے دوچار سماجی منظرنامے کو جدید جمہوری اقدار سے مزین کرنے میں اہم رول ادا کیا، سرسید کے ذریعے علم کا بویا ہوا یہ بیج آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اب ادارے سے محبت رکھنے والے لوگوں کی ذمے داری ہے کہ اس درخت کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلائیں، دورِ حاضر کے تناظر میں ہمیں سرسید کے مشن کے بنیادی عناصر پر گہرائی کے ساتھ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ وقت کی ضرورت ہے کہ سرسید کے ذریعے شروع کیے گئے مشن کو تقویت دی جائے۔ کیونکہ یہی اس ملک کو عظیم ممالک کی صف میں شامل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سرسید نے کالجوں کے قیام اور جرائد کی اشاعت کے توسط سے مغربی تعلیم کے اہم عناصر کو سائنسی تعلیم کے تناظر میں فروغ دینے کے لیے کوشش کی اور تعلیم کے فروغ کو ہی اپنا مشن بنایا۔ پرنب مکھرجی نے اے ایم یو آفاقی اور وسیع المشرب قومیت کی مثال قرار دیا اور کہا کہ جہاں مختلف مذاہب، ذاتوں، زبانوں اور علاقوں کے طلبا ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہوں وہیں سے ہم آہنگی کا پیغام عام ہو سکتا ہے۔ سرسید ایک مسیحا تھے جنھوں نے اپنی دوراندیشی اور اپنی فکر سے اس عظیم ملک میں سائنسی فکر کی روایت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے حال ہی میں اے ایم یو کے لیے 90 کروڑ روپیہ کی مالی گرانٹ منظور کی ہے۔ جس سے مختلف میدانوں میں ترقیاتی منصوبوں کو آسانی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ اعلیٰ معیاری تعلیم اور تحقیق کو فروغ دیں۔ یوم سرسید کے موقعے پر امریکہ کے ممتاز دانشور پروفیسر ڈیوڈ لیلی ویلڈ کو عالمی اور جسٹس سہیل اعجاز صدیقی کو قومی سطح کے سرسید کی یاد میں قائم 'سرسید ایکسیلینس ایوارڈ 2017' سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر ڈیوڈ لیلی ویلڈ مصروفیت کی وجہ سے علی گڑھ نہیں پہنچ سکے ان کی جگہ پروفیسر شافع قدوائی نے ایوارڈ وصول کیا۔

جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سرسید مطالعات کا سب سے اہم حصہ ان کی فکر کا مطالعہ ہے جس کے تحت انھوں نے تعلیم کے توسط سے ملک کے سیکولر اور کثیر الجہات کردار کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی حصہ لیا۔ وہیں قومی سطح پر منعقد مضمون نویسی مقابلہ میں فاتح طلبہ کو یادگاری نشان، توصیفی سند اور نقد انعامات سے سرفراز کیا گیا جس کے تحت چانکیہ نیشنل لا یونیورسٹی پٹنہ کے طالب علم راج وردھن تیواری کو اول انعام جبکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم کیف صدیقی کو دوئم اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی رائے پور کی طالبہ انوشا پلے کو سوئم انعام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اول، دوئم اور سوئم انعام کے لیے بالترتیب 25 ہزار، 15 ہزار اور 10 ہزار روپیہ اور توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔ اظہار تشکر ڈین اسوڈینٹس ویلفیئر پروفیسر جمشید صدیقی نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شارق عقیل اور ڈاکٹر فائزہ عباسی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2017

جشن ادب 2017

نئی دہلی: قومی دارالحکومت کے مشہور شاہراہ جن پتھ پر واقع اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹ (آئی جی این سی) کے سبزہ زار پر جشن ادب 2017 کے عنوان سے ہندی اور اردو کے عاشقوں کی سب سے بڑی محفل منعقد ہوئی۔ کلاسیکل گلوکار پنڈت چنو لال مشرا، مشہور قوال استاد احمد حسین محمد حسین نے اپنے فن کا جلوہ دکھایا۔ دیر شام شروع ہوئے اس پروگرام میں بڑی تعداد میں ہندی اور اردو (ہندوستانی زبان) کے عاشقوں نے شرکت کی۔ آئی جی این سی کے کھلے میدان میں منعقدہ اس پروگرام میں نہ صرف ہر طبقے کے لوگ شامل ہوئے بلکہ اردو اور ہندی کی اس خوبصورت محفل سے مسحور بھی نظر آئے۔ مذہب کی بندشوں سے آزاد صرف اردو کی تہذیبی روایتوں کا جلوہ تھا۔ بزرگ چہرے بھی دکھے تو جوان بچے اور بچیاں بھی کان لگائے اردو اور ہندی کے جشن میں آنکھ ٹکائے اور کان لگائے محظوظ ہوتے نظر آئے۔ خواتین اور دوشیزاؤں کا جمگھٹا تھا۔ جلسہ گاہ میں لذیذ ذائقوں کے بڑے بڑے اسٹالز لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ دوسرے پہلو پر اردو کتابوں، آرٹ، دستکار اور دیگر مہارتوں (اردو سے متعلق) کے اسٹالز نصب کیے گئے تھے۔ جشن ادب کا افتتاح سیاحت و ثقافت کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مہیش شرما نے کیا۔ اردو تہذیب کی محفل میں آتے ہی کابینہ کے وزیر بھی قومی یکجہتی اور مختلف رنگوں کی خوبصورتی دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب نے وطن عزیز کے 125 کروڑ باشندگان کو ایک دھاگے میں موتیوں کی طرح پرو رکھا ہے، جو اس ملک کی پہچان ہے۔ 'جشن ادب' کے منتظمین کو مبارک باد دیتے ہوئے ڈاکٹر شرما نے کہا کہ شاعر، مصنف، اداکار اور فنکاروں کی ذمہ داری بہت اہم ہوتی ہے، کیونکہ وہ سماج کا آئینہ ہوتے ہیں اور ایسی ادبی و ثقافتی وراثت سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

'فنکار کا مذہب نہیں ہوتا': اردو اور ہندی کے مشترکہ اسٹیج پر سیاسی اور مذہبی نظریات سے بالاتر ہو کر لوگوں نے شرکت کی۔ پروگرام کے دوران ڈاکٹر کرن سنگھ نے بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک انسان کی پوری زندگی 'ستیم شیوم سندرم' پر مشتمل ہے، مگر لازمی ہے کہ سچ سے عمل کیا جائے۔ پروگرام کے شروع میں جشن ادب کے مقاصد بیان کرتے ہوئے 'جشن ادب' کے بانی رکن رنجیت سنگھ چوہان نے کہا کہ میں نے صرف ادب کی خدمت کے تعلق سے یہ محفل سجائی ہے، میری کوشش ہے کہ ادب و تہذیب سے دور ہوتی نئی نسل کو ادب سے روشناس کرایا جائے۔ جشن ادب کے صدر قیصر خالد (آئی پی ایس) نے کہا کہ موجودہ وقت میں ادب پر کام کرنا بے حد مشکل ہے۔ معروف شاعر اور صحافی اشوک چکردھر نے

’جشن ادب 2017‘ کا افتتاح کرتے ہوئے سیاحت وثقافت کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مہیش شرما

اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے ایسے پروگراموں کو وقت کی اہم ضرورت بتایا۔ اس موقعے پر کلاسیکل گلوکار پنڈت چنولال مشرا، مشہور قوال استاد احمد حسین محمد حسین، معروف ادیب ڈاکٹر بچی وانند و دیگر نے بھی اظہار خیال کیا اور پروگرام کی تعریف کی۔ پروگرام میں اردو اور ہندی سمیت ادبی شعبہائے حیات سے وابستہ نامور اور اہم شخصیات شریک ہوئیں۔

جشن میں ’جدید اردو شاعری کا سفر‘ کے عنوان سے پروفیسر ارتضی کریم اور پروفیسر کوثر مظہری نے اظہار خیال کیا، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے جدید اردو شاعری کے حوالے سے کہا کہ موضوعاتی اور اسلوبی سطح پر جدید شاعری میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں اور جدید شاعری میں بہت سے ایسے نام ہیں جو معاصر شعری منظرنامے میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شاعروں نے مختلف سطح پر شاعری کو تغیرات اور تبدیلیوں سے آشنا بھی کیا ہے۔ اس پروگرام کے ماڈریٹر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر خالد مبشر تھے۔

ہندی اور اردو کا جشن ادب 2017 پوری آب و تاب کے ساتھ اختتام پزیر ہوا۔ روشنی سے نہائے اور رنگارنگ نظاروں سے بھرپور آئی جی این سی کے سبزہ زار میں 2 روز سے چل رہے اس جشن میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی زبان ہندی اور اردو کے عاشقوں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ لطف بھی اٹھایا۔ پورے جشن میں مختلف موضوعات اور ادبی پہلوؤں پر بات ہوئی۔ کہیں شاعری کی محفل لگی تو کہیں ادیبوں کی۔ نوجوانوں کو الگ اسٹیج دیا گیا۔ بزرگ ادیبوں کو سننے کے لیے بھیڑ نظر آئی۔

جشن ادب کے تیسرے دن کے سیشن کی شروعات شاعری اور فلمی شاعری سے ہوئی جس میں فلم نگری سے آئے ارشاد کامل نے تفصیل سے فلم اور شاعری پر بات چیت کی۔ اس کے بعد گیت اور سنگیت کے پروگرام ہوئے۔

دوپہر کے بعد غزل گائیکی کا پروگرام ہوا جسے شکیل احمد نے پیش کیا۔ غزل گائیکی کے اس پروگرام نے جشن میں ایک عجیب سے خوبصورتی بکھیر دی۔ جشن ادب کے صبح کے پروگرام میں دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا بھی پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی مواد سماج سے آتا ہے، کسی بازار یا سرکار میں اتنی اوقات نہیں کہ وہ مواد دے سکے، یہ کوئی شاعر یا ادیب ہی کرسکتا ہے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 28و30 اکتوبر 2017

رول آف لائبریریز اینڈ انفارمیشن سینٹرز

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایشین لائبریری کا دوسرا ایکسپینڈنگ ڈیجیٹل فوٹ پرنٹس: رول آف لائبریریز

اینڈ انفارمیشن سینٹرز کے موضوع پر سہ روزہ سیمینار کا انعقاد انتہائی تزک و احتشام کے ساتھ ہوا جس میں دنیا بھر کے ماہرین اور لائبریری سائنس سے وابستہ شخصیات نے شرکت کی۔

اس موقعے پر اپنے افتتاحی اجلاس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ ڈیجیٹل عہد میں ضرورت اس بات کی ہے کہ کتابوں کو بھی ڈیجیٹلائز کیا جائے اور اسے مزید خوشنما، قابل استعمال اور آسان بناکر پیش کیا جائے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھاسکیں۔ انھوں نے اس موقعے پر طلبا اور محققین کو بھی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق و تصنیف میں شارٹ کٹ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے تخلیقی اور بین الاقوامی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے علمی سرقہ جیسی قبیحات سے اجتناب کریں۔ اس موقعے پر جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر سید احتشام حسنین نے کہا کہ ہر محقق کو لائبریری سائنس کا بنیادی علم ہونا ضروری ہے۔ اس وقت ساری چیزیں اوپن ہوگئی ہیں، گوگل اور دیگر ریسرچ اور کھوج کی تکنیک ایجاد ہورہی ہیں ایسے میں اس کی واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ آپ بہتر انداز میں علم و تحقیق کا کام انجام دے سکیں۔ افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر جنرل راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن کولکاتا کے ارون کمار چکرورتی نے ڈیجیٹل عہد کو ایک چیلنج قرار دیتے ہوئے کہا کہ فی زمانہ علم کے لیے پیروں کی مسافت گرچہ کم ہوگئی ہے لیکن انگلیوں کی مسافت بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ قاری کی تعداد کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائبریرین پروفیسر حسن جمال عابدی نے افتتاحی کلمات پیش کیے، جبکہ کلمات تشکر دہلی یونیورسٹی ساؤتھ کیمپس کے پروفیسر طارق اشرف نے ادا کیے۔ اس موقعے پر لائبریری سائنس میں پروفیسر جمال عبدالواحد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 27 اکتوبر 2017

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ کمپیوٹر سائنس میں ’سنگ میل 2017‘ کے تحت ایلومنائی میٹ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ کمپیوٹر سائنس کے زیر اہتمام ’سنگ میل 2017‘ کے عنوان سے ایلومنائی میٹ منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈین آف فیکلٹی نیچرل سائنس پروفیسر شریف احمد نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر معروف سائنس داں پروفیسر ٹی پی سنگھ نے شرکت کی جبکہ اعزازی مہمانان کے طور پر نوجوان ایلومنائی فیصل عابدی اور راغب عابدی موجود تھے۔ اس موقعے پر اندرا گاندھی ٹیکنکل یونیورسٹی فار ویمنس میں رجسٹرار اور جامعہ سے سال 2008 میں پی ایچ ڈی کرنے والے

کامیاب الیومنائی ڈاکٹر سید کاظم نقوی کو کامیاب الیومنائی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ استقبالیہ تقریر میں شعبۂ کمپیوٹر سائنس کے صدر پروفیسر ڈاکٹر سید افضال مرتضیٰ رضوی نے فیوچر آف آئی ٹی اینڈ ہیومن ریسرچ تھیم پر بات کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہر علم بہرحال انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ہی ہے ہمیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں۔ آئی ٹی کا کام سافٹ ویئر اور آٹومیشن کے ذریعے معیار اور طرز زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے شعبہ کے طلبہ وطالبات نے سافٹ ویئر پروفیشنل کی حیثیت سے سیدھے طور پر اپنی خدمات پیش کرنے میں مہارت حاصل کی ہے جو کہ موجودہ وقت میں تعمیر ملک میں سنگ میل ثابت ہو رہے ہیں۔ پروفیسر ٹی پی سنگھ نے کہا کہ بایو انفارمیٹک اور بایو سائنس میں ہندوستانی سائنس دانوں کا جو تعاون رہا ہے اس کی فہرست طویل ہے۔ انھوں نے کہا کہ آئی ٹی کا استعمال بایو انفارمیٹک ریسرچ کا میدان بہت وسیع ہے اور اس کا مستقبل بھی روشن ہے۔ اس موقعے پر الیومنائی راغب خان اور فیصل عابدی کو آئی ٹی کمپنی قائم کرنے پر جس میں تقریباً 250 ملازمین کام کرتے ہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف احمد نے صدارتی خطبہ پیش کیا جبکہ منصب علی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 نومبر 2017

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'فرد اور کتابیں' 'کتھا سندھی' پروگرام کا انعقاد

نئی دهلی: کتابیں انسان کی سچی دوست ہوتی ہیں۔ ان کی ہماری زندگی میں خاص اہمیت ہے۔ یہ دراصل ذہنوں میں انقلاب کی فضا پیدا کرتی ہیں، معلومات میں اضافہ کرتی ہیں اور ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'فرد اور کتابیں' پروگرام میں ممتاز اسکالر و جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر سید شاہد مہدی نے کیا۔ شاہد مہدی نے اس پروگرام میں جن کتابوں کا ذکر کیا وہ ہیں، لن یوتانگ کی 'جینے کی اہمیت'، ہرمن ہسے کی سدھارتھ اور نسیم انصاری کی 'جواب دوست'۔ انھوں نے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ کتابوں سے عرفان کی تلاش پوری ہوتی ہے۔ کتابیں صرف دلچسپی کے لیے نہیں پڑھنی چاہئیں بلکہ اس سے کچھ حاصل کرنے کی نیت بھی رکھنی چاہیے۔ 'کتھا سندھی' پروگرام کے تحت علی گڑھ سے معروف افسانہ نگار جناب احمد رشید کو مدعو کیا گیا تھا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب چندربھان خیال نے مہمانوں کا مختصر تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اس پروگرام کے اغراض و مقاصد سے سامعین کو باور کرایا نیز ساہتیہ اکادمی اور محمد موسیٰ رضا کو پروگرام کے کامیاب انعقاد کے لیے مبارک باد دی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 اکتوبر 2017

نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کا قیام

نئی دهلی: بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم کا افتتاحی اجلاس غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین دہلی میں ہوا جہاں ملک کی مشہور و معروف فکشن نگاروں کے ساتھ ساتھ

اردو کی اسکالرز نے شرکت کی۔ اس موقعے پر بولتے ہوئے بنات کی صدر مشہور افسانہ نگار نگار عظیم نے کہا کہ دراصل 'بنات' کی بنیاد عظیم آباد میں رکھی گئی تھی۔ پٹنہ میں نسائی ادب پر دو سیمینار ہوئے۔ بہار اردو اکادمی کے سیمینار میں خواتین کے اندر اتنا جوش بھرا تھا کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ملاقات کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ہم نے ایک دوسرے سے باتیں کیں اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سب اس بات سے متفق تھے کہ ہماری ایک تنظیم ہونی چاہیے۔ ہمیں خوشی ہے کہ صرف ہندوستان نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ہماری آواز کا خیر مقدم کیا گیا۔ مشہور افسانہ نگار افشاں ملک نے کہا کہ بنات کا پلیٹ فارم ہم سب کے لیے ایک انقلاب ثابت ہوگا۔ بنات کی نائب صدر مشہور شاعرہ عذرا نقوی نے اس موقعے پر اپنی نظم پیش کی۔ بنات کی سرپرست بلقیس ظفیر الحسن نے 'بنات' کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا۔ ذکیہ مشہدی نے پٹنہ سے تہنیت کا پیغام بھیجا، انجم قدوائی نے بنات کے فروغ پر زور دیا۔ ان کے علاوہ مشہور افسانہ نگار اور بنات کی جنرل سکریٹری تسنیم کوثر، مشہور افسانہ نگار اور نقاد ثروت خان، سیما صغیر، قمر قدیر ارم، نعیمہ جعفری پاشا، ثریا جبیں، شازیہ عمیر، غزالہ قمر اعجاز، نرگس سلطانہ، مینا نقوی، ترنم جہاں شبنم، رضیہ حیدر خان، آصف اظہار، صبیحہ سنبل، چشمہ فاروقی نے اپنے خیالات رکھے۔ سفینہ، افسانہ حیات نے ادبی مسائل پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر منتخب کابینہ کا اعلان کیا گیا۔

سرپرست بلقیس ظفیر الحسن، رفیعہ شبنم عابدی، شہناز کنول غازی، ذکیہ مشہدی، صبیحہ انور، بانو سرتاج، رضیہ حامد، انور نزہت، سیدہ شان معراج، قمر جمالی، قمر جہاں، شائستہ یوسف، حلیمہ فردوس، رخسانہ جبیں۔ صدر: نگار عظیم، نائب صدر: عذرا نقوی، خازن: ثروت خان، جنرل سکریٹری: تسنیم کوثر، سکریٹری: تبسم فاطمہ، سکریٹری: نسترن فتیحی مرکزی کابینہ: غزال ضیغم، قمر قدیر ارم، عشرت ناہید، نصرت شمسی، انجم قدوائی، کہکشاں تبسم، ثریا جبیں، شائستہ انجم نوری، رضوانہ پروین، افسانہ خاتون، افشاں ملک، روبینہ شبنم، ریتو بہل، ملکہ نسیم، تسنیم خانم، حسن آرا، نصرت مہدی، شبنم عشائی، سیدہ نکہت فارق، مہر افروز، فریدہ رحمت اللہ، آمنہ تحسین، شبینہ فرشوری، صادقہ نواب سحر، ہاجرہ بانو، امیر النساء، شمع افروز زیدی، نعیمہ جعفری پاشا، نور ظہیر، شبانہ نذیر، عفت زریں، غزالہ قمر اعجاز، وسیم راشد، سفینہ۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2017

ڈوڈل کے ذریعے اردو ادیب عبدالقوی دسنوی کو خراج عقیدت

ممبئی: سرچ انجن گوگل نے اردو نوازی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنے ڈوڈل کے ذریعے اردو کے مشہور

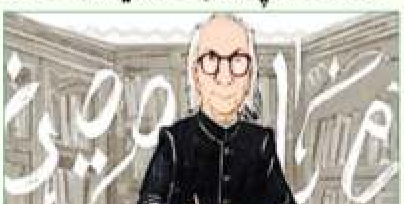

مصنف اور ادیب و شاعر عبدالقوی دسنوی کی 87 ویں سالگرہ کے موقعے پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ سے اردو حلقوں میں مسرت کی ایک لہر پائی جا رہی ہے۔ مرحوم دسنوی نے ہندوستان میں اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور پانچ دہائیوں سے زیادہ عرصے کے دوران کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ سید سلیمان ندوی کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے عبدالقوی دسنوی کا

انتقال 7 جولائی 2011 کو ہوا۔ ان کے اعزاز میں گوگل نے اپنی علامت ڈوڈل (لوگو) کو اردو اسکرپٹ میں ڈیزائن کیا ہے اور ساتھ ہی ان کا اسکیچ بھی رکھا ہے۔ مرحوم دسنوی نے اردو ادب میں کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ عبدالقوی دسنوی کی ولادت بہار کے ایک معروف علاقے دیسنہ میں 1930 میں ہوئی تھی۔ یہ بہار کے نالندہ ضلع میں آتا ہے۔ ان کا خاندان نامور عالم دین سید سلیمان ندوی سے تعلق رکھتا ہے۔ دسنوی سید محمد سعید رضا کے فرزند تھے جو سینٹ زیویرس کالج، ممبئی میں اردو، عربی اور فارسی زبان کے پروفیسر تھے۔ دسنوی کے دو بھائی تھے۔ پروفیسر سید محمد محی رضا بڑے بھائی تھے جبکہ سید عبدالوالی چھوٹے تھے۔ ان کے صاحبزادے اے ایم دسنوی ایک عرصے تک ممبئی میں واقع بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر میں بطور سائنس داں اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بہار کے آرا میں مکمل کی اور سینٹ زیویرس کالج، ممبئی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن اول درجے میں مکمل کیا۔ وہ فروری 1961 میں سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ وہیں وہ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو بھی بنے۔ انھیں ایک ادیب کے طور پر شہرت ملی۔ وظیفے کے بعد وہ کئی اعزازی عہدوں پر فائز ہوئے جن میں جوائنٹ پرنسپل (سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال)، معتمد (مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال)، منتخب رکن (انجمن ترقی اردو، ہندی)، رکن (آل انڈیا انجمن ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی)، صدر نشین بورڈ آف اسٹڈیز، اردو، فارسی و عربی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال)، ڈین (فیکلٹی آف آرٹس، برکت اللہ یونیورسٹی) اور رکن مجلس عاملہ (تاج المساجد، بھوپال) قابل ذکر ہیں۔

ان کی کتابوں میں یادگار سلیمان، ایک شہر پانچ مشاہیر، اقبال انیسویں صدی میں، متاع حیات (سوانح)، بمبئی سے بھوپال تک، اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، ابوالکلام آزاد، اقبال کی تلاش، اقبال اور دارالاقبال بھوپال، مطالعہ غبار خاطر، تلاش و تاثر، سات تحریریں، مطالعہ خطوط غالب، بھوپال اور غالب، علامہ اقبال بھوپال میں، حسرت کی سیاسی زندگی اور ایک اور مشرقی کتب خانہ ہیں۔ مرحوم دسنوی 1990 میں پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال سے ریٹائرڈ ہوئے۔ شاعر اور نغمہ نگار جاوید اختر اور اقبال مسعود سمیت ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2017

دھلی

نظمی سکندر آبادی کی یاد میں مشاعرہ

نئی دھلی: شمال مشرقی ضلع کے سبھاش محلہ نارتھ گھونڈہ میں (شیشے والی مسجد کے سامنے) بزم سخن کے زیر اہتمام معروف شاعر نظمی سکندر آبادی کی یاد میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مہمان بزرگ شاعر احمد جلیسری اور نظامت معروف شاعر و نقاد شمس رمزی نے کی۔ اس موقعے پر بحیثیت مہمانان خصوصی کے طور پر دہلی سرکار کے وزیر گوپال رائے، سیلم پور ایم ایل اے حاجی اشراق خان، ریکھا تیاگی (کونسلر سبھاش محلہ)، بھوپیندر سنگھ نے بھی شرکت کی اور مشترکہ طور پر مشاعرے کی شمع روشن کی۔ بزم سخن کی طرف سے مہمانان خصوصی کے ہاتھوں سعید منتظر، ریکھا تیاگی اور ماسٹر ریاض الدین کو ان کی ادبی، سماجی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وزیر موصوف گوپال رائے نے کہا کہ مرحومین کی یاد میں اس طرح کے پروگرام منعقد کرانے سے جہاں اردو کو تقویت ملتی ہے وہیں مرحوم معروف شاعر کی یاد تازہ ہوتی ہے اور نظمی سکندر آبادی جیسے نامور شاعر و دانشور کی یاد میں ادبی پروگرام کرنے کی ضرورت ہے۔ بزرگ شاعر اردو گلزار زتشی نے کہا کہ نظمی سکندر آبادی اردو کے سچے سپاہی تھے اور اردو کے لیے لڑی جانے والی ہر لڑائی میں پیش پیش رہے۔ ناظم مشاعرہ شمس رمزی نے اپنے خیالات پیش کیے۔ مشاعرے کا آغاز سعید منتظر کی نعت پاک سے ہوا جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں احمد جلیسری، وقار مانوی، گلزار دہلوی، شمس رمزی، افضل منگلوری، ملک زادہ جاوید، آصف نظر، سیف سحری، امیر امروہوی، راشدہ باقی حیا، سعید منتظر، عقیل نہٹوری، خالد اعظمی، روبینہ لکھنوی، شجاع انور، راحت مظاہری، فرحت برنی نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ اخیر میں مشاعرہ کنوینر آصف نظر نے تمام شعرا اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اکتوبر 2017

ڈی یو کے صحافت کورس میں سنسکرت اور اردو بھی شامل

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی میں مستقل کمیٹی کی میٹنگ میں کئی مسائل پر بحث ہوئی۔ صحافت کورس میں زبان کے دو سبجیکٹ مزید جوڑنے پر خوب بحث ہوئی۔ بعد میں اسے پاس کر دیا گیا۔ پرو وائس چانسلر پروفیسر پی کے کھرانہ کی صدارت میں ہوئی میٹنگ میں پانچ سالہ انٹیگریٹڈ کورس میں دو دیگر ہندوستانی زبانوں کو شامل کیا گیا۔ یہ دو زبانیں سنسکرت اور اردو ہیں۔ ڈی یو میں منعقد مستقل کمیٹی کی میٹنگ میں تمام فیکلٹیز کے ڈین اور محکمہ کے سربراہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مدعو رکن بھی تھے۔ کمیٹی کے رکن ڈاکٹر پنکج گرگ نے بتایا کہ پانچ سالہ مربوط جرنلزم کورس میں غیرملکی زبانوں فرانسیسی، چائنیز، ہسپانوی اور عربک ہیں۔ جبکہ ہندوستانی زبانوں میں پہلے اس کورس میں تمل اور بنگالی شامل تھی، لیکن اب اس میں سنسکرت اور اردو کو بھی شامل کیا گیا۔ پانچ سال کے اس کورس میں دس سمسٹر پڑھائے جائیں گے، جس میں طالب علم کو ایک غیر ملکی زبان اور ایک ہندوستانی زبان لینی ہے۔ ان زبانوں کو شروع سے پڑھایا جائے گا، جس سے طالب علموں کو کسی طرح کی پریشانی نہ ہو۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2017

بزم دانشجویان کی جانب سے استقبالیہ

نئی دھلی: فارسی زبان و ادب کی تاریخ و ثقافت کے آپ امین و پاسدار ہیں، میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں، آپ خوب ترقی کریں۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کی بزم دانشجویان کے بی۔ اے سال اول اور ایم۔ اے سال اول کے طلبہ و طالبات کے استقبالیہ پروگرام میں خانم نسرین صدیقی نے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر خانم نسرین صدیقی نے بزم دانشجویان کی جانب سے تیار کردہ سہ ماہی میگزین 'نہاد' کا اجرا بھی کیا جسے ایم اے اول سمسٹر کے طالب علم محمد افضل زیدی اور ان کی ٹیم نے تیار کیا۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے طلبہ کی فارسی زبان و ادب اور اشعار میں مشاہیر کے پیغام کی طرف رہنمائی کی۔

بزم دانشجویان کے مشیر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے طلبہ سے کہا کہ آپ جس ذمے داری کے لیے جامعہ میں بھیجے گئے ہیں ہر لمحہ آپ کو اپنی ذمے داری کا احساس ہونا چاہیے۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عبدالحلیم نے اپنے خطاب میں کہا کہ تعلیم و تربیت کا اصل مقصد انسان کو بااخلاق و سنجیدہ بنانا ہوتا ہے۔ آخر میں صدر شعبہ نے تمام شرکا، سی۔ آئی۔ ٹی کے ڈائرکٹر انتظامیہ و اراکین اور شعبے کے دیگر اساتذۂ کرام کا شکریہ ادا کیا۔ اس افتتاحی تقریب کا آغاز سید محمد احتشام فضیل بی اے اول سمسٹر کے طالب علم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ جبکہ بارگاہ رسالت میں خانم نزہت گلفشاں بی۔ اے سمسٹر سوم کی طالبہ نے نعت پاک کا نذرانہ پیش کیا۔ نظامت بزم دانشجویان کے جنرل سکریٹری محمد افضل زیدی نے کی۔ پروگرام کا مکمل تعارف دانش اقبال بزم دانشجویان کے جوائنٹ سکریٹری نے پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2017

دہلی اردو اکادمی کا ڈراما فیسٹول

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام منعقد 29 واں سالانہ اردو ڈراما فیسٹول اختتام پذیر ہوا۔ فیسٹول کی آخری شام ڈراما 'آدمی نامہ' اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے کو بہروپ آرٹس گروپ نے پیش کیا۔ یہ ڈراما ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے لے کر موجودہ بدعنوان زمانے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں ہندوستان میں پائے جانے والے ایجوکیشن سسٹم، سیاسی حالات اور بدعنوانی پر ہندوستانیوں کی مجرمانہ خاموشی اور عدم دلچسپی پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ تعلیمی اداروں کو کس طرح بدعنوانی کی دلدل میں ڈالنے کی کوششیں ہوتی ہیں، اس پر بھی خاصی بحث ہے۔ آزاد اور بہتری کی جانب گامزن ہندوستان میں کس طرح اقتصادی طور پر دو طبقے منقسم ہو گئے ہیں، اسے بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں کسی پر راست حملے اور تنقید سے بچتے ہوئے ایسے حالات اور ماحول تخلیق کیے گئے ہیں، جو موجودہ حالات کی سنگینی کی طرف پورے ترقی پسندانہ موقف کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں۔ اس ڈرامے میں خاص طور پر ہادی سرمدی اور پونم گردھاری کے فن کو سراہا گیا۔ بہروپ آرٹس گروپ کی جانب سے پیش کیے گئے ڈراما 'آدمی نامہ' کے اختتام پر ہدایت کار راجیش سنگھ نے فنکاروں کا تعارف کرایا۔ اردو اکادمی کے سکریٹری اور ای ٹی وی اردو کے رکن تحسین منور نے ڈائرکٹر اور دیگر فن کاروں کو گلدستہ پیش کیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے فعال و متحرک سکریٹری ایس ایم علی نے کہا کہ اردو اکادمی کی کوشش ہوتی ہے کہ ڈراما فیسٹول میں ایسے ڈرامے پیش کیے جائیں، جو موثر اور عوام کی پسند کے مطابق ہوں۔ یہاں روز اول سے آج تک تمام ڈرامے بہت اچھے تھے، ہمیں لگتا ہے کہ ہم اپنی محنت میں کامیاب ہوئے ہیں اور آپ سب کا ساتھ اور تعاون ہمیشہ ہمارے اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اردو اکادمی، دہلی کے اسسٹنٹ سکریٹری مستحسن احمد نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 27 اکتوبر 2017

خیام شناسی پر مذاکرہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی میں شام شہریاراں کے تحت پروفیسر اخلاق آہن کی اہم کتاب 'خیام شناسی' کے حوالے سے نہایت شاندار مذاکرے کا اہتمام سے کیا گیا جس میں دہلی کے مختلف اداروں، یونیورسٹیوں اور سفارتوں سے وابستہ اہم علمی و ادبی شخصیات نے حصہ لیا۔ اس جلسے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور معروف ناقد و دانشور اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صدارت کی۔ اس موقعے پر جن ادیبوں، دانشوروں اور اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان میں جے این یو میں مہمان استاد پروفیسر عبدالخالق رشید، معروف فارسی استاد اور محقق پروفیسر چندر شیکھر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ معروف فارسی استاد پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر علیم اشرف خان اور بنیاد فارسی کے سکریٹری ڈاکٹر علی اکبر شاہ شامل ہیں اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر سید تقی عباس کیفی نے بہ حسن و خوبی انجام دیا۔

مذاکرہ کے آغاز میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے خیام شناسی کا مفصل تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب مطالعۂ خیام کے حوالے سے اہم دستاویز ہے اور فارسی اور اردو ادب کا ذوق رکھنے والے ہر شخص کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔ کابل یونیورسٹی سے وابستہ معروف فارسی اسکالر اور ادیب پروفیسر عبدالخالق رشید نے تفصیل کے ساتھ خیام کی شخصیت، اس کے علمی و ادبی کارناموں، زیر بحث کتاب خیام شناسی اور صاحب کتاب پروفیسر آہن کے تعلق سے گفتگو کی اور خیام شناسی کو سید سلیمان ندوی کی کتاب 'خیام' کے بعد دوسرا سب سے اہم تحقیقی کارنامہ قرار دیا۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے خیام کے حوالے سے مغربی تصورات کی خامیوں کا ذکر کیا۔ پروفیسر علیم اشرف خان نے بشمول خیام شناسی، پروفیسر اخلاق آہن کے دیگر علمی و تحقیقی کاموں کی وسعت و اہمیت کے ذکر کے ساتھ ساتھ بعض اشتباہات کے طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے اپنی گفتگو کے دوران اس کتاب کے مشمولات کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر چندر شیکھر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اخلاق آہن پوری فارسی دنیا میں بحیثیت فارسی اسکالر اور شاعر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ پروفیسر آہن نے مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے اس کتاب اور خیام شناسی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس جلسے میں مہمان خصوصی کے بطور موجود ممتاز شخصیت سید شاہد مہدی نے خیام کے ترقی پسندانہ رویہ کی طرف توجہ دینے پر زور دیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ خیام کی شخصیت ایسی ہے کہ تمام مفکروں اور محققوں کی نگاہیں ان پر مرکوز رہتی ہیں۔ اس جلسے میں مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبا کے ساتھ ساتھ سفارت افغانستان کے کلچرل کاونسلر ڈاکٹر بلخی اور دیگر سفارتی اہلکار شریک تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اکتوبر 2017

اترپردیش

ملک وقوم کی ترقی میں سرسید کا کردار

لکھنؤ: سابق گورنر اتراکھنڈ عزیز قریشی نے کہا کہ سرسید ایک تاریخ، ایک تحریک، ایک ولولہ بلکہ عزم و استقلال کے کوہ گراں کا نام ہے۔ عصر حاضر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سرسید کے روشن کارناموں اور ان کی اعلیٰ فکر و خیال سے نسل کو روشناس کرائیں تاکہ وہ اس ترقی یافتہ عہد میں دیگر قوموں کی طرح شانہ بشانہ چل سکیں۔ وہ مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام گنگا پرساد ہال

(امین آباد) میں منعقدہ کل ہند سمینار بعنوان 'ملک وقوم کی ترقی میں سرسید کا کردار' پر صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مہمانان خصوصی کی حیثیت سے اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ سابق گورنر نے زور دے کر کہا کہ سرسید نے تعلیم کے حوالے سے جو تحریک شروع کی تھی اس کے اثرات آج چہاردانگ عالم پر بھی نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں۔ سابق ڈی جی پی رضوان احمد نے بھی شرکت کی۔ جوہر فاؤنڈیشن کے روح رواں مسٹر وصی صدیقی نے اپنے استقبالیہ خطبے میں اعلان کیا کہ وہ لکھنؤ میں سرسید احمد خاں کے نام سے ایک انٹرنیشنل یونیورسٹی بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ انٹیگرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر وسیم اختر نے اعتراف کیا کہ انٹیگرل یونیورسٹی کا قیام اور ترقیاں سرسید کے مشن پر چل کر اور ان کو آئیڈیل انیٹگرل بنا کر ہی ممکن ہو سکی ہیں۔ برگیڈیر احمد علی و پروفیسر سید وسیم اختر وائس چانسلر انٹیگرل یونیورسٹی نے بھی سرسید احمد کی حیات و خدمات بالخصوص تعلیمی تحریک اور سماجی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ سمینار کی نظامت معروف عالم دین ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اکتوبر 2017

جشن اردو اور اعزازی تقریب

دیوبند: ادارہ خدمت خلق دیوبند، انفنٹی پولی ٹیکنک دیوبند کے تعاون سے اردو ہندی پندرہ روزہ دیوبند ٹوڈے، دیوبند کی جانب سے منعقد 'جشن اردو اور اعزازی تقریب' میں علمی، ادبی، سماجی اور تدریسی خدمات انجام دینے والی شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ادارہ خدمت خلق کے سرپرست مولانا حسن الہاشمی نے کہا کہ اردو کسی مخصوص فرقے یا گروہ کی زبان نہیں ہے۔ اردو کی پیدائش اور پرورش اسی ملک میں ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ آزادی سے پہلے ہندوستان کی زبان اردو ہی تھی۔ اخبارات ہوں یا سیاسی دستاویزات، آپسی گفت وشنید ہو یا خط وکتابت کے روابط، انقلاب زندہ باد کا نعرہ ہو یا آزادی کی پرجوش نظمیں سبھی کچھ اردو زبان کے سانچے میں ڈھلا ہوتا تھا۔ مہاراج لکشمن شرما نے کہا کہ زبانیں سرحدوں کی بندشوں سے دور دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں، کسی بھی زبان کو مذہب یا فرقے کی بنیاد پر زنجیروں میں جکڑا نہیں جاسکتا۔ صحافی ڈاکٹر شاہد زبیری نے کہا کہ زبان کی حفاظت کی ذمے داری اس کے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کی ہے۔ ان کے علاوہ احمد بھارتی، تصنیف احمد، راؤ عبدالستار نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو کی اہمیت، اس کی تاریخ اور اس کے نشر واشاعت پر گفتگو کی۔ اس سے قبل پبلک نرسری گرلز انٹر کالج دیوبند کی طالبات نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' ترانہ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اکتوبر 2017

ایک شام خان ارمان کے نام

الہ آباد: ادب گھر کی 'ایک شام خان ارمان خان کے نام' الہ آباد کے مشہور شاعر اور ادیب خان ارمان خان کی یاد میں 'بزم ارمان' کے زیر اہتمام منعقد ہوئے مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر ڈاکٹر ایم اے قدیر نے کی، جس میں شہر وشہر کے باہر سے آئے شاعروں نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے موجود سامعین کو داد وتحسین کے لیے مجبور کیا۔ مشاعرے کا آغاز شاہد سفر نے 'خان ارمان' کی زندگی سے جڑے ہوئے تمام واقعات کے تذکرے سے کیا۔ اس کے بعد جھارکھنڈ رانچی سے نکلنے والے 'عالمی انوار تخلیق' رسالے کا اجرا ڈاکٹر ایم اے قدیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ محمد سلیم علیگ ادب سلسلہ پبلی کیشنز دہلی نے رسالے کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد طنز ومزاح کے مشہور افسانہ نگار فضل حسنین نے 'خان ارمان خان' کی کہی گئی اردو شاعری کی باریکیوں پر گفتگو کی۔ مشہور شاعر ڈاکٹر اسلم الہ آبادی کے کلام سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اس موقعے پر کئی شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 اکتوبر 2017

سہ روزہ سیمینار 'سرسید اور ان کا عہد' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار

ادبستان کے زیر اہتمام ادبی ونثری نشست

مئوناتھ بھنجن: ادبی تنظیم 'ادبستان' کے زیر اہتمام ایک ادبی ونثری نشست کا انعقاد بمقام ایم اے اے فاؤنڈیشن ڈومن پورہ گولوا منو میں ہوا۔ صدارت اسلم ایڈوکیٹ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض حماد احمد حماد نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز امتیاز ثاقب کے ذریعے حمد پاک پیش کرکے کیا گیا۔ اس موقعے پر نثر نگاروں نے 'تعلیم' تھیم پر اپنے مقالے و افسانے پیش کیے۔ اسلم ایڈوکیٹ نے آزادی سے قبل اور بعد مسلمانوں کے تعلیمی گراف پر روشنی ڈالی اور تعلیم کے تعلق سے ایک پرمغز مقالہ بعنوان 'تعلیم ہی ترقی کا ذریعہ ہے؟' پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اگر زمانے کے ساتھ چلنا ہے تو نئی طرز فکر پیدا کرنی پڑے گی، انھوں نے کہا کہ تعلیم کے بغیر نہ تو کسی قوم نے ترقی کی ہے اور نہ کرسکتی ہے۔ اس کے بعد حماد احمد حماد نے اپنا افسانہ 'تعلیم کے نام پر' پیش کیا جس میں ایک ایسی طالبہ کی کہانی بیان کی گئی تھی جہاں لڑکی کی ماں مخلوط تعلیم اور اسکول کے کسی بھی فنکشن میں حصہ لینے کے خلاف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جس نظریہ اور تعلیم کو لوگ باعث افتخار سمجھ رہے ہیں وہی ان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

نہال جالب نے اپنے افسانہ 'روشنی کا کرب' میں ایک گاؤں میں پلی بڑھی لڑکی کی داستان خوبصورت انداز میں بیان کی ہے۔ افسانہ میں آزادی نسواں اور حقوق نسواں کی آڑ میں ہورہے جنسی استحصال اور مخلوط تعلیم سے ہونے والے برے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ماسٹر الیاس نعمانی نے اپنے مقالے 'تعلیم اور ہم' پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم یا فن کی طلب شدت کے مطابق ہوتی ہے زبردستی تھوپی نہیں جاسکتی۔ انھوں نے عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنے اور اس کے فوائد و نقصانات کے بارے میں مفصل روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اکتوبر 2017

سرسید اور ان کا عہد

علی گڑھ: شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں منعقد سہ روزہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ادیب وصحافی ڈاکٹر مظفر حسین سید نے کہا کہ سرسید بنیادی طور پر مصلح قوم ہیں، ان کی تمام تر نگارشات محض ادبی نہیں بلکہ مقصدی ہیں، انھوں نے اپنے قلم کو سامانِ شوق نہیں بلکہ ذریعۂ اصلاح بنایا، وہ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ سہ روزہ سیمینار بعنوان 'سرسید اور ان کا عہد' آرٹس فیکلٹی لاؤنج اے ایم یو میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مظفر حسین سید نے کہا کہ سرسید کی معروف تصنیف 'خطباتِ احمدیہ' حب اسلام کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کا یہ قول کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا کوئی اصول نہ غیر منطقی ہے اور نہ غیر سائنسی اور نہ ہی کسی طور پر خلاف فطرت ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نثر جدید کے بانی تھے، اردو میں مضمون نگاری بلکہ اداریہ نگاری کے بھی موسس تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر شبنم حمید نے کہا کہ سرسید نے تعلیم نسواں کے تعلق سے کہا تھا کہ ایک عورت کے تعلیم یافتہ ہونے سے پورا خاندان تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید چاہتے تھے کہ ہم صرف مشرقی تہذیب کو ہی اپنے اوپر نہ اوڑھیں، بلکہ مغربی تہذیب کی بھی اچھی چیزوں کو اپنی زندگی میں داخل کریں، تاکہ ہمارے اندر پوری دنیا کے ساتھ چلنے کی صلاحیت پیدا ہوسکے۔ مدارس سے آئے ڈاکٹر حاجی حبیب احمد نے کہا کہ تمل ناڈو میں مسلمانوں کی جو تعلیمی شرح ہے، اس کی بنیاد سرسید احمد خان کے اسی تعلیمی مشن کی رہین منت ہے، جو انھوں نے شروع کی تھی، آج ہندوستان میں جس جس حلقے میں مسلمان تعلیم یافتہ ہیں وہ اسی مشن کا نتیجہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرسید کے تعلیمی مشن کو عصر حاضر میں مزید تقویت دی جائے۔

تاج خیمہ میں داستان امیر خسرو

اے ایم یو کی استاد ڈاکٹر سیما صغیر نے تعلیم نسواں کے تناظر میں سرسید کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید پر کام کرنے والی خواتین کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ شعبہ کے استاد ڈاکٹر سلطان احمد نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے تعلیم اور زندگی کے ہر گوشے میں جہاں جہاں قدم رکھا وہاں دائمی نقش چھوڑا ہے، جو ہمارے لیے آج بھی مشعل راہ ہے۔ نظامت کررہے پروفیسر طارق چھتاری نے مہمانانِ گرامی کا تعارف کراتے ہوئے موضوع کی مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت ماہر سرسید پروفیسر افتخار عالم نے کی۔ اس موقعے پر خدابخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر عابد رضا بیدار، صدر شعبہ اردو سید محمد ہاشم، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر ظفر صدیقی، ڈاکٹر محمد اقبال حسین صدیقی، پروفیسر طارق سعید وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2017

اردو غزل پر توسیعی خطبہ

لکھنؤ: غزل بنیادی طور پر تصوراتی یا رسومیاتی شاعری ہے۔ غزل کی شاعری میں عشق ومحبت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے کیونکہ غزل کی شاعری صرف عشقیہ شاعری ہوتی تو اس میں عشق سے الگ ہٹ کر جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ غزل کے شعر میں ممکن نہ ہوتیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف ادیب ونقاد اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر احمد محفوظ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں توسیعی خطبہ کے دوران کیا۔ وہ کلاسیکی اردو غزل کی رسومیاتی دنیا کے موضوع پر توسیعی خطبہ دے رہے تھے۔ خطبے کی صدارت معروف فکشن نگار اور ناقد ڈاکٹر صبیحہ انور نے فرمائی۔ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے تعارف ونظامت کی ذمے داری ادا کی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ غزل کی شاعری بطور صنف ہماری شعری روایت کی نہ صرف مرکزی صنف ہے بلکہ غزل کی شاعری، شاعری کی بنیاد میں شامل ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 اکتوبر 2017

تاج خیمہ میں داستان امیر خسرو

آگرہ: اترپردیش محکمۂ سیاحت، آگرہ کی جانب سے تاج خیمہ میں یوم سیاحت پر داستان امیر خسرو پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی کمشنر کے رام موہن راؤ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہند سیاحت کی وزارت اور ریاستی حکومت کی طرف سے مشترکہ طور پر پورے ملک میں یوم سیاحت منایا جارہا ہے۔ یہ تہوار 5 اکتوبر 2017 سے شروع ہوا ہے اور آئندہ 25 اکتوبر تک ملک کے مختلف سیاحتی مقامات پر منعقد کیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تاج محل فتح پور سیکری، آگرہ فورٹ، سکندرا، اعتماد الدولہ، چینی کا روضہ، مہتاب باغ، تاریخی اور ثقافتی شان کی علامتیں ہیں۔ انھی پرکشش مقامات کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں روزنامہ باہر سے بہت سارے سیاح دیکھنے آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیاحوں کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے شہر کی صفائی اور سیاحوں کو کافی سہولت دیے جانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آگرہ شہر کو اسمارٹ سٹی کے تحت اور خوبصورت بنایا جائے گا۔

ڈپٹی ڈائرکٹر سیاحت مسٹر دنیش کمار کی طرف سے رکن اسمبلی مسٹر جگن پرساد گرگ اور کمشنر کے رام موہن راؤ کا خیر مقدم کیا گیا۔ پروگرام میں ثقافتی شام داستان امیر خسرو میں ڈاکٹر سعید وحید، ذکیہ ظہیر اور رینی سنگھ کی طرف سے پروگرام پیش کیا گیا۔ اس سے قبل پروگرام کا افتتاح ممبر اسمبلی جگن پرساد گرگ اور کمشنر کے رام موہن راؤ نے شمع روشن کرکے کیا۔ پروگرام میں ضلع مجسٹریٹ گورو دیال، ڈپٹی ڈائرکٹر سیاحت دنیش کمار سمیت سیاحت کی صنعت سے متعلق دیگر معزز شخصیات موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2017

شام داستان وغزل

میرٹھ: سرسید احمد خاں کی 200 ویں سالگرہ کے موقعے پر حرف کار فاؤنڈیشن اور خدمہ ویلفیئر سوسائٹی کے مشترکہ اہتمام سے گھنٹہ گھر پر واقع ڈی این ڈگری کالج میں 'شام داستان وغزل' عنوان سے ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے سیشن کی نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر شرکت کرنے آئے شوبھت یونیورسٹی کے چانسلر کنور شیکھر وجیندر نے کہا سماج کے ہر تعلیم یافتہ فرد کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے حلقے میں تعلیم کی روشنی پھیلائے۔ آج معاشرے میں سب سے زیادہ تعلیمی بیداری کی ضرورت ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ نوجوان طبقے کا اردو زبان و ادب سے جڑنا خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے تابش فریدی کی اجرا ہوئی کتاب 'ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری دیوان کے تناظر میں' کے لیے انھیں مبارک باد پیش کی اور سامعین سے کہا کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے چاہیے کہ جس شخص سے جتنی اردو آتی ہے وہ دو لوگوں کو اتنی اردو سکھائے اور خود مزید سیکھنے کی کوشش کرے۔ ضلع پنچایت کے سابق صدر سیٹھ دیانند گپتا، معروف ماہر قلب ڈاکٹر ممتیش گپتا، گولڈن ہارٹ اکادمی کی پرنسپل روحانہ احمد و مینیجنگ ڈائرکٹر عقیل احمد نے شمع جلا کر محفل کا آغاز کیا۔ اس موقعے پر تابش فریدی کی لکھی کتاب 'ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری دیوان کے تناظر میں' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ سرسید احمد خاں کی خدمات پر قاضی زین الساجدین، ڈاکٹر معراج الدین احمد، اسسٹنٹ کمشنر شاہدہ صدیقی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ٹی ای ایس الطاف انصاری، اردو پریس کلب کے صدر طارق فیضی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2017

بہار:

دفاتر اور افسران کا نام اردو میں لکھنے کی تجویز

جموئی: ضلع کلکٹر کے میٹنگ ہال میں ہفتہ کے روز اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ کے زیر اہتمام ایک نشست ضلع اقلیتی فلاح محکمہ کے افسر اور اردو سیل کے انچارج محمد خلافت انصاری کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی ممتاز صحافی اور مصنف سینئر ایڈوکیٹ ڈاکٹر سید محمد معصوم احمد امرتھوی نے پلس 2 ہائی اسکول جموئی بازار کے معلم محمد ایوب انصاری کے نام کی پورے ضلع کے دفتروں و افسران کے نام اردو میں لکھنے کے لیے تجویز پیش کی۔ ایوب انصاری ماہر خطاط ہیں۔ نشست کے شرکا نے اتفاق رائے سے ان کے نام کو قبول کیا۔ ان کے ساتھ معاون کے طور پر محمد کمال الدین اردو مترجم سب ڈویژن دفتر جموئی کو منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر معصوم احمد نے غیر اردو داں لوگوں کے لیے اردو لرننگ کورس شروع کرنے کی ستائش کرتے ہوئے اردو سیکھنے پر زور دیا۔ اسی طرح محمد محفوظ

کلیم عاجز کی یادگاری تقریب

پنجاب اردو اکادمی کے زیر اہتمام شام افسانہ کا انعقاد

احمد اعلیٰ مترجم کلرک یو ڈی سی بلاک دفتر جموئی نے ضلع کے سبھی دفاتر کے نام، افسران و عملے کے نام اور دیگر ترقیاتی وفلاحی پیغامات اردو میں لکھے جانے کے اغراض و مقاصد سے عملی اقدامات کی تجویز پیش کی جسے شرکا نے متفقہ طور سے قبول کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2017

کلیم عاجز کی یادگاری تقریب

پٹنہ: کلیم عاجز کی شاعری میر کا تتبع تھی اس پر مجھے اعتراض ہے، ان کا لب ولہجہ اپنا اور ان کی شاعری منفرد ہے۔ یہ بات ایک یادگاری تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے کہی اور ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ کلیم عاجز کی زبان میر کی نہیں تیلہاڑا کی زبان تھی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہ زبان ان کی خالہ پھوپھی بولتی تھیں جبکہ اپنے صدارتی خطاب میں شفیع مشہدی نے کہا کہ کلیم عاجز نے بے مثل شاعری کے ذریعے پوری دنیا میں اپنی شاعرانہ برتری کا لوہا منوایا مگر اردو ادب میں انھیں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس معاملے میں تمام ادبی رسائل نے انھیں نظر انداز کیا، کلیم عاجز کے ساتھ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ معروف افسانہ نگار اور اردو ڈائرکٹوریٹ کے صدر نشیں شفیع مشہدی نے کلیم عاجز کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام بدھ کو ودیاپتی بھون میں کلیم عاجز کی یادگاری تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کلیم عاجز نے اعلیٰ شاعری اور معیاری نثری تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا اور عالمی سطح پر شہرت حاصل کی۔ وہ سہل ممتنع کے عظیم شاعر تھے۔ مشاعروں اور عوام میں مقبولیت حاصل تو ہوئی مگر اردو ادب کے ناقدوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کلیم عاجز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ کلیم کے لغات میں واضح مشابہت کے پہلو نکلتے ہیں مگر ان کے انداز فکر میں بھرپور ندرت اور جدت موجود ہے۔ انداز فکر میں جدت اور انداز بیان میں صداقت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے۔ سابق وزیر اور اردو مشاورتی کمیٹی کے پہلے چیئرمین شاکل نبی نے کلیم عاجز سے اپنی گہری وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اردو ادب کا بڑا سرمایہ بتایا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ کلیم عاجز فخر بہار تھے۔ ان کا نام برصغیر کی اردو شاعری کا ایک مقتدر، معروف اور مقبول نام ہے، انھیں دبستان بہار کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت، فکر کی ندرت اور پیش کش کی جو دل پذیری ہے، وہ بے مثال ہے۔ تقریب کی نظامت اسلم جاوداں نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں شفیع مشہدی نے کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کی ذمے داری اردو والوں کو ہی لینی پڑے گی، یہ کام سرکاری بیساکھی سے انجام نہیں پاسکتا۔ اس کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی سطح پر بچوں کو اردو کی لازمی تعلیم پر ہمیں توجہ دینی ہوگی۔ اردو زندہ رہے گی تو ہماری تہذیب زندہ رہے گی اور تہذیب زندہ رہے گی تو ہماری شناخت بھی باقی رہے گی۔ اس موقعے پر کلیم عاجز کی شخصیت اور ان کی شاعری کے حوالے سے معصوم عزیز کاظمی اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں کی تین طالبات نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ تقریب کا اختتام شعری نشست پر ہوا جس میں پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ابھے کمار بے باک، خورشید انور اور تبسم ناز نے اپنے کلام پیش کیے۔ اس موقعے پر انعامات اور اسناد بھی تقسیم کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2017

پنجاب:

'شامِ افسانہ' کا انعقاد

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی کے زیر اہتمام 'شام افسانہ' کا انعقاد کیا گیا جس میں مشہور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم سکریٹری، پنجاب اردو اکادمی نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں اس پروگرام کی اہمیت وافادیت سے حاضرین کو روشناس کراتے ہوئے کہا ''آج کا یہ پروگرام دو زبانوں اردو- پنجابی کے فاصلے سمیٹ کر ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کا موقع فراہم کرے گا۔ یہی ہمارا مقصد بھی ہے۔'' اس افسانوی نشست میں عابد علی خاں شیروانی نے 'سردار ہوا کے جھونکے'، جتندر سنگھ ہانس نے 'بھیکھی' ڈاکٹر انور احمد انصاری نے 'میں' جسویر رانا نے 'آخری درش توں پہلاں'، گورپال سنگھ لٹ نے 'سنتیاں تاہناں داہکو کا' اور محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے 'سچا جھوٹ' افسانے پیش کیے۔ افسانوی نشست میں جس طرح افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی زندگی کی تلخ حقیقتوں، بے راہ رویوں، تجربوں اور رشتوں کی پامالی اور دیگر معاشرتی مسائل کو اپنے اپنے ڈھنگ سے موضوع بنایا، اسے حاضرین کی طرف سے بے حد سراہا گیا۔

ڈاکٹر وینا کشی شرما نے اپنے خطاب میں پنجاب اردو اکادمی کو اردو زبان و ادب کا ایک طاقتور مرکز قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ اکادمی پنجاب میں اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کا باعث ضرور بنے گی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر درشن سنگھ ہرویندر، چیف ایڈیٹر وشو درشن نئی دہلی نے کی اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر وینا کشی شرما دہلی یونیورسٹی سے بطور مہمان اعزازی آئیں، جبکہ نظامت معروف شاعر ضمیر علی ضمیر نے کی۔ صدر مجلس ڈاکٹر درشن سنگھ ہرویندر نے اپنے صدارتی خطبے میں پہلے افسانوی نشست میں پڑھے گئے سبھی افسانوں پر اپنے مخصوص انداز میں ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے اکادمی کی طرف سے کی گئی اس پہلی کوشش کو بے حد سراہا اور پنجاب اردو اکادمی کی اب صحیح معنوں میں ہوئی فعالیت پر اپنی تشفی کا اظہار کیا۔ پنجاب اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ اس ادبی تقریب میں شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2017

تلنگانہ:

درسِ شاعری پر ورکشاپ

حیدرآباد: اردو شاعری میں علم عروض کے علاوہ اور بھی متنوع تکنیکی مسائل ہیں جن سے آگاہ ہونا شعرا کے لیے بے حد ضروری ہے، صرف بحر کا نام معلوم ہو جانے سے اور شعر کی تقطیع کا طریقہ جان لینے سے کوئی نامور شاعر نہیں بن جاتا، ایک اچھا شاعر بننے کے لیے، اوزان و بحور کی جانکاری سے زیادہ لسانی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنا اہم ہوتا ہے۔ ادب گاہ تنظیم کے زیر اہتمام 23 اکتوبر کی شب جمال کالونی حیدرآباد میں 'درس شاعری' کے موضوع پر منعقدہ نویں ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے حیدرآباد کے مشہور شاعر سردار سلیم نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے ان کلاسز کو موجودہ نسل کے لیے ایک پیش خیمہ قرار دیا اور کہا کہ رموز شاعری سے واقفیت حاصل کرنا کسی بھی شاعر کے لیے انتہائی لازمی ہے۔ انھوں نے شاعری اور اس کے معیار کے ساتھ ساتھ فن شاعری کے اہم نکات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور نئی نسل میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بلا معاوضہ چلائی جانے والی ان کلاسز سے استفادہ کی خواہش کی۔ ان کلاسز سے استفادہ کرنے والوں میں تمام عمر کے افراد موجود تھے جنھوں نے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو دنیا میں یہ اپنی طرز کی ایک انتہائی اہم پہل ہے۔ انھوں نے کہا کہ درحقیقت یہ اردو شاعری کے فن کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ادب گاہ کی جانب سے ہر ہفتہ پابندی سے منعقد ہونے والی ان کلاسز میں روز افزوں طلبا کی تعداد بڑھ رہی ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 اکتوبر 2017

کرناٹک:

ساحر لدھیانوی: شخصیت اور فن

گلبرگہ: ساحر لدھیانوی صرف فلمی نغمہ نگار اور شاعر ہی نہیں ترقی پسند تحریک کے علمبردار تھے۔ ساحر کے چاہنے والے آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر پچھلے 37 برسوں سے ہر سال جشن ساحر لدھیانوی کا اہتمام کرتے آرہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار سراج وجیہ مجلس شعور و ادب گلبرگہ کی جانب سے بروز اتوار نیشنل جونیر کالج گلبرگہ میں منعقدہ سمینار بعنوان 'ساحر لدھیانوی: شخصیت اور فن' میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ منظور وقار (نائب صدر مجلس) کی تحریک پر مجلس نے ساحر لدھیانوی کی 37 ویں برسی کے موقع پر سمینار کا انعقاد کیا۔ سمینار میں ملک کے معروف قلم کار ادیب، نقاد و دانشور اور شعرائے کرام شریک رہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ساحر لدھیانوی اس دور میں اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ممتاز نقاد ادیب و خاکہ نگار ڈاکٹر وہاب عندلیب نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی اور فرمایا کہ ساحر لدھیانوی نے اردو غزلوں اور گیتوں کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ان کا شعری مجموعہ 'تلخیاں' اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے چالیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سمینار میں معروف افسانہ نگار ڈاکٹر جلیل تنویر، ممتاز دانشور مظہر حسین زمیندار اور سینئر صحافی عزیز اللہ سرمست نے مہمانان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ ڈاکٹر مظہر حسین زمیندار نے کہا کہ میں ساحر لدھیانوی کی شاعری اور فلمی گیتوں میں بے حد متاثر ہوں آج بھی ان کی شاعری اور فلمی گیت سماعت کرنے والوں کے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں جدید لب ولہجہ کے ممتاز شاعر اکرم نقاش نے متاثر کن انداز میں ساحر لدھیانوی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ سینئر افسانہ نگار و ناول نگار شاہد فریدی، معروف مزاح نگار و خاکہ نگار منظور وقار نے اپنے مقالوں میں ساحر لدھیانوی کی نجی زندگی اور فلمی شب و روز کے واقعات پر روشنی ڈالی اور ساحر کی شاعری اور فلمی گیتوں کا مختلف حوالوں اور اقتباسات کے ذریعے بھرپور احاطہ کیا۔

پریس ریلیز: منظور وقار، نائب صدر مجلس شعور و ادب، گلبرگہ کرناٹک،

23 اکتوبر 2017

اعزاز و اکرام:

مدینہ گولڈ میڈل ایوارڈ فنکشن

حیدرآباد: وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور پروفیسر اختر الواسع نے مسلمانوں کی کامیابی، ترقی اور ان کے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے تعلیم نسواں کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر اختر الواسع 28

ویں مدینہ گولڈ میڈل ایوارڈ فنکشن سے مخاطب تھے جو مدینہ ایجوکیشنل سنٹر حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ مجیب الدین انور ایگریکلچرل سائنٹسٹ نے صدارت کی۔ شہ نشین پر بانی سکریٹری مدینہ تعلیمی ادارہ جات کے ایم عارف الدین کے علاوہ غلام یزدانی ایڈووکیٹ، حامد حسینی، خورشید الحسن، کے ایم منہاج الدین اور کے ایم فصیح الدین موجود تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اسلام نے خواتین کو ہر شعبہائے حیات میں اختیارات عطا کیے۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ اقتصادی خود اختیاری، بی بی ام سلمہؓ اور حضرت سیدہ زینبؓ سیاسی اختیارات، حضرت رابعہ بصری روحانی بصیرت کی مثال ہیں، جبکہ امت کو ایک تہائی شریعت ام المومنین بی بی عائشہ صدیقہؓ سے ملی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب قوم کی بیٹیوں کو تعلیم سے دور رکھا گیا تو مسلم معاشرے کا ایک بڑا حصہ جہالت اور زوال کا شکار ہوا۔ انھوں نے دینی اور عصری تعلیم کی تفریق اور تخصیص کے لیے انگریزوں کو ذمے دار قرار دیا اور کہا کہ جب آکسفورڈ کیمبرج، ہارورڈ یونیورسٹیز، آئی آئی ٹیز، ایم آئی ٹیز کا وجود نہیں تھا تب بھی بہترین آرکیٹکس، انجینئرس، سائنسداں، موجدین، فلاسفرس، ماہرین تعلیم موجود تھے۔ یہ سب مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ مدینہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے آج سلطانہ نذیر الدین پرنسپل پرنس عیسن اسکول اور محمد عبدالقیوم ڈائرکٹر آر ایم ٹی وی کو ان کی تعلیمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈلس اور تہنیت پیش کی گئی۔ ڈاکٹر شیخ محمد قاسم، بشیر احمد، اے سیف اللہ، امان اللہ حسینی اور سیدہ صبا صفیہ کو پی ایچ ڈی کی تکمیل پر 14 طلبہ و طالبات کو پی جی میں امتیازی کامیابی کے لیے انٹرمیڈیٹ کے 25 ٹاپرس کو اور سی بی ایس ای اور مدینہ اداروں کے طلبہ کو گولڈ میڈلس پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2017

متعدد شعرا طاہر رزاقی ایوارڈ سے سرفراز

علی گڑھ: سنبھل کی انجمن باغ ادب اور الائٹ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سنبھل شہر کی کئی اہم ادبی شخصیتوں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں معروف شاعر 'طاہر رزاقی ادبی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ اس بزم کے روح رواں اور کنوینر سنبھل کے نہایت فعال استاد ڈاکٹر شفیق برکاتی نے تمام ایوارڈ یافتگان کا تعارف پیش کیا۔ تقریب میں سنبھل کے بزرگ استاد شاعر سید اظہر حسین آہ سنبھلی (صدر)، حاجی شکیل، پروفیسر محمد حسین جعفری، ڈاکٹر ثروت عثمانی شامل رہے۔ ایوارڈ یافتگان میں پروفیسر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر طارق قمر، ڈاکٹر فرقان، محمد عبدالمعروف، ڈاکٹر محمد شاکر اور ڈاکٹر محمد قمر عالم کے علاوہ دیگر شعرا و ادبا کو اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 25 اکتوبر 2017

اے ایم یو کی طالبات کو ارملا متل اسکالرشپ

علی گڑھ: اے ایم یو کی ایم ایس سی کی طالبہ الماس جیلانی، بی ٹیک کی انوشکا گپتا، ایل ایل بی کی نادیہ حسن

اور بی یو ایم ایس کی ثنا خان سمیت 10 طالبات کو شریمتی ارملا متل میموریل ٹرسٹ کے ذریعے دی جانے والی اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا گیا۔ شریمتی ارملا متل اسکالرشپ ہر شعبے سے کسی ایک طالبہ کو دی جاتی ہے۔ موجودہ اسکالرشپ 2017-18 کے لیے ہے۔ اس اسکالرشپ کے لیے طالبات کو داخلہ کے مشکل دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ آج ان تمام طالبات کو اسکالرشپ کے سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طارق منصور اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائے و ارملا متل ٹرسٹ کے ٹرسٹی سی ڈی متل نے یہ سرٹیفکیٹ دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اکتوبر 2017

پروفیسر ایم اے فاروقی، ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام پرسٹیجیس ایوارڈ سے سرفراز

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس نے پروفیسر ایم اے فاروقی کو 'ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام پرسٹیجیس ایوارڈ' سے سرفراز کیے جانے پر مبارکباد پیش کی۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے قومی صدر اکیڈمک ونگ پروفیسر ایم اے فاروقی کو ان کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں کل حیدرآباد میں منعقدہ ایک شاندار تقریب کے دوران انھیں مذکورہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے اپنے تہنیتی پیغام میں کہا کہ پروفیسر ایم اے فاروقی کو مبارکباد پیش کرنا ان کے لیے باعث سعادت ہے، کیونکہ پروفیسر ایم اے فاروقی نہ صرف گورنمنٹ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے معروف و ممتاز استاد ہیں بلکہ ریجمنل تھیراپی میں کمال کی مہارت بھی رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2017

ادب کا نوبل انعام جاپانی اشیکورو کے نام

اسٹاک ہوم: اس سال ادب کا نوبیل انعام جاپانی نژاد برطانوی ناول نگار کازواو اشیکورو کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ رائل سویڈش اکادمی کی جانب سے نوبیل انعام برائے ادب کا اعلان کرتے ہوئے اشیکورو کو خراج تحسین

پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ ناول نگار اشیکورو کے ناول زبردست جذباتی قوت کے حامل ہیں۔ ان کے ناول انسان اور دنیا کے درمیان تعلق کی گہرائیوں کے پردے چاک کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اشیکورو کو یہ انعام ان کے ناول 'گریٹ ایموشنل فورس' کے لیے دیا جائے گا۔ اس انعام کے تحت انھیں گیارہ لاکھ ڈالر نقد رقم دی جائے گی۔ اشیکورو کی پیدائش جاپان میں نومبر 1954 میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان اس وقت برطانیہ میں آکر مقیم ہوگیا تھا جب ان کی عمر 5 سال تھی۔ ریمینز آف دا ڈے اور نیور لیٹ می گو، اشیکورو کے معروف ناولوں میں شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اکتوبر 2017

پروفیسر چندر شیکھر امیر خسرو سوسائٹی کے نائب صدر

نئی دہلی: فارسی ادب کے ممتاز محقق و دانشور اور شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر چندر شیکھر کو نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے

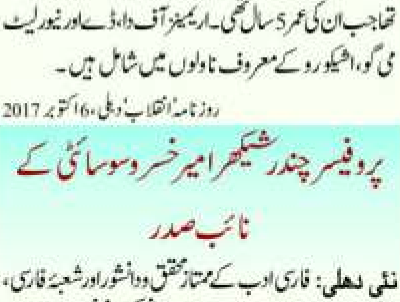

شعبۂ فارسی میں ایک پروقار تقریب میں ڈاکٹر ادریس احمد نے سرٹیفکیٹ اور سوسائٹی کی اہم مطبوعات پیش کیں۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے ایگزیکٹو ممبر ڈاکٹر رضا حیدر، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر علیم اشرف، ڈاکٹر اکبر علی شاہ، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر محمود فیاض، ڈاکٹر سید تقی عباس کیفی کے علاوہ بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبہ موجود تھے۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی ملک کی اہم ادبی و ثقافتی تنظیموں میں سے ایک ہے۔ سابق صدر جمہوریہ ہند مرحوم فخرالدین علی احمد، اندر کمار گجرال، یونس سلیم جیسے معزز افراد اس تنظیم سے وابستہ رہے۔ پروفیسر چندر شیکھر فارسی ادب میں ایک اہم محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ فارسی زبان و ادب پر آپ کی اب تک 30 سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور آپ کی ہر کتاب کو علمی دنیا میں مقبولیت حاصل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2017

ہارون رشید اور ڈاکٹر رام نریش کو ایوارڈ

سنت کبیر نگر: ادبی تنظیم جن ساہتیک منچ خلیل آباد کے ذریعے صحافت اور اردو شاعری کی خدمات کے لیے

ڈاکٹر محمد ہارون رشید لکھنوی کو فراق گورکھپوری ایوارڈ اور کویتا وساہتیہ کی خدمت کے لیے جن کوی ایوارڈ 2017 سے ڈاکٹر رام نریش سنگھ منجل کو نوازا گیا ہے۔ اس موقعے پر رادھے شیام مشرا اور صوفی بستوی نے بتایا کہ جب سے ہماری تنظیم وجود میں آئی ہے، تبھی سے اس کے بینر تلے ادبی لوگوں کو بلا کر ان کا استقبال کرتے ہوئے انھیں مختلف ایوارڈوں سے نوازا جاتا ہے، اس میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا ہے، کیونکہ ہر مذہب کے ماننے والے عام ہندوستانی اور بھائی بھائی ہیں۔ ملک کے موجودہ حالات کو دیکھ کر آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ادبی محفلوں کے انعقاد میں قومی یکجہتی کے فروغ پر بھی غور وخوض ہونا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہوسکے ہر ہندوستانی کو ایک دھاگے میں پرو کر بھائی چارہ اور گنگا جمنی تہذیب کی بھی آبیاری ہونی چاہیے، اسی میں ملک اور عوام کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ ایوارڈ یافتہ مہمانوں نے تنظیم کے عہدے داران کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اکتوبر 2017

ڈاکٹر ایم۔ اے حق کو اعزاز

خبرایکسپریس: رانچی کی ایک فعال ادبی تنظیم 'ہماری انجمن' کی جانب سے عالمی شہرت یافتہ افسانچہ نگار ڈاکٹر ایم اے حق کو افسانچہ اطفال کے موجد بننے پر لیک روڈ، رانچی واقع

راعین اردو گرلز ہائی اسکول میں محفل پذیرائی کے تحت ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں انھیں ایک شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر حق نے ابھی حال ہی میں ذہین بچوں کی ادبی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مخصوص افسانچے لکھنے شروع کیے، جنھیں موصوف نے 'افسانچۂ اطفال' کا نام دیا ہے۔ عالمی سطح پر پچھلے اب تک لگ بھگ چالیس مشاہیر ادب نے ان کے افسانچۂ اطفال پر اپنی مثبت آرا کا اظہار کیا ہے اور ان کی ایجاد کردہ نئی صنف 'افسانچۂ اطفال' کو شرف قبولیت عطا کردی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس موقعے پر صدارت کے فرائض ڈاکٹر وکیل احمد رضوی صدر شعبۂ اردو رام گڑھ کالج و مدیر 'افق ادب' نے ادا کیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر معروف فکشن نگار ڈاکٹر مسعود جامی تشریف فرما تھے۔ نظامت کے فرائض محمد غالب نشتر نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: محمد عالم، اسسٹنٹ ٹیچر، گورنمنٹ ریڈی پی اردو اسکول مہاراشٹر، 1 نومبر 2017

اجرا

آزاد قلم

نئی دھلی: نئی دہلی کے ہریانہ بھون میں "آزاد قلم" ہندی غزل مجموعہ کا اجرا ہریانہ کے گورنر پروفیسر کپتان سنگھ سولنکی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ ہندی غزلوں کا یہ مجموعہ تمام لوگوں کے لیے مشعل راہ

بنے گا اور عوام و خواص کی داد و تحسین بھی موصول کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ بہترین تخلیقات کے مطالعے سے انسان کا دماغ کنٹرول رہتا ہے مگر کچھ لوگ قلم کی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں لیکن کتاب 'آزاد قلم' میں ایسا کچھ نہیں ہے، بہت ہی اچھے الفاظ کا استعمال مصنفہ نے کیا ہے۔

آزاد قلم کی تخلیق کار شاعرہ جیوتی آزاد کھتری نے بتایا کہ یہ ان کا پہلا ہندی غزل مجموعہ ہے جس میں 130 ہندی کی غزلیں موجود ہیں۔ اس موقعے پر ماڈرن انجینئرنگ این فوٹیک کے سی ایم ڈی اسلم کے سیفی، فیس گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر مشتاق انصاری، ڈاکٹر اشک جھمگین، طارق فیضی، ساگر سیالکوٹی، بی جے پی لیڈر رام نرائن دوبے، مہندر کھتری اور مصطفیٰ گڈو کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اکتوبر 2017

کلیاتِ اقبال کے منظوم فارسی ترجمے کا اجرا

نئی دھلی: بتاریخ 11 اکتوبر کو شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں علامہ اقبال کی معروف زمانہ تصنیف کلیات اقبال کے منظوم فارسی ترجمے کی رونمائی عمل میں آئی، جس کو

افغانستان کے معروف شاعر اور مترجم ڈاکٹر محمد افسر رہبین نے نہایت کاوش اور جانفشانی سے فارسی نظم کا جامہ عطا کیا، اس اجرا کے موقعے پر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ پروفیسر علیم اشرف خان، ہندوستان میں افغانستان کے معاون سفیر میرویس بلخی، افغانستان کے مشہور ناقد پرتو نادری خاص طور سے موجود تھے۔ ان حضرات نے ڈاکٹر محمد افسر رہبین کی کتاب کلیات اقبال کے منظوم فارسی ترجمے کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور کچھ اشعار پر بھی روشنی ڈالی۔ پروفیسر علیم اشرف نے بتایا کہ ڈاکٹر محمد افسر رہبین ایک ایسی شخصیت ہے جن کو اردو و فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ اس کتاب کے رسم اجرا میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے پروفیسر سید اختر حسین کاظمی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور آخر میں پرتو نادری اور میرویس بلخی نے شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی سے مستقبل میں ہمکاری کی خواہش ظاہر کی۔ اس جلسے کی نظامت ڈاکٹر اکبر شاہ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2017

ہجوگوئی عہد بنی امیہ میں

لکھنؤ: دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہمان خانے میں ایک تقریب بسلسلہ اجرا 'ہجوگوئی عہد بنی امیہ میں' مؤلفہ ڈاکٹر عبدالمجید ندوی، صدر شعبۂ عربی گوہاٹی یونیورسٹی آسام زیر صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ہوئی۔ کتاب کا مقدمہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما کے قلم سے ہے۔ تقریب میں صدر جلسہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے کہا کہ عربوں کی شاعری حقیقت کی ترجمان اور فطرت سے قریب ہے، اس میں انسانی جذبات واحساسات کی جس قدر عکاسی ہے، کسی اور زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی، دوسری زبانوں کی شاعری تخیلات، بلند پروازی اور نکتے پر مبنی ہوتی ہے، لیکن عربی شاعری میں خصوصاً سچائی اور امانت داری کی بھرپور ترجمانی ہے اور تصنع وتکلف سے دور ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والے لوگوں کے لیے بہت قیمتی اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب سے ان کو شاعری کی مراد کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس موقعے پر مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، مولانا شاہ تقی الدین فردوسی ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد فرمان ندوی، محمد ذاکر، شہاس، نفسل، امیر وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اکتوبر 2017

استری پرشن

علی گڑھ: "نسائیت کا مطلب خواتین کے لیے یکساں حقوق اور ان کا قانونی تحفظ ہے۔ زراعت پر مبنی جاگیردارانہ نظام میں خاتون صرف بچہ پیدا کرنے کا ذریعہ تھی۔ تقریباً 200 برسوں کے طویل جدوجہد کے بعد خواتین کو یکساں جمہوری حقوق ملے اور تفویض اختیارات کی سمت میں پیش رفت ہوئی، لیکن آج صارفیت والے نظام نے خاتون کو ایک پیداوار میں تبدیل کردیا ہے اور اسے بازار و اشتہار کی شئے بنا دیا ہے۔" ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیبہ و قلم کار ڈاکٹر نیتا سنگھ نے اپنی نئی کتاب 'استری پرشن' کی رسم اجرا کے موقعے پر مذاکرہ بعنوان 'صارفیت پسند سماج میں خاتون کی جدوجہد' میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ یہ پروگرام جنوادی لیکھک سنگھ، ترقی پسند رائٹرس ایسوی ایشن اور جن سنسکرتی منچ کے باہمی اشتراک سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی میں منعقد ہوا۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے ماہر تعلیم پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی نے کہا کہ اپنی شناخت قائم کرنے کی جدوجہد ہی خواتین کو آگے بڑھاتی ہے۔ شعبۂ ہندی کے صدر پروفیسر عبدالعلیم نے خواتین کے حقوق کے تئیں سماج کے پڑھے لکھے لوگوں کے حساس ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔

'استری پرشن' کتاب پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر اجے بساریا نے کہا کہ نیتا سنگھ ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ گذشتہ 40 برسوں سے سماجی شعبے میں بھی سرگرم ہیں اور انھوں نے مختلف تنظیموں کے ذریعے ہر طبقے کی خواتین کے درمیان کام کرنے کے تجربات کو آج کے رائج مباحثوں

سے ایک علاحدہ شکل دی ہے۔ ڈاکٹر جیہ پریہ درشنی نے کہا کہ مصنفہ نے پچھلی نسلوں کی ان بے نام خواتین کی زندگیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جنھوں نے آج کی نئی نسل کے لیے جدوجہد کا راستہ بنایا ہے۔ ڈاکٹر دیپ شکھا سنگھ نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں نسائیت سے متعلق عملی تجربات کی بنیاد پر گفتگو کی گئی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2017

شریکِ حرف

وارانسی: غزل شاعری کا ایک فارم بھی ہے اور ایک مکمل تہذیب بھی۔ یہ کہنا تھا ملک کے معروف ادیب اور محقق شمیم طارق کا۔ ہفتہ کی شب میں پراڑکر اسرتی بھون میں انجمن دبستان ادب کی جانب سے ایک اجرا پروگرام

کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے نوجوان شاعر خالد جمال کے اولین شعری مجموعے 'شریکِ حرف' کا اجرا کیا گیا۔ اجرا ملک کے معروف ادیب اور شاعر شمیم طارق نے کیا۔ اجرا کے بعد شمیم طارق نے اپنے خطاب میں کہا کہ خالد جمال کی شاعری غزل کی شاعری ہے۔ غزل شاعری کا ایک فارم بھی ہے اور ایک مکمل تہذیب بھی ہے۔ خالد جمال نے اس تہذیب کو زبردستی نہیں اوڑھا ہے بلکہ وہ اس تہذیب سے اس طرح وابستہ ہیں جس میں نہ تو غزل کو ان سے جدا کیا جا سکتا ہے نہ ان کو غزل سے۔ ان کے یہاں اردو غزل کے کئی رنگ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک نیا رنگ وجود میں آ گیا ہے۔ اس رنگ میں محبت کا احساس بھی ہے، احتجاج کی آہٹ بھی اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ خالد جمال کا شعری مجموعہ اردو غزل کی روایت کو مستحکم کرے گا اور نئے لوگوں کو بھی غزل اپنانے کی تحریک دے گا۔ ڈاکٹر سلمان راغب نے مہمانوں کا استقبال و تعارف پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر یعقوب یاور نے کی اور شعبۂ اردو بی ایچ یو کے استاد ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ آفتاب احمد آفاقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ خالد جمال کی شاعری معاصر اردو شعری منظرنامے پر ایک صحت مند دستخط ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں جو تنوع ہے وہ ہمارے عہد کے اجتماعی اور انفرادی تجربوں کی پیداوار ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ان کی شاعری کو اردو ادب میں ایک خوشگوار اضافے کے طور پر دیکھتا ہوں۔ پروگرام کے آخر میں مہمانوں کا شکریہ انور جمال نے ادا کیا اور نظامت ڈاکٹر سلمان راغب نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2017

'چوپال'

لکھنؤ: اردو زبان وادب کے فروغ میں لکھنؤ اسکول اور اہل لکھنؤ کی جس قدر خدمات ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی پوری دنیا میں لکھنؤ کے ادبی اسکول

اور اردو زبان کا شہرہ ہے۔ اپنی نزاکت، نفاست، شیرینی اور سلاست کے سبب اردو پوری دنیا میں مشہور ہے لیکن اہل لکھنؤ کی زبان میں جو انفرادیت اور چٹکلی پائی جاتی ہے رئیس انصاری کا ادبی ذخیرہ اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ احتجاجی شاعر ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے یوپی پریس کلب میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر رئیس انصاری کے شعری مجموعہ 'چوپال' کی تقریب رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ نسیم اختر صدیقی اکادمی کے تحت ہوئی تقریب ایک شام رئیس انصاری کے نام و رسم اجرا کی صدارت مشہور نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے اور نظامت تقریب کے منتظم و شاعر نجّے مشرا شوق نے کی۔ ڈاکٹر انور جلال پوری نے کہا کہ رئیس انصاری کو لکھنؤ اور ادبی دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ صدر محفل پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ یہ ایک شاعری کی صحت یابی کا جشن ہے۔ لہٰذا اسے غسل صحت نہیں بلکہ غسل الفاظ کہا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ انسان اپنے اصل کا عکاس ہوتا ہے۔ رئیس انصاری کے کلام میں اس کا بھرپور عکس نمایاں ہے۔ ان کی زبان کی سچائی، سماجی برتاؤ کی سچائی، اپنے عہد کی سچائی ہے۔ انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ خود صاحب جشن رئیس انصاری نے اردو تحریک اور شاعری تک کے سفر پر مختصر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اکتوبر 2017

صدائے جوہر

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جمعیۃ علما ہند سے ایک خاص تعلق ہے۔ جمعیۃ کے پہلے صدر شیخ الہند مولانا محمود حسن کا جامعہ کے قیام میں اہم کردار رہا ہے۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز سے ہم پرامید ہیں کہ یہاں کے طلبہ و طالبات اسلامی اصولوں کی پاسداری میں پیش پیش رہیں گے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا سید ارشد مدنی، صدر جمعیۃ علماء ہند جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس تقریبات کے پہلے دن شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے اسٹال کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے یہ دعا بھی کی کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز مزید ترقی اور کامیابی سے ہمکنار ہو اور اس کے طلبہ ملک و ملت کی رہنمائی کے لیے آگے آئیں۔ اس موقعے پر شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد اور مولانا ارشد مدنی نے بزم طلبہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی خصوصی میگزین 'صدائے جوہر' کا اجرا بھی کیا۔ پروفیسر طلعت احمد نے شعبہ کے طلبہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ سے جامعہ کو بہت امیدیں ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ نے مختلف حوالوں سے اور مختلف مواقع پر جس طرح سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے، وہ انھیں جامعہ میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اکتوبر 2017

'سہ ماہی تحقیق'

پٹنہ: بہار اردو اکادمی میں سہ ماہی 'تحقیق' کے دوسرے شمارے کا اجرا عمل میں آیا۔ رسم اجرا پروگرام میں مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد، بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری، رسالہ کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر معاون مدیر کامران غنی صبا،

معروف فکشن رائٹر، شاعر اور ناقد ڈاکٹر قاسم خورشید، سابق صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر جاوید حیات، معروف شاعر شمیم قاسمی اور ڈاکٹر انتخاب ہاشمی موجود تھے۔ رسم اجرا کے بعد شرکائے محفل نے 'تحقیق' کی کامیاب اشاعت پر رسالہ کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ سہ ماہی تحقیق کی اشاعت سے محققین خاص طور سے یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالرز کو ایک مضبوط پلیٹ فارم ملا ہے۔ مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ڈاکٹر منصور خوشتر اور ان کی ٹیم بہت ہی انہماک سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ جس طرح 'سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز' نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے اسی طرح 'تحقیق' کو بھی بین الاقوامی سطح پر اعتبار حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر منصور خوشتر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ریسرچ

اسکالرز کے مسائل کو مدنظر رکھ کر الگ سے ایک رسالہ شروع کیا۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ 'تحقیق' کا شمارہ دیکھ کر انھیں خوش گوار حیرت ہو رہی ہے۔ یقیناً اس طرح کے رسائل کی اشاعت ادبی دنیا میں ایک معیاری اضافہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید حیات نے بھی رسالے کی اشاعت پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے رسالے کے مدیر کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، پٹنہ، 16 اکتوبر 2017

وفیات:

عبدالوہاب خان سلیم

نئی دہلی: معروف اردو نواز شخصیت عبدالوہاب خان سلیم کا گذشتہ روز امریکہ کے نیویارک میں انتقال ہو گیا۔ 79 سالہ عبدالوہاب خان سلیم گذشتہ دنوں اپنے دماغ کے آپریشن کے بعد سے کافی علیل تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ،

چار بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہے۔ اردو کتابوں کے دلدادہ سلیم صاحب کی پیدائش اترپردیش کے دریا آباد میں ہوئی تھی، جہاں سے وہ پہلے پاکستان اور پھر امریکہ چلے گئے اور ایک عرصے سے وہیں مقیم تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اردو کتابوں سے ان کا عشق کبھی کم نہیں ہوا۔ امریکہ میں بھی ان کی اپنی ایک ذاتی لائبریری ہے جس میں دنیا بھر کی نادر کتابیں موجود ہیں۔ معروف فکشن رائٹر مشفق خواجہ کا ان کے بارے میں کہنا ہے کہ سفرناموں کا ان سے بہتر ذخیرہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ موصوف کے برصغیر ہند و پاک کے شعرا اور ادبا سے گہرے مراسم تھے۔ گذشتہ دنوں جب دہلی کے استاد شاعر جناب وقار مانوی نے عبدالوہاب خاں سلیم کی شخصیت اور خدمات پر ایک کتاب مرتب کی تب ہماری نسل کے لوگوں کا مرحوم سے تعارف ہوا۔ اس کتاب میں ہندوستان اور پاکستان کے کئی بڑے ادبا اور شعرا نے مرحوم کے تعلق سے اپنے جذبات و احساسات اور اردو کے تعلق سے ان کی خاموش خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 13 اکتوبر 2017

معروف صحافی سید مسعود الرب

پٹنہ: معروف صحافی سید مسعود الرب کا 28 اکتوبر 2017 شام پٹنہ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ 29 اکتوبر کو بعد نماز ظہر درگاہ شاہ ارزاں کی مسجد کے باہر ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور شاہ گنج، پٹنہ میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ سید مسعود الرب کی پیدائش یکم دسمبر 1948 کو پٹنہ

کے داناپور میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام الحاج سید عبدالرب ہے۔ سید مسعود الرب نے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ یہ گھرانہ 1947 کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے دوران تباہ و برباد ہو کر داناپور شہر میں رہائش پذیر ہو گیا تھا۔

سید مسعود الرب کے دادا حکیم حافظ مولانا سید فضیلت حسین خادم پھلواری شریف سے متصل دھنوت بستی کے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا ننیہال داناپور سے جنوب مغرب میں واقع ایک گاؤں میں تھا۔ نانا ریلوے میں چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھے اور دوران ملازمت ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کے زیادہ تر دادیہالی اور ننیہالی رشتہ دار ترک وطن کر کے پاکستان جا چکے تھے۔

کتب بینی کا شوق انھیں اپنے والد سید عبدالرب سے وراثت میں ملا تھا جو اس وقت پٹنہ یونیورسٹی میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔

1981 میں روزنامہ 'قومی آواز' پٹنہ سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور صحافت کو ہی ذریعہ معاش بنائے رہے۔ 1992 میں 'قومی آواز' کی اشاعت بند ہونے کے بعد پٹنہ سے شائع ہونے والے دیگر کئی اخبارات پندار، ایک قوم اور صدائے عام کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے۔ اس کے علاوہ دور درشن پٹنہ کے اردو نیوز سروس سے کیزول ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا انھیں موقع ملا جو 2012 تک جاری رہا۔ 1994 میں پٹنہ سے ہی شائع ہونے والے روزنامہ 'انقلاب جدید' اور پھر 1998 میں روزنامہ 'سنگم' کے شعبہ ادارت میں شامل ہوئے۔ حال کے دنوں میں وہ پٹنہ سے شائع ہونے والے روزنامہ 'پندار' کی ادارت میں شامل رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' پٹنہ، 30 اکتوبر 2017

خراج عقیدت:

پروفیسر انصار اللہ نظر کی یاد میں تعزیتی نشست

علی گڑھ: اردو ادب کے نامور محقق اور مدون پروفیسر انصار اللہ نظر کے سانحۂ ارتحال پر بلال ہاؤس نگلہ ملاح سول لائن علی گڑھ میں بزم نوید سخن علی گڑھ کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس میں شہر کی متعدد ادبی و ثقافتی تنظیموں کے ممبران نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور ان کی اردو خدمات کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ یہ نشست بزم نوید سخن کے سرپرست ڈاکٹر الیاس نوید گنوری کی صدارت میں ہوئی جبکہ نظامت کے فرائض سید بصیر الحسن وفا نقوی نے انجام دیے۔

سامعین کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کہا کہ ''مرحوم نہایت خلیق اور خوش مزاج تھے ان کی اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔'' مرحوم کے شاگرد بلال نقوی نے کہا کہ ''پرفیسر انصار اللہ نظر کا انتقال تحقیق کی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ وہ میرے استاد تھے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ان کی زندگی گنگا جمنی تہذیب کی اعلیٰ مثال تھی۔ وہ زندگی بھر سادہ مزاج اور مخلص بن کر رہے۔ علامہ قیصر اکادمی نے بانی و صدر ڈاکٹر رضی امروہوی نے کہا کہ ''مرحوم نے اردو ادب کی جس صورت میں خدمت انجام دی اور تحقیقی مقالے لکھ کر بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا وہ کام آسان نہیں ایک محقق اور مدون کی زندگی ہمہ وقت محنت کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ محنت سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔''

سید بصیر الحسن وفا نقوی نے کہا کہ ''مرحوم نے تقریباً سو کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور متعدد تحقیقی و علمی مضامین لکھ کر علمی و ادبی خدمات انجام دیں ان کی مشہور کتابوں میں اردو کے حروف تہجی، غالب ببلوگرافی، پدماوت کی مختصر فرہنگ، اردو صرف، اردو نحو، شعرائے اردو کے اولین تذکرے، تاریخ اقلیم ادب، داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن، سنسکرت اردو لغت، تاریخ ارتقا زبان و ادب اور اردو میں تدوین وغیرہ ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 جولائی 2017

■

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development,

Department of Higher Education, Government of India

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025

Ph.: 011-49539000, Fax: 011-49539099, Website: www.urducouncil.nic.in

سوچ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

ایوارڈ اسکیم

یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ کونسل نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں خدمات کے اعتراف کی غرض سے 2017 سے سالانہ ایوارڈ اسکیم کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے تحت ایسے ادیبوں وصحافیوں کو ایوارڈ سے سرفراز کیا جائے گا جنھوں نے شعر وادب اور اردو صحافت کے شعبوں میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور جو بھارت کے سیکولر نظریات اور مشترکہ تہذیب وثقافت کو مضبوط بنانے کے لئے مسلسل سرگرم رہے ہیں۔ یہ ایوارڈ مندرجہ ذیل زمروں کے تحت تفویض کیے جائیں گے۔

1 ۔ امیر خسرو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (ایک)
(انعام کی رقم پانچ لاکھ، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

2 ۔ پنڈت دیا شنکر نسیم ایوارڈ برائے شاعری (ایک)
(انعام کی رقم ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

3 ۔ پریم چند ایوارڈ برائے فکشن (ایک)
(انعام کی رقم ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

4 ۔ آغا حشر کاشمیری ایوارڈ برائے ڈرامہ نگاری (ایک)
(انعام کی رقم ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

5 ۔ رام بابو سکسینہ ایوارڈ برائے تاریخ ادب اردو/اردو میں ترجمہ (ایک)
(انعام کی رقم ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

6 ۔ پنڈت نول کشور ایوارڈ برائے ذرائع ابلاغ (پرنٹ والکٹرانک) (ایک)
(انعام کی رقم ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، شال اور مومنٹو)

مندرجہ بالا ایوارڈ میں سے 2 تا 6 زمرے کے دو انعامات ان مصنفین کو دیئے جائیں گے جن کی اردو خدمات نمایاں ہیں مگر مادری زبان اردو نہیں ہے۔

ایوارڈ کے لیے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی ان ناموں اور سفارشات پر غور کرے گی جو ہندوستان بھر کی اردو اکیڈمیوں، اردو کے معتبر اداروں، انجمنوں، تنظیموں اور جامعات کے اردو شعبوں کے ذریعہ موصول ہوں گی۔ انفرادی طور پر بھی ادبا، شعرا، ڈرامہ نگار، پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا سے وابستہ حضرات اپنا تفصیلی پروفائل (زندگی نامہ) 31 دسمبر 2017 تک ارسال کرسکتے ہیں۔ مزید تفصیلات اور فارم کے لیے ہماری ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in سے رجوع کریں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

URDU DUNIYA Monthly, December-2017, Vol.19, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/11/2017**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

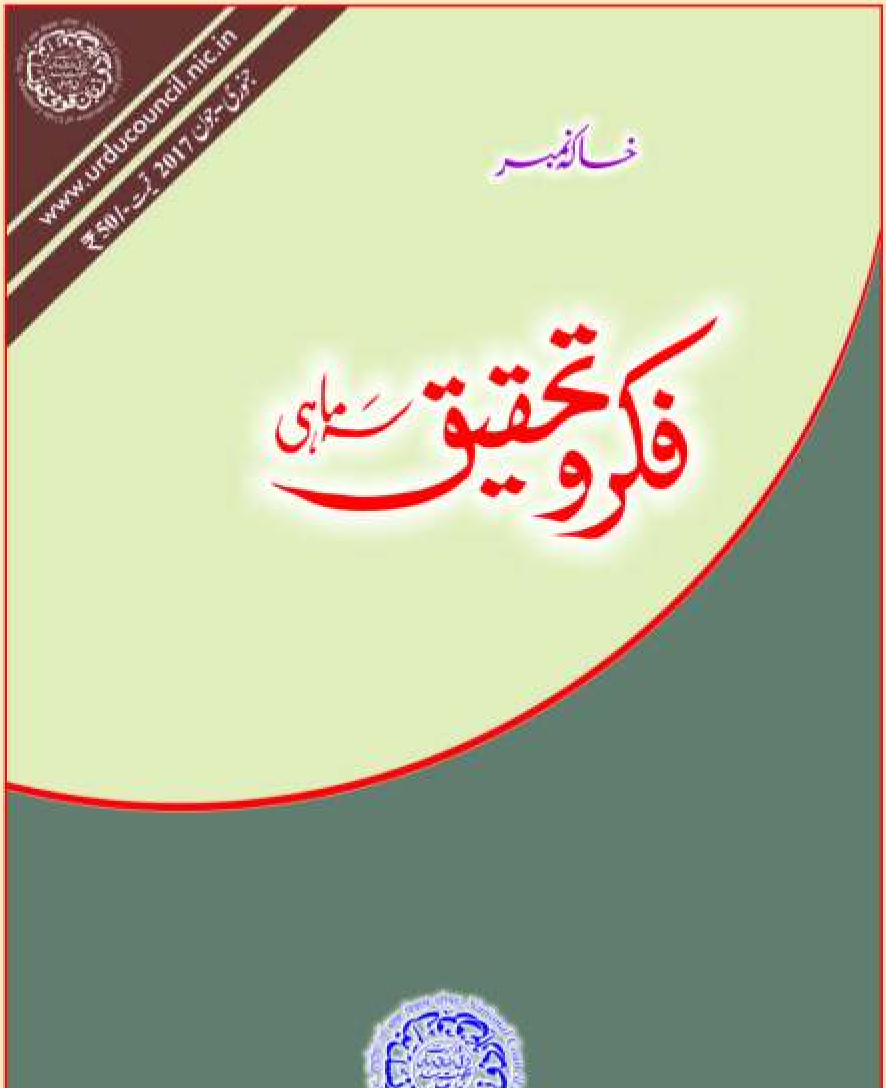

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025